سلسلۂ مطبوعاتِ کتابخانۂ ریاست رامپور۔ نمبر ۱

مکاتیبِ غالب

نجم الدولہ، دبیر الملک، میرزا اسداللہ خاں بہادر، نظام جنگ دہلوی متخلص بہ
غالب کے اُن عرائض و خطوط کا مجموعہ، جو نواب فردوس مکاں،
نواب خلد آشیاں (طاب ثراہما) اور بعض وابستگانِ
دربار کی خدمت میں لکھے گئے تھے؛

باضافۂ

مقدمہ و حواشی از

امتیاز علی خاں، عرشی
ناظمِ کتاب خانۂ ریاست رامپور

حسب الحکم فرمانروای رامپور، دام اقبالہم وعلمہم

درسی ایڈیشن

مطبع سرکاری ریاست رامپور
۱۹۴۳ء

طبع اول ۱۹۳۷ء
طبع دوم ۱۹۴۳ء

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

فہرست مضامین

دیباچہ طبعِ ثانی	۳ - ۴
تقریب	۵ - ۹
دیباچہ	۱۱ - ۲۲۹
تمہید	۱۱ - ۱۶
سرگزشت غالب	۱۷ - ۳۸
تصانیف	۳۹ - ۴۵
تلامذۂ رامپور	۴۶ - ۴۹
نوازاتِ امارت	۵۰
انگریزی تعلقات	۵۱ - ۶۲
تعلقاتِ قلعۂ معلیٰ	۶۳ - ۶۴
تعلقاتِ رامپور	۶۵ - ۱۲۸
اصلاحِ غالب	۱۲۹ - ۱۳۵
انشای غالب	۱۳۶ - ۱۸۶
متعلقاتِ انشاء	۱۸۷ - ۱۹۴
املای غالب	۱۹۵ - ۲۱۱
طباعتِ خطوط	۲۱۲ - ۲۲۹
بحضور نواب فردوس مکاں	۱ - ۳۳
بحضور نواب خلد آشیاں	۳۴ - ۸۴
بخدمت نواب سیدین العابدین خاں بہادر	۸۵ - ۸۷

بخدمت صاحبزادہ سید عباس علیخاں بہادر بیتاب ۸۸-۱۰۷
بمطالعۂ منشی سیلچند صاحب میرمنشی ۱۰۸-۱۱۲
بنام خلیفہ احمد علی صاحب ۱۱۳-۱۱۴
بنام مولوی محمد حسن خاں صاحب ۱۱۵-۱۱۶
حواشی کتاب ۱-۴۸

دیباچۂ طبع ثانی

"مکاتیبِ غالب" کا پہلا ایڈیشن شائع کرتے وقت، مرتب کو ہرگز یقین نہ تھا کہ ملک کے ادبی حلقوں میں یہ کوشش اس درجہ مشکور ہوگی، اور ہندوستان کے مستند نقاد کتاب کی ظاہری اور معنوی خوبیوں کو اتنا سراہیں گے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ کتاب کی طباعت اور ترتیب کے معیار کی بلندی کے ساتھ یہ بھی بالاتفاق تسلیم کر لیا گیا کہ اس کتاب کی اشاعت سے میرزا غالب مرحوم کی آخری زندگی کے بیشتر تاریک گوشے تاریخی روشنی میں آگئے ہیں، اور غالب پر کام کرنے والے کے لیے ناگزیر ہے کہ اس مجموعے کو بھی پیشِ نظر رکھے۔

اہلِ ادب کی اس ہمت افزائی کے سہارے پر، مرتب نے سعی کی ہے کہ اس دوسری اشاعت کو پہلی سے بہتر شکل میں پیش کرے۔ چنانچہ اصل خطوں سے دوبارہ مقابلہ کر کے متن کو میرزا صاحب کی تحریر کے مطابق بنایا گیا ہے، حواشی کی متعدد غلطیوں کی اصلاح کر کے غیر ضروری عبارتیں حذف کر دی گئی ہیں، نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیرؔ، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، صفیر بلگرامی، اور فصیح الدین۔ بلخ میرٹھی کے غیر مطبوعہ قصائد اور اشعار کا اضافہ کیا گیا ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ میرزا صاحب کے ۱۴ نئے خط بھی شامل کیے گئے ہیں۔

ان میں سے ۲ نواب فردوس مکاں کو، ۹ نواب خلد آشیاں کو، ۲ صاحبزادہ سید عباس علی خاں بہادر بیتابؔ کو، اور ۱ منشی سیلچند سیر منشی کو لکھا گیا تھا۔ بیتابؔ کے نام کے خط اس بنا پر بیحد اہم اور مفید ہیں کہ اُن کے ساتھ میرزا صاحب کے اصولِ اصلاح اور اصلاحوں کا معتدبہ حصہ اہلِ ادب کے سامنے آرہا ہے۔

دیباچے پر نظرِ ثانی کرتے وقت، پچھلے مباحث میں مناسب تغیر و تبدل کے علاوہ "اصلاحِ غالب" اور "املائے غالب" کے نام سے دو نئے عنوانوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مرتب کا یہ بھی ارادہ تھا کہ میرزا صاحب کے مخاطبوں کے تمام سرناموں کو جوں کا توں نقل

کرے، اور نواب فردوس مکاں، اور نواب خلد آشیاں کے اُن خطوں کا مکمل نقشہ بقیدِ تاریخ و خلاصۂ مضمون شامل کر دے، جن میں میرزا غالب کے گم شدہ مکاتیب کا حوالہ پایا جاتا ہے۔ مگر قلتِ وقت اور کاغذ کی نایابی کے پیشِ نظر اس ارادے کو آئندہ مناسب وقت تک کے لیے ملتوی کر دینا پڑا۔

جن ادیبوں نے اس اشاعت کی اصلاح و تزئین میں مدد دی ہے، اُن کے شکریے کے بعد، خصوصیت کے ساتھ مخدومِ مکرم ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی (صدر شعبۂ عربی و فارسی، الٰہ آباد یونیورسٹی) اور صدیقِ محترم جناب قاضی عبدالودود صاحب (بار ایٹ لا، پٹنہ) کا دلی شکریہ مرتب پر فرض ہے۔ اگرچہ دونوں مایۂ ناز نقاد اپنے قیمتی وقت کا بڑا حصہ صرف کر کے "مکاتیبِ غالب" پر گہری ناقدانہ نظر نہ ڈالتے، تو یقین اشاعتِ ثانی اپنی بہت سی موجودہ خوبیوں سے محروم رہ جاتی۔

خدا کرے، مرتب اور اُس کے ہمدردوں کی اس کوشش کو پہلے سے زیادہ حسنِ قبول نصیب ہو!

احقر
امتیاز علی خاں، عرشی
ناظم کتاب خانہ

کتاب خانہ، قلعۂ معلی، رامپور
۱۲ ستمبر ۱۹۴۳ء

باسمہ

تقریب

سنہ ۱۸۵۷ء کی "رستخیزِ بجا" سے ہندوستان کی جو ریاستیں محفوظ رہیں، اُن میں روہیلکھنڈ کی واحد اسلامی ریاست "مصطفےٰ آباد" عرف رامپور، مشرقی علم و ادب کی سرپرستی کے اعتبار سے، ممتاز ترین درجے کی مالک ہے۔

یہ ریاست، بارھویں صدی ہجری میں، جانباز روہیلوں کی مردانہ کاریوں کی بدولت قائم ہوئی، اور چند سال کے اندر اپنے خوش بخت فرمانروا، نواب سید علی محمد خاں بہادرؒ کے اقبال کی تائید سے روہیلکھنڈ کے طول و عرض پر چھا گئی۔ لیکن ابھی اس کی بنیاد کماحقہٗ استوار ہونے پائی تھی کہ ۱۱۶۲ھ (۱۷۴۹ء) میں نواب سید علی محمد خاں بہادر کا انتقال ہوگیا۔ حافظ رحمت خاں بہادر نے، دیگر روہیلہ سرداروں کے مشورے سے، اُن کے فرزندِ سوم، نواب سید سعد اللہ خاں بہادر کو جو ابھی صغیر السن تھے، تخت نشین کر دیا۔ سلطنتِ اودھ، روہیلوں کے روز افزوں اقتدار و تسلط کو خطرہ کی نگاہ سے دیکھتی تھی۔ اُس نے اس نازک وقت سے فائدہ اُٹھایا، اور اپنی مسلسل جارحانہ مخالفت سے، روہیلکھنڈ کی طویل و عریض سلطنت کو ریاست رامپور کی مختصر چار دیواری میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا۔

اس پُر آشوب عہد میں، حکومتِ انگلشیہ کے زیرِ حمایت، نواب سید فیض اللہ خاں بہادر عرش منزل مسندِ آبائی پر متمکن ہوئے۔ آپ میں وہ تمام صفاتِ حسنہ، جو ایک معدلت گستر حکمراں کا طرۂ امتیاز شمار کی جاتی ہیں، بوجہ اتم موجود

تھیں۔ اس لیے آپ نے اپنی دانشِ شاہانہ سے کام لے کر، روہیلوں کی منتشر قوت کو یکجا کیا، تعلیم و تربیتِ رعایا کے لیے مدرسۂ عالیہ قائم کرکے، ملا حسن فرنگی محلی اور بعد ازاں بحر العلوم مولانا عبدالعلی لکھنوی کو اُس کا پرنسپل مقرر فرمایا؛ اور محکمۂ قضا (جو ڈیپارٹمنٹ) کے لیے "قاضی فیض اللہ خانی" مرتب کرایا۔ لیکن ابھی عروجِ ستارۂ اقبال کی امیدِ مردہ پوری طرح زندہ نہ ہونے پائی تھی کہ ذیحجہ سنہ ۱۲۰۸ (۱۷۹۴ء) میں نواب عرش منزل نے قضا کی۔

روہیلوں نے، آپ کے فرزندِ اکبر نواب سید محمد علی خاں بہادر کو اپنا حکمراں تسلیم کیا۔ مگر یہ نیا دور، ایک افسوسناک حادثے کے باعث، بہت جلد ختم ہوگیا، اور محرم سنہ ۱۲۰۹ھ (۱۷۹۴ء) میں بجائے آپ کے، نواب عرش منزل کے فرزندِ دوم، نواب سید غلام محمد خاں بہادر مسند نشیں ہوئے۔ حکومتِ اودھ نے جو روہیلوں کی مجتمعہ قوت کو پھر حریفانہ نظروں سے دیکھنے لگی تھی، اس معاملے میں بیجا مداخلت کی، اور نواب سید محمد علی خاں بہادر کا خوں بہا طلب کرنے کے بہانے سے، رامپور پر فوج کشی کردی۔ سوءِ اتفاق سے روہیلوں کو شکست ہوگئی۔ نواب سید احمد علی خاں بہادر ابن نواب سید محمد علی خاں بہادر، جو ابھی خورد سال تھے، نواب سید نصراللہ خاں بہادر کی سرپرستی میں والی بنائے گئے، اور نواب سید غلام محمد خاں بہادر اور اُن کی اولاد رامپور سے باہر رہنے پر مجبور ہوئی۔ لیکن

خدا شری برانگیزد کہ خیرِ ما دراں باشد

ان حضرات کی ظاہری محرومیٔ تخت و تاج، ان کی آیندہ عظمت و شہرت کا سبب بنگئی۔

سنہ ۱۲۵۶ھ (۱۸۴۰ء) میں نواب سید احمد علی خاں بہادر فوت ہوئے، اور اُن کی اکلوتی صاحبزادی، شمس تاجدار بیگم صاحبہ کی حکومت تسلیم کرنے سے روہیلہ سرداروں نے انکار کردیا۔ حکومتِ انگلشیہ کے تدبر نے نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے خلف الرشید، نواب سید محمد سعید خاں بہادر جنت آرامگاہ

کو اس وراثتِ آبائی کا حقدار قرار دیا۔

نواب جنت آرامگاہ نے سنِ شعور کو پہونچکر حکومتِ انگلشیہ کو شرفِ خدمت بخشا تھا، اور اپنی کاردانی و قابلیتِ انتظامی کی بدولت ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ کی عزت افزائی فرما چکے تھے۔ آپ نے زمامِ حکومت ہاتھ میں لیکر، سب سے پہلے ریاست کی تنظیمِ جدید کی طرف توجہ مبذول فرمائی، اور فوج، پولیس، اور محکمۂ مال کے لیے نئے قوانین وضوابط مقرر فرماکر، روہیلوں کے غیر منظم جرگے کو آئینی ریاست کے قالب میں ڈالدیا۔

انتظامی امور سے فارغ ہوکر، نواب جنت آرامگاہ نے سرپرستیٔ علم و ادب کی طرف قدم اُٹھایا۔ مولانا فضلِ حق خیرآبادی، ملک الشعرا مہدی علی خاں ذکی مرادآبادی، حکیم احمد خاں فاخر رامپوری اور دیگر علما و ادبا مختلف کتابوں کے ترجمہ وتالیف پر مامور ہوئے۔ لیکن یہ پودا پروان چڑھنے نہ پایا تھا کہ سنہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں نواب جنت آرامگاہ نے وفات پائی۔

آپ کے بعد نواب سید محمد یوسف علی خاں بہادر فردوس مکاں نے تاجِ ریاست زیبِ سر فرمایا۔ آپ نواب جنت آرامگاہ کی تخت نشینی سے قبل دہلی میں قیام پذیر ہوے تھے، اور مولانا فضلِ حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین خاں آزردہ، اور میرزا اسداللہ خاں غالب سے علومِ عربی و فارسی کی تحصیل فرما چکے تھے۔ آپ کی تخت نشینی کے دو سال بعد ہندوستان نے حکومتِ انگلشیہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ نواب فردوس مکاں نے اس موقع پر حکومت کی حمایت وہمدردی میں بیش بہا خدمات انجام دیں، اور غدر فرو ہو جانے پر آفت رسیدہ علما، شعرا، ادبا اور دیگر اہلِ ہنر کے لیے اپنے سایۂ عاطفت و پرورش کو وسیع فرمادیا۔

نواب فردوس مکاں کے دامنِ جود و سخا میں پناہ لینے والے حضرات کی طویل فہرست میں، مفتی محمد سعداللہ مرادآبادی، میرزا اسداللہ خاں غالب دہلوی

منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی، منشی امیر احمد امیر مینائی، صاحبعالم میرزا رحیم الدین بہادر حیا دہلوی، شیخ علی بخش بیمار، میر عوض علی عدیل میرٹھ آبادی خوش نویس نستعلیق، اور منشی انبا پرشاد لکھنوی داستان گو، وہ ممتاز ہستیاں ہیں، جن سے اربابِ علم و ادب بخوبی واقف ہیں۔

لیکن ان تمام صاحبانِ فضل و کمال میں، نجم الدولہ دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں بہادر غالب دہلوی کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ آغازِ سنہ ۵۷ء میں مولانا فضلِ حق خیرآبادی کی وساطت سے، نواب فردوس مکاں نے انھیں فنِ سخن میں اپنا مشیرِ خاص مقرر فرمایا تھا۔ ابتداءً نواب فردوس مکاں وقتی عطیات سے میرزا صاحب کی امداد فرماتے رہتے تھے۔ غدر کے بعد ان کی پنشن بند ہو جانے پر، نواب صاحب نے جولائی سنہ ۵۹ء سے سو روپے ماہوار تنخواہ جاری فرمادی تھی، جو ان کے انتقال کے بعد نواب خلد آشیاں کے خزانے سے ملتی رہی، اور میرزا صاحب کی وفات پر اُن کے بیٹے، حسین علی خاں نشاداں کے وظیفے کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔

اس رشتے کی بدولت سنہ ۱۸۵۷ء سے سنہ ۱۸۶۹ء تک دربارِ رامپور اور میرزا غالب کے درمیان سلسلۂ مراسلت جاری رہا۔ اس مراسلت کا معتدبہ حصہ محکمۂ عالیۂ دارالانشاء (پولیٹیکل ریکارڈس آفس) میں محفوظ تھا۔ سنہ ۱۹۳۵ء میں احقر نے، اعلیٰ حضرت بندگانِ حضور پُر نور ہز ہائنس عالی جاہ، فرزندِ دلپذیر دولتِ انگلشیہ، مخلص الدولہ، ناصر الملک، امیر الامرا، نواب سر سید محمد رضا علی خاں بہادر، مستعد جنگ، کے سی۔ ایس۔ آئی، ایل ایل۔ ڈی، ڈی۔ لٹ، فرمانروای رامپور دَامَ اِقبالُہُم وَظِلُّکُم، کی توجہِ ہمایوں اس نادر و نایاب ذخیرے کی اشاعت کی طرف مبذول کرانے کی جرات کی۔

بندگانِ اعلیٰ حضرت کی ذاتِ گرامی، اپنے آبای کرام کی طرح، سرپرستیٔ علوم و آداب میں عموماً، اور پرورشِ زبانِ اردو میں خصوصاً، اقران و اماثل

میں ممتاز ہے۔ بنابریں حکم عالی نافذ ہوا کہ اس مجموعے کو باحسنِ وجوہ مرتب کرکے افادۂ اربابِ ذوق کے لیے شائع کردیا جائے۔

میں نے مولوی امتیاز علی خاں عرشی، ناظم کتب خانۂ رامپور، کو (جن میں عِلمی قابلیت، ذوقِ سلیم، اور علم و ادب کی عملی خدمت کے جذبات جمع ہیں، اور جن سے مجھے آیندہ کے لیے بہت بلند اور خوش آیند توقعات ہیں) اس ادبی خدمت کے انجام دینے پر مامور کیا، اور وقتاً فوقتاً مناسب ہدایات اور مشورے دیتا رہا۔ ان کی مسلسل دو سال کی سعی و جانفشانی کے بعد آج یہ مجموعہ اس قابل ہوا ہے کہ اعلیٰ حضرت شہریارِ رامپور، وَاَمَ اِقْبَالُہُمْ وَمُلْکُہُمْ کے حضور میں اس گزارش کے ساتھ پیش کیا جاسکے کہ

لائق نبود قطرہ بعمان بردن　　خار و خسِ صحرا بگلستان بردن
اما چہ کنم کہ رسمِ موری باشد　　پای ملخی پیشِ سلیمان بردن

التجا ہے کہ یہ حقیر کوشش شرفِ قبولیت سے مفتخر کی جائے، کہ یہی اسکی قبولیتِ عامہ کا پیش خیمہ ہوگا۔

خدا سرکار کی عمر دراز کرے، اور جاہ و جلال و اقبال زیادہ فرمائے، تاکہ اس مبارک عہد میں اہم سے اہم اور زیادہ سے زیادہ علمی خدمات انجام پائیں۔ آمین!

رنگ محل پیلس، رامپور
۱۱ مارچ سنہ ۱۹۳۷ء

بشیر حسین زیدی
چیف منسٹر، رامپور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

سنہ ۱۹۳۵ء میں، جنابِ معلی القاب، عالی مرتبت سید بشیر حسین صاحب بہادر زیدی، چیف منسٹر ریاست رامپور، نے حقیر عرشی کو حکم دیا کہ بندگانِ اعلیٰ حضرت، ہز ہائنس عالی جاہ، فرزندِ دلپذیرِ دولتِ انگلشیہ، مخلص الدولہ، ناصر الملک، امیر الامراء، نواب سر سید محمد رضا علی خاں بہادر مستعد جنگ، کے۔ سی۔ ایس۔ آئی، ایل ایل، ڈی، ڈی۔ لٹ، فرمانروای رامپور، دَامَ اِقْبَالُہُمْ وَمُلْکُہُمْ کے ایمای ہمایوں کے مطابق، میرزا اسد اللہ خاں بہادر غالب دہلوی کے مکاتیب، جو موصوف نے نواب فردوس مکاں، نواب خلد آشیاں (طَابَ ثَرَاہُمَا) اور چند وابستگانِ دربار کے نام لکھے تھے، اور حکمۂ عالیۂ دارالانشا میں محفوظ تھے ضروری حواشی اور ایک سیر حاصل مقدمہ کے ساتھ مرتب کروں۔

میری علمی بے بضاعتی اس بارِ گراں کی کسی طرح متحمل نہ تھی، اور دامنِ ہمت اس شرفِ بے پایاں کے احاطے سے کوتاہ نظر آتا تھا۔ آخر بمقتضای

من درین رتبہ از کجا؟ لیکن مور پرورِدۂ سلیمان است

تعمیلِ حکم ترتیبِ مکاتیب کا کام شروع کیا، اور مسلسل دو سال کی شب و روز کی محنت کے بعد اس مجموعے کی ترتیب کے فریضے سے سبکدوش ہوا۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میرزا غالب کے سہلِ ممتنع مکتوبات پر حواشی

کا اضافہ اطلس میں ٹاٹ کا پیوند لگانا، اور اُن کی انشا پر اظہارِ رائے آفتاب کو دنیا سے روشناس بنانا ہے۔ تاہم اس حقیر کوشش کی قبولیت کا خواستگار، اور یہ سوچکر کہ قبولیت کے لیے نازِ خوبی سے زیادہ نیازِ خلوص کی ضرورت ہے جو میرا واحد سرمایۂ حیات ہے، اپنی مراد کے حصول کا امیدوار ہوں۔

دیباچے کی ضرورت

میرزا غالب مرحوم کے سوانح حیات اور کلامِ نظم و نثر کا انداز و مرتبہ سمجھنے کے لیے خواجہ الطاف حسین حالی مرحوم کی "یادگارِ غالب" مولانا غلام رسول مہر کی "غالب" اور مسٹر محمد اکرام، ایم، اے، کی تازہ ترین کتاب "غالب نامہ" عصر حاضر کی مفید تصنیفات ہیں۔ ان حضرات نے اندرونی و بیرونی شہادتوں پر اپنے بیانات کی بنیاد استوار کی ہے، اس لیے مطالعہ کرنے والا میرزا صاحب کی مادی و فکری دنیا میں باریاب ہونے کا شرف حاصل کرلیتا ہے، جو کسی شاعر و مفکر کے خیالات سمجھنے کا بلند ترین درجہ ہے۔ بااینہمہ میرزا صاحب کے حالاتِ زندگی اور انشای اردو کی خصوصیات پر خامہ فرسائی کرنا میرے لیے ناگزیر ہے۔

اولاً اس لیے کہ ضروری مواد دستیاب ہونے کے باعث مذکورۂ بالا تصنیفات، میرزا صاحب کے تعلقاتِ رامپور پر، جو اُن کی آخری زندگی کا اہم باب ہے، کماحقہٗ روشنی ڈالنے سے قاصر نظر آتی ہیں۔

ثانیاً اس لیے کہ ان تالیفات کا دائرہ میرزا صاحب کی ساری کائناتِ ادب کو محیط ہے، جس کے سبب سے ان میں خاص انشای اردو سے سیر حاصل بحث نہیں کی گئی ہے۔ حالانکہ یہ صنفِ ادب اُن کی خصوصیتِ خاصہ تسلیم کی جاتی ہے، جس میں ہندوستان کا کوئی ادیب، بغیر استثنا آجتک شرکت کی جرات نہیں کرسکا ہے۔

ثالثاً اس لیے کہ خود میرزا غالب نے ۱۴ جنوری سنہ ۱۸۵۸ء کو نواب فردوس مکاں کی خدمت میں عرض کیا تھا:

"ہر آئینہ در دل چنان گزشت کہ درین بارہ انسان سخن سرای توان گشت، کہ سرگزشت من از دلی نعمت نہان و حجابی در میان نماند۔"

دیباچے کے مباحث

البتہ میرزا صاحب کے سوانح لکھتے وقت اس امر کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ صرف وہی واقعات بیان کیے جائیں، جو خود میرزا صاحب نے ان مکاتیب میں دربارِ رامپور یا وابستگانِ دربار کو تحریر کیے تھے، اور عام حالات سے، جو اردوی معلی یا عودِ ہندی وغیرہ میں مذکور ہیں، قطعاً بحث نکی جائے۔ چونکہ تعلقاتِ رامپور سے کسی سوانح نگار نے تفصیلی بحث نہیں کی تھی، اس لیے اس موضوع کی بنا میرزا صاحب کی تمام اردو فارسی تحریروں پر رکھی گئی ہے۔

میرزا صاحب کے حالاتِ زندگی کے بعد اُن کی انشائی اردو کے انداز، اور اُس کے اجزا کے خصوصیات سے علیحدہ علیحدہ تفصیلی بحث ہے، جس میں کوشش کی گئی ہے کہ حتَّی الامکان زیرِ نظر مکاتیب سے مثالیں مہیا کی جائیں۔ لیکن اردوی معلی اور عودِ ہندی کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں بعض ایسی چیزیں بھی زیرِ بحث آئی ہیں، جن کا تعلق انشا سے زیادہ میرزا صاحب کے عادات و خصائل یا عام حالات سے تھا۔ لیکن عنوانِ سرگزشت کے ماتحت مخصوص حالات لکھے جانے کی صورت میں یہی مناسب نظر آیا کہ ان مباحث کو انشا کے ساتھ بیان کیا جائے۔ چونکہ ان کا انشا سے بھی کافی تعلق ہے، اس لیے امید ہے کہ مطالعے کے وقت یہ محل معلوم نہ ہوں گے۔

مآخذ دیباچہ و حواشی

حواشی اور دیباچے کی ترتیب میں جن کتابوں سے امداد حاصل کی گئی ہے، اُن کے اسما اور سنینِ طباعت حسبِ ذیل ہیں:

(۱)۔ اردوی معلی، طبعِ اول، اکمل المطابع دہلی سنہ ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء)۔

(۲)۔ ایضاً، طبع لاہور سنہ ۱۹۲۶ء۔
(۳)۔ عودِ ہندی، طبعِ اول، مطبعِ مجتبائی میرٹھ ۱۰ رجب سنہ ۱۲۸۵ھ۔
(۴)۔ کلیاتِ نظمِ فارسی، طبعِ اول، مطبعِ نولکشور سنہ ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء)
(۵)۔ کلیاتِ نثرِ فارسی، طبعِ دوم، مطبعِ نولکشور سنہ ۱۸۷۱ء۔
(۶)۔ سبدِ چین، فارسی، طبع دوم، جامعہ پریس، دہلی سنہ ۱۹۲۰ء۔
(۷)۔ قاطعِ برہان، طبعِ اول، مطبعِ نولکشور سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۲ء)۔
(۸)۔ ابرِ گہربار، طبعِ اول، اکمل المطابع دہلی سنہ ۱۲۸۰ھ
(۹)۔ دیوانِ غالب مع شرحِ نظامی، مطبوعۂ نظامی پریس بدایوں سنہ ۱۹۲۲ء۔
(۱۰)۔ یادگارِ غالب، مطبوعۂ نامی پریس کانپور سنہ ۱۸۹۷ء۔
(۱۱)۔ غالب، مصنفۂ مولانا صہر، طبعِ لاہور سنہ ۱۹۳۶ء۔
(۱۲)۔ خزانۂ عامرہ، مصنفۂ آزادِ بلگرامی، مطبوعۂ نولکشور پریس کانپور سنہ ۱۸۷۱ء۔
(۱۳)۔ انتخابِ یادگار، مصنفۂ امیر مینائی، مطبوعۂ رامپور سنہ ۱۲۹۱ھ۔
(۱۴)۔ اخبار الصنادید، مطبوعۂ نولکشور پریس لکھنؤ سنہ ۱۹۱۸ء۔
(۱۵)۔ تذکرۂ کاملانِ رامپور، مطبوعۂ ہمدرد پریس دہلی سنہ ۱۹۲۹ء۔
(۱۶)۔ انشائے نورچشم، مطبوعۂ نظامی پریس کانپور سنہ ۱۲۹۱ھ۔
(۱۷)۔ ڈکشنری آف انڈین بیاگرفی، مصنفۂ بکلینڈ بزبانِ انگریزی مطبوعۂ سنہ ۱۹۰۶ء (اس کتاب سے صرف انگریز حکام کے حالات ماخوذ ہیں)۔
(۱۸)۔ اورنٹل بیاگرفیکل ڈکشنری، مصنفۂ بیل بزبانِ انگریزی، مطبوعۂ سنہ ۱۸۹۴ء۔

ان کتابوں کے علاوہ حسبِ ذیل قلمی کتابیں بھی زیرِ مطالعہ رہی ہیں:
(۱)۔ تاریخِ محمدی، مصنفۂ محمد حارثی یدخشی، نسخۂ مولف۔
(۲)۔ تاریخِ لطیف، مصنفۂ مولوی مہدیعلی خاں رامپوری، نسخۂ مولف

(۳)۔ تشریح السنین، مصنفہ محمد بشیر الدین کاکوروی، نسخۂ مولف۔

تصاویر

کتاب میں نواب فردوس مکاں، نواب خلد آشیاں اور میرزا غالب کی تصویریں اور موخر الذکر کے ایک خط کا فوٹو بھی شامل ہے۔

نواب فردوس مکاں کی تصویر اُن کے کلیاتِ اردو کے آغاز کی قلمی تصویر کا عکس ہے یہ تصویر نواب صاحب کے درباری مصور "محمد جان" کی بنائی ہوئی اور اصل کتاب میں رنگ آمیز ہے۔ تصویر کے چاروں طرف کشمیری گل کاری مرزا محمد حسن کشمیری کے قلم کی ہے۔ یہ بزرگ کشمیر کے رہنے والے تھے، لیکن دربارِ رامپور کی قدر دانی کی بدولت اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر رامپور میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔

نواب خلد آشیاں کی قلمی تصویر، جس کا عکس شائع کیا جا رہا ہے، کسی نامعلوم مصور کی بنائی ہوئی ہے۔ یہ بھی ندرتِ فن کا اعلیٰ نمونہ اور اصلاً رنگ آمیز ہے۔

میرزا غالب کی تصویر اُس قلمی تصویر کا عکس ہے، جو اُن کی زندگی میں کلیاتِ نظمِ فارسی کے پہلے ایڈیشن (مطبوعۂ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۸۶۳ء) میں شائع ہوئی تھی۔ یہ ایڈیشن اب نایاب ہے۔

میرزا صاحب کا رسمِ تحریر پیش کرنے کے لیے وہ خط منتخب کیا گیا ہے جو اُن کے تعلقاتِ رامپور کے آغاز کی تاریخی سند ہے۔ اس سے بیک وقت معلوم ہو سکے گا کہ میرزا صاحب کا رسمِ خط کیا تھا، اور رامپور سے اُن کے تعلقات کس سنہ میں شروع ہوئے۔

شکریہ

میرا فرض ہے کہ جناب سید شوکت علی صاحب، ڈپٹی سیکریٹری (دارالانشا) اور حکیم انوار الحسن صاحب، محافظ دفتر (دارالانشا) کا شکریہ ادا کروں، جنھوں نے اپنے قیمتی وقت کا بڑا حصہ صرف کر کے، امثلہ کی تلاش میں مجھے امداد

بہم پہنچائی ہے۔ اسی طرح مالکانِ مطبع قیمہ، بمبئی، کا شکریہ بھی میرے ذمے واجب ہے۔ انھوں نے طباعت کے سلسلے میں ہر قسم کے فنی مشورے دیے، اور تغیر و تبدلِ الفاظ و فقرات کی انتہائی فراخ حوصلگی سے تعمیل کی۔ آخر میں، سرکار کی درازیٔ عمر و ترقیٔ جاہ و جلال کی دعا پر تمہید ختم کرتا ہوں۔

از دستِ گدای بینوا ناید ہیچ — جز آنکہ بصدقِ دل دعائی بکند

احقر
امتیاز علی خان عرشی
ناظم کتابخانہ

کتابخانہ، قلعہ معلی، ریاست رامپور

سرگزشتِ غالب

آتشِ غدر سرد ہو جانے کے بعد میرزا غالب نے نواب فردوس مکاں کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا تھا، جس کا یہاں سے جواب نہیں گیا۔ میرزا صاحب نے خیال کیا کہ شاید میری روداد غدر سے واقف نہ ہونے کے باعث سرکار کو شبہہ ہے کہ میں بھی باغیوں کا شریکِ کار رہا ہوں، اور اس بنا پر از راہِ احتیاط مراسلت سے احتراز فرمایا ہے، اس شبہے کے ازالے کے لیے ۱۴ جنوری سنہ ۱۸۵۸ء کو انھوں نے دوسرا عریضہ ارسال کیا، اور اُس میں اپنے انگریزی روابط، حقیقتِ تعلقِ قلعہ، اور ایامِ غدر میں اپنی گوشہ گیری کے تذکرے سے پہلے سرکار کو لکھا:

"ہر آئینہ در دل چنان گزشت کہ درین بارید انسان سخن سرای توان گفت کہ سرگزشت من از دلی نعمت نشان وحجابی در میان نماند"(۱)

میرزا صاحب کی اس توجیہ کے پیشِ نظر میں نے بھی مناسب خیال کیا کہ کم از کم وہ حالات جنھیں خود میرزا صاحب اس عریضے یا دیگر عرائض و مکاتیبِ رامپور کے ذریعے سے نواب فردوس مکاں، نواب خلد آشیاں، یا وابستگانِ دربار کے علم میں لانا ضروری سمجھتے تھے، آغازِ مکاتیب میں شامل کر دوں۔

نام، تخلص اور القاب شاہی

میرزا صاحب کا نام "اسد اللہ خاں"، عرف میرزا نوشہ، "تخلص" غالب" اور شاہی لقب "نجم الدولہ، دبیر الملک، نظامِ جنگ تھا"(۲)

(۱) مکاتیب: ۸ (۲) مکاتیب: ۳، ۱۰، ۱۳، ۱۴، ۵۲

تاریخ پیدائش

میرزا صاحب آگرے میں ۸ رجب سنہ ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء) کو پیدا ہوئے۔[1] ان کے والد میرزا عبداللہ بیگ خاں ۱۸۰۶ء میں راج گڈھ کی جنگ میں گولی کا زخم کھا کر انتقال کر گئے، تو چچا نے اپنی پرورش میں لے لیا۔

نسبی خاندان۔ چچا

میرزا صاحب کے چچا کا نام نصراللہ بیگ خاں بہادر تھا۔ یہ چار سو سواروں کے رسالے کے افسر تھے، اور جنرل لارڈ لیک بہادر کی معیت میں حکومتِ انگریزی کی گرانقدر فوجی خدمات انجام دے چکے تھے، جس کے صلے میں پرگنہ "سونک سونسا" بقیدِ حینِ حیات جاگیر میں عطا ہوا تھا۔ سنہ ۱۸۰۶ء میں نصراللہ بیگ خاں بہادر کا یکایک انتقال ہو گیا۔ گورنمنٹ نے جاگیر واپس لے کر اُن کے ورثا کی پنشن مقرر کر دی، جو ابتداءً ریاستِ فیروز پور جھرکہ کے خزانے سے اور بعد ازاں غدر تک خزانۂ کلکٹری دہلی سے تقسیم ہوتی رہی۔ خود میرزا صاحب فرماتے ہیں:

"عالی رای جہان آرای باد کہ دیرینہ نمک خوار سرکار انگریزم۔ واز سرآغاز سال یکہزار و ہشت صد و شش کہ در انگاہ شمار سنین عمر من ازدہ نگزشتہ بود، بعوض جاگیر عم حقیقی نسبی خود نصراللہ بیگ خاں بہادر کہ با جمعیت رسالۂ چہار صد سوار بمعیت جرنیل لارڈ لیک بہادر در فتح ہندوستان کوششہای نمایاں کردہ، و پرگنۂ سونک سونسا بقید حین حیات جاگیر یافتہ، و ہم دران عہد بمرگ ناگاہ از جہان رفتہ بود، بفرمان جرنیل لارڈ لیک بہادر و منظوری گورنمنٹ مشت زری شامل جاگیر عم سبقی من نواب احمد بخش خان بہادر در وجہ معاش من جلۂ زر اسمزاری سرکاری، کہ بذمۂ احمد بخش خان ببرد وام واجب الادا بود، قرار یافت۔"[2]

چچا کے انتقال کے بعد میرزا صاحب کے سرپرست اُن کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیدان رہے، جو آگرے کے ایک عالی خاندان رئیس تھے۔

(۱) مکاتیب: ۸، اردو دی: ۳۹۹، عود: ۶۹ (۲) مکاتیب:

حقیقی بھائی

میرزا صاحب تین بھائی بہن تھے۔ بہن چھوٹی خانم بڑی، میرزا صاحب منجھلے اور میرزا یوسف بیگ خاں چھوٹے تھے۔ میرزا یوسف بیگ خاں کے بارے میں فرماتے ہیں:

"بہرحال دو امر ہنوز مبہم ہیں: ایک اس انگریزی تحریر کا حال، اور دوسرے میرے بھائی کے پاگل کی حقیقت۔" (۱)

میرزا یوسف بیگ خاں نے ۲۹ صفر سنہ ۱۲۷۴ھ (۱۹ اکتوبر سنہ ۱۸۵۷ء) کو بحالتِ دیوانگی دلی میں انتقال کیا۔ (۲)

سسرالی خاندان۔ بی بی

میرزا صاحب کی بی بی اُمراؤ بیگم، نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی اور نواب احمد بخش خاں والیِ فیروز پور جھرکہ و جاگیردارِ لوہارو کی بھتیجی تھیں۔ یہ ۸ رجب سنہ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) کو میرزا صاحب کے عقد میں آئیں، اور اُن کی وفات کے بعد تک زندہ رہیں۔ نواب فردوس مکاں کی مزاج پُرسی کے ایک خط میں میرزا صاحب نے ان کا ذکر کیا ہے:

"جب سے حضرت کی ناسازیٔ مزاجِ مبارک کا حال خارج سے مسموع ہوا ہے، عالم الغیب گواہ ہے کہ مجھ پر اور میری بی بی پر... کیا گزر رہی ہے۔" (۳)

میرزا صاحب کے انتقال کے بعد، اُمراؤ بیگم نے اپنی مالی مصیبت کا سارا کچا چٹھا لکھ کر کمشنرِ دہلی سے درخواست کی تھی کہ میرزا صاحب کی پنشن حسین علی خاں پسرِ متبنّٰی کے اور میرے نام منتقل کر دی جائے۔ لیکن ڈپٹی کمشنر کی ہمدردانہ رپورٹ کے باوجود کمشنرِ دہلی نے جواب دیا کہ متبنّٰی بیٹے کے نام پنشن کسی طرح جاری نہیں ہو سکتی۔ البتہ بیوہ کچہری میں حاضر ہو تو اُس کے نام دس روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا جائے گا۔ اس باغیرت بی بی نے کچہری کی حاضری کو گوارا نہ کیا، اور دس روپے ماہوار کے وظیفے سے انکار کر دیا۔

حسین علی خاں نے ۱۲ جون سنہ ۱۸۶۹ء کو نواب خلد آشیاں کی خدمت میں ایک عریضہ ارسال کیا تھا۔ اُس میں میرزا صاحب کے قرض کی ادائی کی درخواست، اور

(۱) مکاتیب: ۱۸ (۲) کلیاتِ نثرِ فارسی: ۳۹۹ (۳) مکاتیب: ۲۷

اپنے حاضر نہ ہو سکنے کے عذر کے بعد، بیگم صاحبہ غالب کی درخواستِ پنشن کے بارے میں لکھتی ہیں:

"پنشنِ سرکارِ انگریزی کی یہ صورت ہوئی کہ ہنگامِ ثبوت و تحقیقِ مفلسی و بیمقدوری و قرضداری ڈپٹی کمشنر صاحب نے رپورٹ اچھی کی۔ اُس پر کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ پسر متبنیٰ کی پنشن نہیں ہو سکتی۔ ہاں زوجہ کے واسطے مبلغ دس روپیہ تجویز ہونگے جناب واوی صاحبہ نے دس روپیہ نامنظور کیے، یہ امید بھی جاتی رہی۔"(۱)

اس عرضی کے آخر میں، بیگم صاحبہ کی طرف سے لکھا گیا ہے:

"اور جانب امراؤ بیگم (سلمہٗ) بعد کورنش بتوحیدِ مضمونِ عرضی ہذا گزارش ہے۔ کمترینہ اول بعمرِ ہفتاد سالہ حرکت و نقل مکاں سے معذور، اور سوائے اُس کے صدمۂ انتقالِ شوہر اور ہجومِ قرض خواہان سے اور معیشتِ آیندہ سے مجبور، باایں ہمہ بسبب عدت کے خانہ سے باہر نہیں نکل سکتی۔ یہیں وجہ مانعِ حضوری ہے۔ اور سوائے درِ دولت کے کوئی ملجا و ماوا نظر نہیں آتا۔ حضور کو دستگیری مجد بیکسہ عاجزہ کی واجب ہے۔ اور یہ ارادہ ہے کہ بعد انقضای مدتِ عدت خدمت میں حاضر ہوں، اور وہیں انفاسِ بقیہ کو گزاردں اب نانِ شبینہ کو محتاج ہوں۔ چارہ اس کا بجز بندگانِ عالی کے ممکن نہیں۔ رحم فرمائیے اور خبرگیری کیجیے، کہ بدعاگوئی دولتِ ابد مدت مشغول رہوں۔ مہر: امراؤ بیگم بنت الٰہی بخش خاں۔ ۱۲۸۱ھ"

۲۲ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۶ھ (۲ اگست سنہ ۱۸۶۹ء) کو بیگم صاحبہ نے نواب خلد آشیاں کو پھر لکھا:

"جنابِ عالی! جس روز سے مرزا اسد اللہ خاں غالب نے وفات پائی ہے، تو یہ عاجزہ بیوہ اس قدر مصائب میں گرفتار ہے کہ تحریر سے باہر ہے۔ اول تو یہ مصیبت ہے کہ مرزا صاحب مرحوم آٹھ سو روپے کے قرضدار مرے؛ دوسری مصیبت یہ کہ پنشن انگریزی مسدود ہوئی؛ تیسرے یہ کہ تنخواہ سو روپیہ ماہوار، جو آپ ازراہ قدردانی کے مرزا مرحوم کو

(۱) مثل ۱۸۹، صفحہ ۱ جاب، عبد نواب خلد آشیاں، محافظ خانہ وزارت الثا۔

ارسال فرماتے تھے، وہ بھی یک لخت موقوف ہوئی۔ ابتک قرض لیکر اوقات بسری کی اب قرض بھی نہیں ملتا۔ نوبت فاقہ کشی کی پہنچی۔ اس حالت حیرانی اور پریشانی میں پھر یہ بھی خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارا وسیلہ پرورش اور اوقات گزاری کا اس دنیا میں آپ کی ذات بابرکات کو بنایا ہے، اور سوائے آپ کی ذات بابرکات کے دوسرا کوئی نظر نہ آیا۔ لاچار برخوردار حسین علی خاں کو آپ کے قدموں پر ڈالا۔ آپ نے بسبب شرافت پروری اور اقتضای مروت اور فتوت کے اس قدر اوپر حال برخوردار کے عنایت فرمائی ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ اب دعاگو کی یہ تمنا ہے کہ ایسی پرورش مجھ ضعیفہ کی ہو جائے کہ مرزا مرحوم حق عباد سے بری ہو جائیں، کہ یہ سخت عذاب ہے۔ اگر حضور صورت ادای قرض فرمادیں تو کمال ثواب عظیم ہوگا۔ اور اگر دفعۃً صورت ادای قرض مناسب رای بیضا ضیا کی نہو، تو یہ تنخواہ شش ماہ کی بحساب فی ماہ صد روپیہ بالفعل مجھ بیوہ کو عنایت ہو جائے۔ باقی ۶ ماہ اور بحساب مذکورہ بالا مرحمت ہو جائیں، تاکہ میں بیوہ قرض مرزا صاحب کا ادا کر دوں۔ اور ظاہر اور یقین ہے کہ زندگی میری بھی اسی میعاد میں پوری ہو جائے گی۔ اور یہ احسان کرنا مجھ پر فی سبیل اللہ ہے، کیونکہ میں بیوہ ضعیفہ اور بیکس ہوں۔ اتنی عنایت سے آپ کی زندگی میری بسر ہو جائے گی۔ اور پنشن میری دس روپیہ انگریز کرتا ہے، بشرط انیکہ کچہری میں حاضر ہوں۔ اور جانا میرا کچہری میں ہرگز نہ ہوگا، گو فاقوں سے مرجاؤں۔ کیا میں اپنے باپ اور چچا اور شوہر کا نام روشن کروں؟ اور جو عزت اور ریاست میرے چچا کی اور حرمت میرے والد کی اور شوہر کی آگے خاص و عام کے تھی، حضور پر سب روشن ہے حاجت بیان کی نہیں۔[1]

اس عریضے پر بھی سرکار نے کوئی حکم نہ دیا، تو ۲۴ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۸۶ھ (۲ ستمبر ۱۸۶۹ء) کو بیگم صاحبہ نے مکرر درخواست پرورش پنشن کی۔[2] اس کا مضمون تقریباً سابق

(۱) نسل ۲۵۴، صفحہ مذکورہ ذکر غالب (۵۵) سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی انگریزی پنشن کے بارے میں کوشش جاری رہی۔ چنانچہ فروری سنہ ۱۸۷۰ء سے قبل اجرای پنشن کا حکم آچکا تھا، مگر ابھی اس کے لینے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ بیگم صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ (۲) نسل ۲۳۶، صفحہ مذکورہ۔

درخواست کے مطابق ہے، اس لیے اعادہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ البتہ اس عرضی کے لفافے پر میر منشی صاحب کا یہ نوٹ ہے:

"پیش نمودہ شد۔ حکم نفاذ یافت کہ درین خصوص بہ نواب مرزا خان نہالیش وہدایت بعمل آمدہ۔ ۹ ستمبر سنہ ۱۸۶۹ء"

سرکار کے ۳۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۹ء کے حکم پر ۸ نومبر سنہ ۱۸۶۹ء کو ۶ سو روپیہ کی ہنڈوی رام کشن داس کی دوکان سے حکیم غلام نجف خاں کی معرفت میرزا صاحب کی بیوی کو بھیجی گئی (۱)

اس تاریخ کے بعد صرف ایک درخواست شعبان سنہ ۸۶ھ (نومبر ۶۹ء) میں آئی تھی مثل میں اصل عرضی موجود نہیں، صرف لفافہ شامل ہے۔ غالباً وہ ادائے قرض کے تشکریہ پر مشتمل ہوگی۔

امراؤ بیگم میرزا صاحب کی برسی کے دن ۲ ذیقعدہ سنہ ۸۶ ۱۲ھ (۴ فروری ۱۸۷۰ء) کو فوت ہوگئیں (۲)

بی بی کے چچا اور بھائی

نواب احمد بخش خاں بہادر، والیٔ فیروز پور جھرکہ و جاگیردار لوہارو، میرزا صاحب کی بی بی کے حقیقی چچا تھے۔ وہ اپنی زندگی میں، اپنے بڑے بیٹے، نواب شمس الدین احمد خاں کو فیروز پور کا رئیس بنا کر گوشہ گیر ہوگئے تھے۔ نواب شمس الدین احمد خاں سے میرزا صاحب کے تعلقات خوشگوارانہ تھے۔ جب انھیں ولیم فریزر، ریزیڈنٹ دہلی، کے قتل کے الزام میں پھانسی دیگئی، تو میرزا صاحب نے اسے اُن کا کیفر کردار قرار دیا۔ چنانچہ اپنی سرگزشت میں بھی ان دونوں کا ذکر کرتے ہوئے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"بفرمان جرنیل لارڈ نیک بہادر و منظوری گورنمنٹ مشت زری شامل جاگیر عم سببی من نواب احمد بخش خان بہادر و روجہ معاش من منجملۂ زر استمراری سرکاری، کہ بندہ نواب احمد بخش خان بہرہ وام واجب الادا بود، قرار یافت۔ چون جانثین احمد بخش خان کیفر کردار یافت و جاگیر

(۱) اعادۂ آمد و رفت ریاست سنہ ۱۸۶۹ء (۲) ذکر غالب: ۷۵۔

بسرکار بازیافت شد، رسیدن آن وجہ مقرری از خزانۂ کلکتری دہلی صورت پذیر نرفت[۱]

نواب احمد بخش خاں نے ربیع الاول سنہ ۱۲۴۳ھ (۱۸۲۷ء) میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔ اور نواب شمس الدین احمد خان بہادر کو ۸ اکتوبر سنہ ۱۸۴۵ء کو صبح کے وقت کشمیری دروازے کے باہر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

بی بی کے پوتے۔ باقر علی خاں

اُمراؤ بیگم کے اولادیں تو سات ہوئیں، لیکن اُن میں سے کسی نے بھی پندرہ ماہ سے زیادہ عمر نہ پائی۔ نواب زین العابدین خاں عارف جو امراؤ بیگم کے حقیقی بھانجے اور میرزا صاحب کے شاگرد رشید تھے، سنہ ۱۸۵۲ء میں دو خورد سال بچے چھوڑ کر انتقال کر گئے۔ ان دونوں میں بڑے باقر علی خاں تھے، جو والد کے انتقال کے بعد، کچھ عرصے تک اپنی دادی بنیادی بیگم کے پاس رہے اور اُن کے بعد میرزا صاحب کے یہاں چلے آئے۔ میرزا صاحب نے اُن کی پرورش کی، پڑھایا لکھایا، اور جب جوان ہو گئے، تو ڈھائی ہزار روپے لگا کر نواب ضیاء الدین خاں بہادر کی صاحبزادی سے شادی کر دی۔ نواب خلد آشیاں کو اُن کی شادی اور اُس کے اخراجات کے بارے میں لکھا ہے:

"باقر علی خاں کی شادی نواب ضیاء الدین خاں کے ہاں ہوئی۔ انھوں نے کھانے جوڑے کے دو ہزار روپیہ دیئے۔ اور میری زوجہ نے پانسو روپئے کا زیور لگا کر پچیس سو روپئے صرف کئے[۲]"

باقر علی خاں نے یکم جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۶ء) کو انتقال کیا۔[۳]

حسین علی خاں

عارف کے چھوٹے بیٹے، حسین علی خاں کو میرزا صاحب نے متبنّٰی کر لیا۔ چنانچہ نواب فردوس مکاں کی مزاج پرسی کے پہلے خط میں اُن کو اپنا فرزند لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

"جب سے حضرت کی ناسازیٔ مزاج مبارک کا حال خارج سے مسموع ہوا ہے، عالم الغیب گواہ ہے کہ مجھ پر..... اور میرے فرزند حسین علی خاں پر کیا گزر رہی ہے"[۴]

(۱) مکاتیب: ۸ (۲) مکاتیب: ۴۷ (۳) تاریخ لطیف قلمی: ۱۹۱ - دیوان سالکہ: ۲۹۳ و ذکر غالب: ۲۷ (۴) مکاتیب: ۲۷

اس کے علاوہ خود حسین علی خاں نے بھی نواب خلد آشیاں کی خدمت میں ۱۲ جون ۱۸۶۹ء کو جو عریضہ تحریر کیا ہے، اُس میں اپنے نام کے بعد "پسر متبنی مرزا اسد اللہ خاں غالب" لکھا ہے اور یہ بھی عریضے میں درج کیا ہے کہ مرزا صاحب کی پنشن کے بارے میں صاحب کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ پسر متبنی کی پنشن نہیں ہو سکتی۔ گویا مذکورۂ بالا حاکم کی عدالت میں بھی حسین علی خاں کو میرزا صاحب کا متبنی ظاہر کیا گیا تھا۔

میرزا صاحب اکتوبر سنہ ۱۸۶۱ء میں دردِ قولنج وغیرہ میں مبتلا ہونے سے بیحد کمزور ہو گئے تھے۔ چنانچہ اپنے ۱۱ نومبر سنہ ۱۸۶۱ء کے عریضے میں اُنھوں نے اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ سرکار کے ایک جوابی فرمان مورخہ ۲۳ اپریل سنہ ۱۸۶۲ء سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے اپنی بیماری کے پیشِ نظر یہ درخواست کی تھی کہ میرے بیٹے کے لیے تنخواہ مقرر کر دی جائے۔ سرکار نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

"ہر چند مخلص را پرورش و مراعات صاحبزادۂ آں کرمفرما بدل ملحوظ و مرکوز، الا دستور این سرکار بعنوان مرقومۂ سامی نبودہ است۔" (۱)

اس سے صاحبزادہ کا نام نہیں معلوم ہوتا۔ مگر قیاس یہ ہے کہ حسین علی خاں ہی کے لیے یہ استدعا تھی۔

آغازِ سنہ ۱۸۶۶ء میں نواب خلد آشیاں سے بھی یہی استدعا کی گئی تھی۔ مگر اُنھوں نے بھی خلافِ مدعا جواب دیا۔ (۲) پھر ۱۹ اگست سنہ ۱۸۶۷ء کو اُن کی منگنی کے بارے میں لکھا:

"آپ کے غلام زرخرید، یعنی حسین علی خاں، کی منگنی ہو گئی، اور اپنے کنبے میں ہوئی، یعنی نواب احمد بخش خاں مرحوم کے حقیقی بھائی کی پوتی سے۔ اور رجب کا مہینا قرار پایا۔ اب میرے بڑھاپے اور میری مفلسی کی شرم آپ کے ہاتھ ہے۔" (۳)

سرکار نے جواباً تحریر فرمایا کہ آپ کی تحریر مجمل ہے، "خلاصۂ مکنونِ خاطر" تحریر فرمائیے۔ اس کے جواب میں میرزا صاحب نے ۵ ستمبر کو لکھا:

"مجملاً یہ کہ میں درِ دولت کا گدای خاک نشیں اور وہ آپ کا غلام۔ تفصیل یہ کہ میرے پاس

(۱) شمارہ نمبر ۲۰۴ مجموعۂ احباب، عہدِ فردوس مکاں (۲) مکاتیب: ۵ (۳) ایضاً: ۷۲

نقد، جنس، اسباب، املاک، اور میرے گھر میں زیور زرینہ نسیمنہ کا نام ونشان نہیں ہمت اودھار قرض کوئی دیتا نہیں۔ آپ روپیہ عنایت فرمائیں، تاکہ کام سرانجام پائے اور بوڑھے فقیر کی برادری میں شرم رہجائے۔ دوسری بات یہ کہ سو روپئے آپ کی سرکار سے بطریق خیرات اور باسٹھ روپیہ آٹھ آنے مہینا انگریزی سرکار سے بعوض جاگیر پاتا ہوں۔ عالم الغیب جانتا ہے کہ اس میں میرا بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ بہو کو کہاں سے کھلاؤنگا؟ حسین علی خاں کی کچھ تنخواہ مقرر ہو جائے۔ لیکن توقیع تنخواہ اوس کے نام جاری ہو۔ بلکہ اوس کی زوجہ حسن جہاں بیگم بنت اکبر علی خاں کے نام وہ تنخواہ مقرر ہو، اور اوس کی مہری رسید سے ملا کرے۔ زر مصرف شادی کی مقدار اور تنخواہ کی مقدار جو خداوند کی ہمت اور اس کنگال اپاہج کی قسمت!"(۱)

سرکار نے ارقام فرمایا کہ مابدولت کو بربنای موانست واتحاد قدیمہ آپ کی خوشنودی خاطر مدنظر ہے لہذا آپ مصارف کی مقدار لکھیے، تاکہ حکم مناسب دیا جائے۔ اس کے جواب میں میرزا صاحب نے ۲۳ ستمبر کو تحریر کیا:

"حضرت نے غمخواری وتفقد و دریش نوازی کو اوس پایہ پر پہنچایا کہ شاہان عجم میں سلطان سنجر نے اور شاہان ہند میں شاہجہاں نے ملازموں کی اتنی پرسش اور نوازش کی ہوگی۔ باقر علی خاں کی شادی نواب ضیاء الدین خاں کے ہاں ہوئی۔ اونھوں نے کھانے جوڑے کے دو ہزار روپیہ دیئے۔ اور میری زوجہ نے پانسو روپے کا زیور لگا کر پچیس روپئے صرف کیے۔ حسین علی خاں کا سسرا، یعنی اکبر علیخاں، اپنے خاندان کا ہے۔ لیکن امیر نہیں۔ نوکری پیشہ ہے۔ سات پیسے میں کیونکر عرض کروں کہ مجھے کیا دو۔ سائل ہوں، یہ رسم نہیں کہ سائل مقدار سوال عرض کرے۔ حال مصارف شادی خاندان لکھدیا ہے دو ڈھائی ہزار میں شادی اچھی ہو جائے گی۔ لیکن یہ بھی ساتھ عرض کرتا ہے کہ میرا حق خدمت اتنا نہیں کہ اس قدر مانگ سکوں۔ جو کچھ دوگے اوس میں شادی کردونگا"(۲)

اس عریضے کا سرکار کی جانب سے کوئی جواب نہ آیا، اور رجب میں شادی ملتوی ہو گئی۔ میرزا صاحب نے

(۱) مکاتیب: ۳، (۲) مکاتیب: ۴۷

۲ رمضان سنہ ۱۲۸۴ھ (۲۹ دسمبر سنہ ۱۸۶۷ء) کو یاد دہانی کرتے ہوئے لکھا:

"ماہ صیام میں سلاطین وامرا خیرات کرتے ہیں۔ اگر حسین علی خاں یتیم کی شادی اسی مہینے میں ہو جائے اور اس بیوڑھے اپاہج فقیر کو روپیہ ملجائے تو اس مہینے میں تیاری ہو رہے، اور شوال میں رسم نکاح عمل میں آئے۔ اور چونکہ اس ماہ مبارک میں درفیض باز اور سال انگریزی کا بھی آغاز ہے، وہ پچیس روپئے مہینا جو زبان مبارک سے نکلا ہے، جنوری سنہ ۱۸۶۸ء سے بنام حسین علی خاں مذکور جاری ہو جائے، تو مجھے گویا دونوں جہان مل گئے۔"(۱)

لیکن اس عریضے کا جواب بھی معرضِ التوا میں رہا، اور ذیقعدہ آ پہنچا، میرزا صاحب نے ۹ مارچ سنہ ۱۸۶۸ء کو لکھا:

"مرزا حسین علی خاں کی شادی رجب کے مہینے میں قرار پائی تھی۔ علیۂ حضور کے نہ پہنچنے کے سبب ملتوی رہی۔ آج جو ذیقعدہ کی ۱۵ ہے، ۱۵ دن یہ اور مہینا ذی الحجہ کا۔ اگر اسی ذیقعدہ کے مہینے میں کچھ حضرت عطا فرمائیں گے، تو آخر ذی الحجہ تک نکاح ہو جائیگا۔ خدا کرے! خداوند کے ضمیر میں یہ بھی گزرے کہ غالب جب بہو بیاہ لائیگا، تو اس کو روٹی سے کہاں نے کھلائیگا۔ غرض اس سے یہ کہ حسین علی خاں کی تنخواہ جاری ہو جانے۔ حضرت یاد کوئی ایسا ہیں کہ جو میرے مطالب حضور میں عرض کرتا رہے اور مجھے بار بار لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔"(۲)

سرکار نے یہ درخواست منظور فرمائی، اور آمدِ زمستاں تک شادی سے فراغت کی امید ہو گئی نواب مرزا خاں داغ دہلوی، اور حکیم مظفر حسین خاں بہادر لکھنوی نے علی الترتیب میرزا صاحب کو قبولِ التماس کی اطلاع دی۔ اس کی توثیق، نیز مکرر یاد دہانی کی خاطر میرزا صاحب نے ۱۳ اگست سنہ ۱۸۶۸ء کو لکھا:

"تین التماسیں سابق پیش ہوئی تھیں۔ سو اب پہلے یہ خود دار نواب مرزا خاں کی تحریر سے اور پھر جناب مظفر حسین خاں بہادر کے خط سے اون خواہشوں کے منظور و مقبول ہونیکی نوید پائی۔ انشاء اللہ الکریم حسب ارشاد حضور اسی برس ۶۸ میں آمدِ زمستاں یعنی نومبر

(۱) مکاتیب: ۷۸ (۲) مکاتیب: ۷۹

دسمبر میں میرا قرض بھی ادا ہو جائے گا، اور حسین علی خاں کی شادی بھی ہو جائیگی، اور اوس کیواسطے اوسکی زندگی تک تنخواہ جداگانہ مقرر ہو جائیگی۔"(۱)

اس عرصے میں حسین علی خاں کی سسرال سے شادی کا تقاضا شروع ہوگیا۔ میرزا صاحب نے مجبور ہوکر، ستمبر کو ولی نعمت کی خدمت میں پھر عرض کیا:

"پیر و مرشد! حسین علی خاں کے سسرال والوں کا بڑا تقاضا ہے۔ زندگی مشکل ہوگئی ہے بطریق "شیئاً للہ" سوال مختصر یہ ہے کہ جو حضرت کے مزاج میں آوے وہ عطا کیجے، اور حسین علی خاں کے نام جداگانہ تنخواہ مقرر کر دیجے، لیکن یہ دونوں امر جلد صورت پکڑ جائیں۔"(۲)

سرکار نے ابھی اس کا جواب ارقام نہیں فرمایا تھا کہ میرزا صاحب پر قرضخواہوں کا سخت تقاضا ہونے لگا، اور شادی کی خوشی کے حصول سے قبل قرض کے غم کا رفع کرنا ضروری ہوگیا ادای قرض کی سبیل صرف عطیۂ سرکارِ رامپور تھا۔ بنابریں ۱۶ نومبر کو میرزا صاحب نے بحالتِ اضطرار لکھا:

"حال میرا تباہ ہوتے ہوتے اب یہ نوبت پہنچی کہ اب کے تنخواہ میں سے ۵۴ روپئے بچے ۲۳ روپئے کا چٹھا ماہوار کا سوا سو روپئے ہوں تو میری آبرو بچتی ہے۔ ناچار حسین علی خاں کی شادی اور اوس کے نام کی تنخواہ سے قطع نظر کی۔ اب اس باب میں عرض کروں کیا مجال، کبھی نہ کہوں گا۔ آٹھ سو روپئے مجھ کو اور دیجے۔ شادی کیسی؟ میری آبرو بچ جائے۔ تو غنیمت ہے۔"(۳)

میرزا صاحب مرتے دم تک اپنے اس عہد پر قائم رہے۔ آخری عریضے میں بھی، جو جنوری سنہ ۱۸۶۹ء کو تحریر کیا تھا، حسین علی خاں کی شادی کا ذکر نہیں کیا، اور یہ ارمان ساتھ لیکر دنیا سے رخصت ہوگئے۔

حسین علی خاں نے ان کے انتقال کے ایک مہینے بعد، ۱۷ مارچ سنہ ۶۹ء کو اپنے تقرر تنخواہ کی درخواست بھیجی۔ بعد ازاں ۱۲ جون کے عریضے میں پھر اپنی خواہشِ وظیفہ کا اعادہ کیا اور یہ بھی عرض کیا کہ فدوی بیمار ہے، اس لیے حاضرِ خدمت نہیں ہو سکتا۔ انشاء اللہ صحت کے

(۱) مکاتیب: ۸۱ (۲) مکاتیب: ۸۲ (۳) ایضاً: ۸۳ (۴) ایضاً: ۸۴

بعد قدمبوسی کی سعادت حاصل کرے گا۔

۲۲ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۶ھ (۲ اگست سنہ ۱۸۶۹ء) کو بیگم غالب نے سرکار کو جو عریضہ لکھا ہے اُس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت حسین علی خاں ملازم ہو چکے تھے، لیکن ابھی اُنکی شادی نہیں ہوئی تھی۔ ۲۱ فروری سنہ ۱۸۷۰ء کو حسین علی خاں نے رامپور سے دلی واپس جاکر منشی سبلپند صاحب کو ایک خط لکھا ہے۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسین علی خاں اگست ۱۸۶۹ء کے بعد رامپور آئے، اور فروری سنہ ۱۸۷۰ء میں میرزا صاحب کی برسی کی فاتحہ کے لیے رخصت لے کر دلی گئے۔ وہاں سسرال والوں نے شادی کا تقاضا کیا۔ ان کی تنخواہ صرف پچیس روپے ماہوار مقرر ہوئی تھی، اور ابھی ۶ ماہ ملازمت پر گزرے تھے، اس لیے کچھ پس انداز بھی نہ ہونے پایا تھا۔ لہٰذا بذریعۂ عریضۂ جداگانہ سرکار سے درخواست کی کہ مصارفِ شادی عطا فرماکر بندے کی پرورش فرمائی جائے، اور منشی صاحب سے خواہش کی کہ اس کام میں کوشش کریں۔ "یقین تو ہے کہ حضور، دَامَ اِقْبَالُہٗ لبس رحم فرماکر کچھ عنایت فرمائیں گے۔ آگے مقدر۔"

اس کے بعد امشد میں شادی سے متعلق کوئی تحریر نہیں، اس لیے قیاس یہ ہے کہ حسین علی خاں کو امداد مل گئی، اور سنہ ۱۸۷۰ء میں اُن کی شادی کی تقریب انجام پائی۔

حسین علی خاں شاعر تھے، اور فارسی میں خیالؔ اور اردو میں شادؔاں تخلص کرتے تھے انھوں نے بھی جوانی کے عالم میں یکم شوال ۱۲۹۶ھ (۱۸۸۰ء) کو انتقال کیا۔ "شادانِ فرخ نہاد" مادۂ تاریخ ہے[1] ان کا دیوان چند سال ہوئے کتابخانے کے ردی گھر میں دستیاب ہوگیا ہے

تعلیم۔ عربی و فارسی

میرزا صاحب نے خلیفہ معظم کے مکتب میں عربی کی صرف ابتدائی اور فارسی کی مروجہ تعلیم حاصل کی تھی۔ زبانِ فارسی سے اُنھیں فطری دلچسپی تھی، ادھر خوش قسمتی سے، عنفوانِ شباب میں ایک ایرانی نژاد بزرگ، ملا عبدالصمد، وارد اگرہ ہوکر، دو سال تک اُن کے مکان پر مقیم رہا، جس سے اُنھوں نے زبانِ فارسی کے حقائق و دقائق سیکھے، اور اس طرح اپنی بواسطہ تحصیلِ ادبِ فارسی کو پایۂ تکمیل تک پہنچا لیا۔[2] ایک عریضے میں فرماتے ہیں:

(۱) انتخاب یادگار، ۱۷۷، ۱۷۸؛ تاریخ لطیف: ۱۵۲؛ ذکر غالب: ۴۷۔ یہاں سنہ ۱۲۹۷ھ سالِ وفات درج ہے۔
(۲) قاطع برہان، (ص ۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا عبدالصمد سنہ ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں آگرہ وارد (باقی)

"بدو فطرت سے میری طبیعت کو زبان فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھکو ملے۔ بارے مراد برآئی، اور اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا، اور اکبرآباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا، اور میں نے اوس سے حقایق و دقایق زبان پارسی کے معلوم کئے۔ اب مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے۔ مگر دعوئ اجتہاد نہیں ہے۔ بحث کا طریقہ یاد نہیں ہے۔" (۱)

تصوف و فلسفہ

دلی میں میرزا صاحب کا حلقۂ احباب مولانا فضلِ حق خیرآبادی جیسے فلسفی، حکیم مومن خاں مرحوم جیسے نجومی، منشی صدرالدین خاں آزردہ جیسے فقیہ اور کالے صاحب جیسے صوفی بزرگواروں پر مشتمل تھا، اس لیے کچھ مجلسی مباحثوں اور تذکروں سے اور قدرے ذاتی مطالعے سے انھیں فلسفے کی مختلف شاخوں اور تصوف کے اصولی مسائل پر مبصرانہ عبور ہو گیا تھا۔ میرزا صاحب کے احباب اور شاگردوں میں چند طبیب بھی تھے خود اُن کی آخری عمر کا بڑا حصہ گوناگوں امراض میں گزرا۔ ان اسباب نے انھیں طب سے خاطر خواہ واقفیت کر دیا تھا۔ چنانچہ اُن کے کلام میں جابجا ان علوم کی اصطلاحوں کا عالمانہ طور پر ذکر آیا ہے۔ زیرِ نظر مکاتیب میں سے بھی ایک کے اندر علم نجوم سے واقفیت کا اور دوسرے میں طب کے تجربے کا ذکر ہے (۲) کلیات نثر فارسی (ص ۹۱) میں ایک نثر ہے، جو نواب خلد آشیاں کے جشن جلوس کے موقع پر لکھ کر پیش کی گئی تھی۔ اس میں بھی منجمانہ پرداز بیان نمایاں ہے۔

وطن اور سکونت دلی

میرزا صاحب کا وطن اکبرآباد (آگرہ) ہے۔ اپنے ایرانی استاد کے ذکر میں نواب خلد آشیاں کو لکھا ہے:

"اکابر پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا، اور اکبرآباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا۔" (۳)

(بقیہ) ہوا تھا لیکن یہ امر جائے تعجب ہے کہ قاطع برہان کے ہنگامے سے قبل کسی جگہ میرزا صاحب نے طاعبدالصمد کا ذکر نہیں کیا ہے، حالانکہ کلکتے کے قیام کے دوران میں انھیں بڑا زبردست ادبی معرکہ پیش آیا تھا جو متقاضی تھا کہ وہ مخالفین پر اس علامۂ دہر سے استفادے کا اظہار کرتے۔

(۱) مکاتیب: ۹۶ (۲) مکاتیب: ۳۱، ۴۵ (۳) مکاتیب: ۶۰

لیکن شادی کے بعد ترک وطن کر کے دلی میں آ بسے تھے۔ یکم ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو لکھتے ہیں:

"میں بادن ترپن برس سے یہاں رہتا ہوں۔" (۱)

اس حساب سے اُن کا دلی میں قیام سنہ ۱۸۱۳ء یا سنہ ۱۸۱۴ء سے ہونا چاہیے۔ دلی میں میرزا صاحب کا آبائی مکان نہ تھا، اس لیے ہمیشہ کرایے کے مکانات میں رہے۔ ان میں سے دو کا ذکر ایک عریضے میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"دبیرانِ خاص برعنوان نامہ ہای چنیں نشان کلبۂ این درویش در لیش عقب مسجد جامع نبشتہ اند و من از ہفت ہشت سال در محلۂ بلی ماراں می مانم۔" (۲)

مسکن کے حالات

جس عہد میں میرزا صاحب دلی تشریف لائے، وہ دلی کی پیرانہ سالی کا زمانہ تھا، تاہم آثارِ شگفتگی و آبادانی ہر طرف ہویدا تھے۔ مذر سنہ ۵۷ء نے اس شہر کی بچی کھچی دولت لوٹ کر نیا سکہ چلا دیا۔ عمارات گرا کر سڑکیں بچھائی گئیں، شہر اُجاڑ کر قبرستان آباد کیے گئے اور اہلِ ہنر کو شہر بدر کر کے شہر میں فوج کا پڑاؤ ڈالا گیا، تو دلی دلی نہ رہی، کنپ ہو گئی۔ ایک بار نواب فردوس مکاں کو چوب چینی کی ضرورت پیش آئی۔ شہرِ دہلی، اطبا اور عطاروں کا مخزن تھا؛ اس لیے سرکار نے میرزا صاحب سے فرمائش کی۔ اس کے جواب میں ۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء کو میرزا صاحب تحریر کرتے ہیں:

"دلی اب شہر نہیں، چھاؤنی ہے، کنپ ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر کے امرا نہ اطراف شہر کے رؤسا۔" (۳)

۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو دلی میں کاتبوں کے فقدان کی وجہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"شہر سراسر ویران ہے۔ کاتب کہاں؟" (۴)

خشک سالی

سنہ ۶۵ء میں دلی بارانِ رحمت کے فیض سے محروم رہی۔ جولائی بھری برسات کا مہینا ہے، لیکن شہر دلی کے اندر اس زمانے میں بھی لُو چلتی رہی۔ میرزا صاحب نے ۲۳ جولائی

(۱) مکاتیب: ۵۷
(۲) مکاتیب: ۱۰۱
(۳) مکاتیب: ۳۰۱
(۴) مکاتیب: ۵۸

کے عریضے میں دلی کی بربادی کا رونا ان لفظوں میں رویا:

"یہاں خلق کو مینھ درکار ہے، اور ہوا شرارہ بار ہے۔ دھوپ کی تیزی سے آدمی کے تیور اور پہاڑ کے پتھر جلے جاتے ہیں۔ پانی جگر گداز، ہوا جانستاں، امراض مختلفہ کا ہجوم، جہاں تہاں۔ جز اعضای انسان کے کہ وہ پسینے میں تر ہیں، طراوت و رطوبت کا کہیں پتا نہیں۔ یا لُو چلتی ہے، یا مطلق ہوا نہیں۔" (۱)

۱۱ اگست کو پھر لکھا:

"یہاں مینھ اسی قدر برسا ہے کہ جس کے پانی سے زمیندار حاصل فصل ربیع سے ہاتھ دھو لیں۔" (۲)

برسات

لیکن آیندہ سال بارش نے سنہ ۶۵ء کی قلت باراں کی تلافی کی، اور شہر میں اس قدر پانی برسا کہ گزشتہ پانچ دن ترپن برس سے ایسا نہ برسا تھا۔ یکم ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو میرزا صاحب نے لکھا ہے:

"برسات ایسی ہوئی ہے کہ میں پانچ دن ترپن برس سے یہاں رہتا ہوں۔ عرش آرامگاہ اکبر شاہ کے عہد میں ایکبار ایسی برسات دیکھی تھی، یا امثال نظر آئی ہے۔" (۳)

عقائد

ایک عریضہ سے میرزا صاحب کے عقائدِ اسلامی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"اگرچہ فاسق و فاجر ہوں، مگر وحدانیت خدا اور نبوت خاتم الانبیا کا بدل معتقد اور زبان معترف ہوں۔" (۴)

اخلاق و عادات

میرزا صاحب کے اخلاق و عادات اُس عہد کے شرفا کے اخلاق و عادات کا نمونہ تھے۔ لغو گوئی سے پرہیز، جھوٹ اور تکلف سے نفرت، احباب کی تکلیف سے رنج، خوشی سے راحت، چھوٹوں پر مہربانی، اور بزرگوں کی خیر خواہی، اُن کا شعار تھا۔ (۵)

(۱) مکاتیب: ۳۹ (۲) ایضاً: ۴۰ (۳) ایضاً: ۵۷ (۴) ایضاً: ۶۱
(۵) ایضاً: ۱۲، ۱۶، ۲۱، ۲۳، ۳۸، ۴۶، ۶۱ —

قدما کا اعتراف

میرزا صاحب شعرای قدیم کے فنی مرتبے اور اُن کے کلام سے استشہاد کو تسلیم کرتے تھے۔ چنانچہ اسبارے میں نواب خلد آشیاں کو صراحتاً لکھا ہے کہ:

"دفعتہ اشعار قدما کا معتقد۔ ادن لوگوں کے کلام کا عاشق ہے" (۱)

نیز خلیفہ احمد علی صاحب رامپوری کو دورِ متاخرین کے گلِ نوشگفتہ، مولانا عرفی شیرازی کے متعلق لکھتے ہیں:

"قواعد زبان فارسی کا ماخذ تو ان حضرات کا کلام ہے۔ عرفی کی زبان سے جو نکل جائے وہ سند ہے۔ ہمارے واسطے وہ ایک قاعدۂ محکم ہے۔ وہ مطاع ہے اور ہم اوسکے مقلد اور مطیع ہیں" (۲)

ہندی شعرا اور فرہنگ نویسوں کا انکار

لیکن ہندی شعرای فارسی گو اور ہندی فرہنگ نویسوں کے مطلقاً قائل نہ تھے، اور اس معاملے میں حدود انصاف سے بھی آگے نکل گئے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ حضرات اہلِ زبان کا کلام پڑھ کر اپنے قیاس سے محاورات والفاظ کے معنے قائم کرتے ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر جگہ ان کا قیاس صحیح نکلے، بنابریں ان سے سیکڑوں غلطیاں سرزد ہوئی ہیں نواب خلد آشیاں کو لکھا ہے:

"میاں انجو جامع فرہنگ جہانگیری، شیخ رشید راقم فرہنگ رشیدی، عظامی عجم میں سے نہیں۔ ہندان کا مولد، ماخذان کا اشعار قدما و ہادی ان کا ان کا قیاس، ٹیکچند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو۔ سبحان اللہ! ہندی بھی اور ہندو بھی" (۳)

اس عریضے کے جواب الجواب میں لکھتے ہیں:

"شعرای ہند کے کلام میں جو غلطیاں نظر آتی ہیں، یا ہندی فرہنگ لکھنے والوں کے بیان میں جو نادرستی اور باہم جو اون کی عقول میں اختلاف ہیں، اوس میں میں کلام نہیں کرتا۔ اپنی تحقیق کو مانتے ہوئے ہوں" (۴)

(۱) مکاتیب: ۶۱ (۲) ایضاً: ۱۱۴ (۳) ایضاً: ۶۱ (۴) ایضاً: ۶۱

بے تکلفی

اپنے مخلص احباب اور محسنوں سے میرزا صاحب تکلف برتنا ناسزا جانتے تھے۔ نواب فردوس مکاں سے اُن کا تعلق سراسر اخلاص پر مبنی تھا۔ اس لیے اگر روپے کی ضرورت آپڑتی تو میرزا صاحب بلا تکلف مانگ لیا کرتے تھے۔ اپنے اس رویّے کو ایک خط میں ظاہر بھی کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"جو آپ بن مانگے دیں، اوس کے لینے میں مجھے انکار نہیں، اور جب مجھے حاجت آپڑے، تو آپ سے مانگنے میں عار نہیں۔"(۱)

قرض سے نفرت

میرزا صاحب کو قرض سے طبعی نفرت تھی، اس لیے ہمیشہ کوشش کرتے رہے کہ اس مصیبت کا سامنا نہ ہو۔ مگر متموّل اور ذی عزت خاندان کا فرد ہونے کے سبب سے، اُن کے مصارف زیادہ تھے، اور سرکارِ رامپور اور انگریزی خزانے سے ماہوار آمدنی (ایک سو باسٹھ روپے آٹھ آنے) ناکافی ہوتی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ تقریباً ہر مہینے اُنھیں قرض لینا پڑتا، اور جب قرض خواہوں کا تقاضا سخت ہو جاتا، تو سرکارِ رامپور کی امداد سے اس بارِ گراں سے سبکدوشی حاصل کرتے۔ اس سلسلے کی سب سے پہلی تحریر میں، جو ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کو نواب فردوس مکاں کی خدمت میں ارسال کی ہے، لکھتے ہیں:

"بارِ گران غم سے پست ہو گیا ہوں آگے تنگدست تھا، اب تہی دست ہو گیا ہوں۔ جلد میری خبر لیجے، اور کچھ بھجوا دیجے۔"(۲)

اس کے بعد ۸ دسمبر سنہ ۱۸۵۹ء کو پھر لکھا ہے:

"سو روپیہ کی ہنڈوی... پہنچی، اور روپیہ وصول میں آیا، اور صرف ہو گیا، اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں؟ اس مشاہرۂ مقرری سے علاوہ دو سو روپیہ اگر مجھ کو اور بھیج دیجے گا تو جلا لیجیے گا۔ لیکن اس شرط سے کہ اس عطیۂ مقرری میں محسوب نہ ہو، اور بہت جلد مرحمت ہو۔"(۳)

(۱) مکاتیب: ۱۱ (۲) ایضاً: ۱۱ (۳) ایضاً: ۱۶

۲۲ اگست سنہ ۱۸۶۵ء کو نواب خلد آشیاں کی خدمت میں تحریر کیا ہے:

"ان دنوں میں متفرقات کے قرضدار سرگرم تقاضا بلکہ آمادۂ شور و غوغا تھے۔ دو سو روپیہ کی ہنڈوی صراحیٔ آب حیات ہو گئی۔ دام مرگ سے نجات ہو گئی۔" (۱)

ایک بار رامپور سے تنخواہ کی روانگی میں دیر ہو گئی تھی۔ میرزا صاحب کو قرضخواہوں کی رقمیں ادا کرنی ہونگی، اس لیے ۱۰ اگست سنہ ۱۸۶۶ء کو سرکار کی خدمت میں لکھا:

"میرا حال یہ کہ انگریزی تنخواہ گھر میں اور کچھ قرض کی قسط میں جاتی ہے۔ حضور کے عطیہ پر میرا اور شاگرد پیشہ کا اور حسین علی کا گزارا ہے۔ عالم الغیب جانتا ہے جس طرح گزرتی ہے چار سو ساڑھے چار سو کا قرض باقی ہے۔ اب کوئی قرض بھی نہیں دیتا۔" (۲)

۱۳ اگست سنہ مذکور کو پھر لکھتے ہیں:

"کل آخر روز میر منشی حضور کا خط آیا۔ جون کی تنخواہ کی رسید نہ پہنچنے کی اطلاع پائی۔ تہیدستی و قرض کے رنج میں خستہ و آزردہ بیٹھا تھا۔ اوسی وقت عرضی لکھی۔ اگرچہ ڈاک کا وقت نہ تھا، مگر بھیجدی۔" (۳)

۱۶ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء کے عریضے میں میرزا صاحب نے راحت کا انحصار قرض کی ادائی میں بتایا ہے۔ تحریر کرتے ہیں:

"حضور ملک و مال جس کو جس قدر چاہیں عطا کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے صرف راحت مانگتا ہوں۔ اور راحت منحصر اس میں ہے کہ قرض باقی ماندہ ادا ہو جائے۔ اور آیندہ قرض لینے کی حاجت نہ پڑے۔" (۴)

سرکار نے میرزا صاحب کا قرض ادا فرما دیا، تو ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۷ء کو اُس کے شکریے میں لکھتے ہیں:

"حضرت کے تصدق سے قرض ادا ہو گیا۔ تنخواہ نے قسط سے اور میں نے رنج سے رہائی پائی۔" (۵)

اگست سنہ ۱۸۶۸ء میں میرزا صاحب کے قرض کی ادائی کا سرکار نے پھر وعدہ فرمایا۔ اس وعدے سے میرزا صاحب کو جو مسرت ہوئی، اُس کا اندازہ ان الفاظ سے بخوبی ہوتا ہے:

"تین التماسیں سابق پیش ہوئی تھیں ... ان خواہشوں کے منظور و مقبول ہونے کی نوید پائی۔ انشاء اللہ الکریم حسب ارشاد حضور اسی برس ۱۸۶۸ء میں آمد زمستان یعنی نومبر و دسمبر میں میرا قرض ... ادا ہو جائیگا۔" (۶)

(۱) مکاتیب: ۴۵ (۲) ایضاً: ۵۵ (۳) ایضاً: ۵۶ (۴) ایضاً: ۶۰
(۵) ایضاً: ۶۶ (۶) ایضاً: ۸۱

۱۶ نومبر سنہ ۶۸ء کو پھر لکھا:

"حال میرا تباہ ہوتے ہوتے اب یہ نوبت پہنچی کہ اب کے تنخواہ میں سے ۵۴ روپے بچے۔ ... مجملاً آٹھ سو روپے ہوں تو میری آبرو بچتی ہے۔ ناچار حسین علی خاں کی شادی اور اوس کے نام کی تنخواہ سے قطع نظر کی۔ اب اس باب میں عرض کروں، کیا مجال؟ کبھی نکھوں گا۔ آٹھ سو روپے مجھ کو اور دیجے۔ شادی کیسی؟ میری آبرو بچ جائے، تو غنیمت ہے۔ ... مختصر یہ کہ اب میری جان اور آبرو آپ کے ہاتھ ہے۔ مگر حضور جو عطا فرماتے ہے جلد ارشاد ہو۔"(۱)

۱۷ دسمبر کو میرزا صاحب نے یاد دہانی کی، اور پھر آخری خط میں اپنے اضطراب کو ان الفاظ سے ظاہر کیا:

"حضور قرضخواہوں نے بہت عاجز کر رکھا ہے۔ بس میرا یہی کام ہے کہ یاد دلا دوں۔ آگے حضرت مالک ہیں۔"(۲)

لیکن ابھی یہاں سے رقم پہنچنے نہ پائی تھی کہ اُن کا انتقال ہو گیا۔

امراض اور ضعف پیری

میرزا صاحب نے، سب سے پہلے، عریضۂ ۱۴، مورخۂ یکم اکتوبر سنہ ۱۸۵۹ء میں ضعفِ پیری کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"خدمت گزار ہوں اور دعا گو شامیرا کام ہے۔ بڑھاپے نے کھو دیا۔ جز نفسے چند، مجھ میں کچھ باقی نہیں۔"(۳)

قولنج

امراض کا شکوہ ۱۱ نومبر سنہ ۶۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے میں میرزا صاحب ابتداءً دردِ قولنج اور بعد ازاں بخار میں مبتلا ہوئے، اور ایک ماہ تک ان امراض کی مصیبت جھیلتے رہے۔ فرماتے ہیں:

"دعا گو ایک مہینا بھر سے بیمار ہے۔ ابتدا وہی قولنج دوری۔ بسبب استعمال ادویۂ حارہ، کہ اس مرض میں اوس سے گزیر نہیں، تپ نے آگھیرا۔ کئی بار یاں بھگتیں۔

(۱) مکاتیب: ۸۳ (۲) ایضاً: ۸۴ (۳) ایضاً: ۱۵

اب دو باریاں ٹل گئی ہیں۔ لیکن طاقت بالکل سلب ہو گئی ہے، اور ضعف دماغ نے قریب ہلاکت پہنچا دیا ہے۔ بالفعل آب سیب کا استعمال ہے۔" (۱)

امراض مختلفہ کا ہجوم

نواب خلد آشیاں کی دعوتِ قدومِ رامپور کے جواب میں امراضِ مختلفہ اور صعوبتِ سفرِ تابستان کا عذر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وہ آگ برس رہی ہے کہ طیور کے پر جل رہے ہیں۔ بعد آگ کے پانی برسے گا۔ سفر خصوصاً بوڑھے رنجور آدمی کو۔ دونوں صورت میں متعذر۔" (۲)

۲۳ جولائی کو پھر تحریر کیا ہے:

"پانی جگر گداز، ہوا جانستان، امراضِ مختلفہ کا ہجوم جہاں تہاں۔" (۳)

نیم مردہ

سنہ ۱۸۶۵ء میں، نواب سکندر زمانی بیگم صاحبہ کا انتقال ہوا۔ ایسے موقع پر میرزا صاحب کو "بزبانِ فارسی و عبارتِ بلیغ" تعزیت نامہ لکھنا چاہیے تھا، لیکن بڑھاپا اور ضعف مانع آیا، اور انھوں نے ۱۸ ستمبر سنہ مذکور کو از راہِ معذرت لکھا:

"اب میں نیم مردہ دل پژمردہ، خاطر افسردہ، جس باب میں لفظ و معنی فراہم کیا چاہوں، دو سرا سر طبع کے خلاف۔" (۴)

کوفتہ و رنجور

رامپور کے دوسرے سفر سے واپس ہوتے ہوئے، میرزا صاحب مراد آباد پہنچکر بیمار ہو گئے تھے۔ نواب خلد آشیاں نے مزاج پرسی کی، تو اُس کے جواب میں ۲۱ جنوری سنہ ۶۶ء کو روداد سفر بیان کرکے، لکھتے ہیں۔

"ایک ہفتہ کوفتہ و رنجور رہا۔ اب ویسا پیر و ناتواں ہوں جیسا کہ اس سفر سے پہلے تھا۔" (۵)

ہمدلیش کا حال

بعد ازاں ۱۵ فروری سنہ مذکورہ کو امراض کی تفصیل فرماتے ہیں:

(۱) مکاتیب: ۲۲ (۲) ایضاً: ۳۸ (۳) ایضاً: ۳۹ (۴) ایضاً: ۴۷
(۵) ایضاً: ۴۹

"سامعہ مدت سے کھو بیٹھا۔ اب آنکھوں کو بھی رو بیٹھا۔ ... فقدانِ طاقت، سقوطِ اشتہا، ضعفِ بصر، ضعفِ سمت" (۱)

نیم جاں ہوں

سفر کی صعوبت اور عرضِ راہ کی بیماری نے، میرزا صاحب کی رہی سہی صحت برباد کر دی، اور یہ اپنے آپ کو نیم جان سمجھنے لگے۔ چنانچہ ۲۹ مارچ کو لکھتے ہیں:

"اپنا حال اس سے زیادہ کیا لکھوں کہ آگے ناتواں تھا، اور اب نیم جاں ہوں۔ برخوردار زین العابدین خاں، اپنے مشاہدہ کے مطابق جو میری حقیقت عرض کرے، وہ مسموع و مقبول ہو۔" (۲)

حواس درست نہیں

امراض اور مالی پریشانیوں نے میرزا صاحب کے حواس پر بھی کافی اثر اندازی کی تھی ۱۱ اگست سنہ ۶۶ء کو تحریر کیا ہے:

"غم نے بشمول بڑھاپے کے بہت دمغمحل کر دیا ہے۔ حضرت کے قدموں کی قسم! نہ حواس درست، نہ رائے صحیح۔ برسوں سے مکروہات میں مبتلا ہتے رہتے اب طاقتِ تحمل کی نہ رہی۔ خدا جانے کیا ہوتا ہے، کیا سمجھتا ہوں، کیا کرنا چاہیے، کیا کرتا ہوں۔" (۳)

امراض قدیم بڑھ گئے

۱۸ ستمبر سنہ ۶۶ء اور اس کے بعد ۱۳ مارچ سنہ ۶۷ کو لکھتے ہیں:

"اس درویش کا حال اب قابلِ گزارش نہیں۔ امراض قدیم بڑھ گئے۔ دورانِ سر، اور رعشہ اور ضعفِ بصر، تین بیماریاں نئی پیدا ہوئی ہیں۔ قلم نہیں بنا سکتا۔ لڑکوں سے بنوا لیتا ہوں۔ برسوں کی بات نہیں رہی۔ ہفتوں کی یا مہینوں کی زندگی رہ گئی ہے۔" (۴)

قرض مہمل

اس کے ایک مہینے بعد ۱۴ اپریل سنہ ۶۷ء کو نمائشِ باغِ بینظیر کی شرکت کی آرزو کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"نمائشگاہ سراسر سورا رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں، اور خونِ جگر کھاتا ہوں کہ ہائے!

(۱) مکاتیب: ۵۰ (۲) ایضاً: ۵۱ (۳) ایضاً: ۵۶ (۴) ایضاً

میں وہاں نہیں۔ بالاخانے پر رہتا ہوں۔ اوتر نہیں سکتا۔ ماتا کہ آدمیوں نے گود میں لے کر اوتارا، اور پالکی میں بٹھادیا۔ کہار چلے، راہ میں نہ مرا اور رامپور پہنچ گیا۔ کہاروں نے جاکر نبٹیر میں میری پالکی رکھدی۔ پالکی قفس اور میں طائر اسیر، وہ بھی بے پر و بال۔ نہ چل سکوں، نہ پھر سکوں۔ جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں، یہ سب بطریق فرض محال ہے، ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے۔" (۱)

بے دم نہیں

رفتہ رفتہ، ماہ و سال کے سفر کے ساتھ ساتھ، میرزا صاحب کے اعضا بھی فرسودہ و ناتواں ہوتے چلے گئے۔ تا آنکہ ۱۱ جون سنہ ۱۸۶۷ء تک یہ نوبت پہنچی کہ اُنھوں نے مفتی سیلچند کو صاف صاف لکھدیا:

"بھائی! بے تکلف لکھتا ہوں کہ مجھ میں اب دم نہیں۔ نہ طاقت باقی ہے، نہ حواس درست ہیں۔ لکھا کچھ چاہتا ہوں، لکھ کچھ جاتا ہوں۔ بس اتنو یہ نوبت پہنچی ہے کہ آج بچا کل مرا، کل بچا پرسوں مرا۔" (۲)

وفات اور مدفن

آخر کار وہ دن بھی آگیا، جس کی میرزا صاحب کو برسوں سے آرزو تھی، اور ۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۹ء مطابق ۲ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ کو، اُن کا انتقال ہوگیا۔ اُن کی خواہش تھی کہ بعد مرگ رامپور میں دفن کیا جاؤں۔ چنانچہ ۲۱ دسمبر سنہ ۵۹ء کو، حسین مرزا کو لکھا تھا:

"رامپور زندگی میں میرا مسکن اور بعد مرگ میرا مدفن ہو لیا۔" (۳)

قضا و قدر نے یہ تمنا پوری ہونے دی، اور میرزا صاحب شاہ نظام الدین اولیا کے مزار کے قریب اپنے سسرالی خاندان کے احاطے میں مدفون ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ (۴)

(۱) مکاتیب: ۶۹ (۲) ایضاً: ۱۱۱ (۳) اردوی: ۳۲۹

(۴) تاریخ وفات انتقال کے لیے حسین علی خاں کا عریضہ ملاحظہ ہو جو مکتوب ۱۱۷ کے حاشیے میں درج ہے۔

تصانیف

میرزا صاحب نے زیرِ نظر عریضوں میں اپنی متعدّد تصنیفات کا تذکرہ کیا ہے۔ ان میں سے اکثر مشہور ہیں اور کئی کئی بار طبع بھی ہو چکی ہیں؛ لیکن بعض کے حالات سے ابھی تک اربابِ علم آگاہ نہیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کا اجمالی ذکر کر دیا جائے۔

مہر نیمروز

۱۴ جنوری سنہ ۵۸ء کے عریضے میں، میرزا صاحب نے اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"از ہفت ہشت سال تجریر تاریخ سلاطین تیموریہ ی پرداختم۔" (۱)

واقعہ یہ ہے کہ سنہ ۱۸۵۰ء میں، شاہِ ظفر نے میرزا صاحب کو تاریخ نویسی کی خدمت پر پچاس روپیہ ماہوار مشاہرہ کے ساتھ مقرر فرمایا، اور حکم دیا کہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر تاریخوں سے حالات اقتباس کر کے میرزا صاحب کو دیا کریں، اور یہ اپنے اندازِ خاص میں اُن واقعات کو تحریر کریں۔ میرزا صاحب نے کتاب کا نام "پرتوستان" رکھا اور یہ تجویز قرار پائی کہ کتاب دو حصوں میں تقسیم کی جائے: پہلا حصہ ابتدائی آفرینش سے امیر تیمور گورگان تک بالاختصار اور تیمور سے ہمایوں تک قدرے تفصیل کے ساتھ مرتب کیا جائے، اور دوسرے میں جلال الدین اکبر سے سراج الدین بہادر شاہ تک کے واقعات ہوں۔ میرزا صاحب نے حصۂ اول کا نام "مہر نیمروز" اور ثانی کا "ماہِ نیم ماہ" رکھا۔ حصۂ اول کے متعلق ۱۱ جون سنہ ۱۸۵۲ء کو منشی جواہر سنگھ جوہر کو لکھا ہے:

"مسودۂ روزنامۂ روداد اورنگ نشینان چغتائیہ بدست ہیرا سنگھ روان داشتہ ایم، وہنوز

(۱) مکاتیب: ۹۔ عریضہ ۷۷ میں بھی خدمت تاریخ نگاری سلاطین تیموریہ کا تذکرہ کیا ہے۔

از رسید نش نشان نیافتہ ایم۔ اگر رسیدہ است بنویسند۔ ورنہ از ہیرا سنگھ باز پرس کنند۔"(۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سال ڈیڑھ سال کے اندر ہی "مہر نیمروز" تمام ہو چکی تھی؛ لیکن سنہ ۱۲۷۱ھ تک زیورِ طباعت سے آراستہ نہو سکی(۲) جس کی وجہ یہ ہوگی کہ اگر میرزا صاحب فوراً حضورِ شاہ میں کتاب پیش کر دیتے، تو حصۂ دوم کا تقاضا شروع ہو جاتا، جس کے واسطے وہ اس قدر جلد تیار نہ تھے۔

بہر حال مطبوعہ کتاب، بادشاہ کے روبرو سنہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء) میں پیش ہوئی۔ چاہیے تھا کہ میرزا صاحب حصۂ ثانی کی ترتیب شروع کر دیتے؛ لیکن ایسا نہیں ہوا، حتیٰ کہ سنہ ۵۷ء نے بساطِ حکومت اُلٹ دی، اور "ماہِ نیم ماہ" شرمندۂ طلوع نہو سکا۔ بظاہر اس کی ایک اہم وجہ میرزا صاحب کی جدید طرزِ انشا بھی ہے، جو بادشاہ تو بادشاہ، اُس عہد کے بعض ادیبوں کو بھی پسند نہ تھی؛ ورنہ ناممکن تھا کہ سنہ ۵۴ء سے سنہ ۵۷ء تک بادشاہ تقاضا نہ کرتے یا مہلت عطا کر دیتے اور قبلِ اتمامِ کتاب جلا وطن ہو جاتے، تو میرزا صاحب اپنے خطوط میں یہ نہ لکھتے کہ میں نے حصۂ ثانی کی ترتیب کا آغاز کر دیا تھا؛ لیکن انجام تک اس لیے نہیں پہنچایا کہ اُس کا قدردان ولی سے رخصت ہو چکا ہے۔ چونکہ اسی سال شیخ ابراہیم ذوقؔ کا انتقال ہوا اور میرزا صاحب، بہ تنخواہِ سابق، استادِ شہ قرار پائے، اس لیے یہ بھی ممکن ہے کہ اُنھوں نے خلافِ دانشمندی سمجھا ہو کہ ایک تنخواہ کے عوض دو خدمتیں انجام دیں۔ واللہ اعلم۔(۳)

دستنبو

میرزا صاحب نے "آغازِ یازدہم مئی سنہ ۱۸۵۷ء سے ۳۱ جولائی سنہ ۱۸۵۸ء تک رودادِ شہر اور اپنی سرگزشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا... اور التزام اس کا کیا... کہ دساتیر کی عبارت یعنی پارسیٔ قدیم لکھی جائے، اور کوئی لفظِ عربی نہ آئے"(۴) اور منشی شیونرائن کے مطبع، واقع اکبر آباد (آگرہ) میں طبع کرا کے، ایک نسخہ نواب فردوس مکاں کو ارسال کیا۔ ۷ نومبر سنہ ۵۸ء کو اس کی رسید کے متعلق لکھتے ہیں:

(۱) کلیاتِ نثرِ فارسی: ۲۵۰ (۲) ایضاً: ۳۷۴ (۳) اوراقِ خزانہ بابت سنہ ۵۶-۱۸۵۵ء سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴ مارچ سنہ ۵۶ء کو اس کا حساب محرا ہوا تھا۔ (۴) اردوئے: ۴۹

"اس تردد سے کہ بسبب کم فرصتی کے اون کا ملاحظہ نکرنا مرقوم ہوا، ریختہ کے دیوان اور اس کتاب کا پہنچنا معلوم ہوا۔ دیوان کے دیکھنے نہ دیکھنے میں آپ کو اختیار ہے، مگر یہ چار جزو کا رسالہ جواب بھیجا ہے اس کا دیکھنا ضرور درکار ہے۔ فارسی قدیم اور پھر حسن معنی اور صنعت الفاظ؛ با این ہمہ ہر امر کی احتیاط اور ہر بات کا لحاظ.... میں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں، اور وزرای ملکۂ دار اور بان کے دو سارٹیفکٹ پا چکا ہوں۔ اگر اس اجمال کو بتفصیل معلوم کیا چاہے، تو اسی کتاب موسوم بہ "دستنبو" میں دیکھا چاہیے۔" (۱)

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ، نومبر سنہ ۵۸ء سے قبل، کتاب طبع ہو چکی تھی۔ اس کتاب کی طباعت میں، میرزا صاحب نے جس قدر اہتمام اور کوشش کی ہے، اُس کی داستان سے اردوی معلی اور عودِ ہندی کے صفحے پڑھیں۔

نامۂ غالب

میرزا صاحب نے سنہ ۱۸۶۰ء میں فارسی کی مشہور فرہنگ "برہانِ قاطع" کے اغلاط پر مشتمل ایک رسالہ، "قاطعِ برہان" لکھ کر، نواب فردوس مکان کی امداد سے شائع کیا تھا۔ اس کے جواب میں ہندوستان کے متعدد اہلِ علم نے رسائل لکھے۔ ان حضرات میں سے ایک بزرگ مرزا رحیم بیگ نے رسالۂ "ساطعِ برہان" تصنیف کیا، اور اُس میں میرزا صاحب کو بہت جلی کٹی سنائیں۔ میرزا صاحب نے اُس کا جواب الجواب لکھا، اور اُس کے پانچ نسخے نواب مرزا خاں داغ دہلوی کے توسط سے، نواب خلد آشیاں کی خدمت میں نذر گزران کر، ۱۳ ماہ اگست سنہ ۱۸۶۵ء کو لکھا:

"ایک عبارت کا ایک جزو بطریق خط ایک انصاف دشمن کو لکھ کر چھپوا دیا ہے۔ پارسل اوس کا نواب مرزا کو ارسال کیا ہے۔ پانچ رسالے وہ میری طرف سے نذر گزرانیں گے۔ حضرت قبول نذر کو میرا عزو شرف جانیں گے۔" (۲)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسالۂ مذکورہ شروعِ اگست سنہ ۱۸۶۵ء میں شائع

(۱) مکاتیب: ۱۰ و ۱۱ (۲) مکاتیب: ۴۱

ہوا تھا۔[۱]

دیوان اردو

میرزا صاحب نے ۵ ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۳ھ کے عریضے میں دیوانِ اردو کا اسطرح ذکر کیا ہے:

"مجکو غم یہ ہے کہ غزلہای اصلاحی اور دیوان اردو کی رسید میں نے نہ پائی..... دیوان کی رسید... ایسے ہی باریک کاغذ پر لکھکر اس ساہوکار کو دیجے گا، اور اوس کو تاکید کیجے گا کہ اس کو بھیجدے۔"[۲]

منشی شیو نرائن اکبرآبادی کو اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اب تم سنو۔ دیوان رسختہ" اتم واکمل کہاں تھا؟ مگر ہاں میں نے غدر سے پہلے لکھواکر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رام پور بھیجدیا تھا۔"[۳]

اس بیان سے بظاہر یہ مترشح ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے مئی سنہ ۵۷ء سے قبل دیوانِ اردو رامپور بھیجا۔ لیکن در اصل نسخۂ مذکور پانچویں عریضے کے جواب کی تاریخ (۹ مئی) اور تاریخِ آشوبِ غدر (۱۱ مئی) کے درمیان کسی تاریخ کو بھیجا گیا تھا۔ چونکہ وہ تاریخ، غدر سے قبل تھی، اس لیے میرزا صاحب نے مجلاً "غدر سے پہلے" کہا ہے۔

میرزا صاحب کو اس کی رسید نومبر سنہ ۵۸ء تک موصول نہو سکی۔ جب ماہِ مذکور میں اُنھوں نے "دستنبو" کی ایک جلد تحفۃً ارسال کی اور نواب صاحب نے جواب میں لکھا کہ عدیم الفرصتی کے سبب دیوان اور دستنبو ملاحظہ سے نگزرے، تو میرزا صاحب نے ۷ نومبر کو لکھا:

"اس قرینے سے کہ بسبب کم فرصتی کے اون کا ملاحظہ نکرنا مرقوم ہوا، رسختہ کے دیوان اور اس کتاب کا پہنچنا معلوم ہوا۔"[۴]

(۱) اس رسالے کا اخیر ورق ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی کے پاس محفوظ ہے۔ اُس سے پتا چلتا ہے کہ رسالہ ۱۶ صفحوں میں ختم ہوا ہے۔ صفحہ ۱۶ کے نیچے سطر کے باہر چھاپے خانے والوں کی طرف سے یہ عبارت خاتمے کی چھپی ہے: "الحمد للہ کہ نجم الدولہ اسد اللہ خاں بہادر غالب کا خط موسومہ مرزا رحیم بیگ صاحب کا مطبع محمدی محمد مرزا خاں میں بیچ کنپ دہلی اندرون کوچہ چیلہ گذر فیض حد چھاؤنی کے، اہتمام عبدالرزاق بیگ سے چھپا سنہ ۱۸۶۵ء۔"

(۲) مکاتیب: ۷ و ۸ (۳) اردوی: ۳۸۱ (۴) مکاتیب: ۱۰

اس نسخے کی مفصل کیفیت عریضۂ ۲ کے حاشیے میں مندرج ہے۔

کلیاتِ فارسی

کلیاتِ فارسی کا نسخہ، میرزا صاحب نے مارچ سنہ ۱۸۶۱ء میں نذر کیا تھا۔ یہ نسخہ نواب فخرالدین خاں مرحوم کے قلم کا لکھا ہوا ہے[1]۔ ۷ اپریل سنہ ۶۱ء کو اس کے بارے میں میرزا صاحب تحریر کرتے ہیں:

"کلیات فارسی کے پہنچنے سے اور اس نذر کے مقبول ہونے سے مجکو بہت خوشی حاصل ہوئی۔" (۲)

۱۹ محرم سنہ ۱۲۸۲ھ (۴ مئی سنہ ۱۸۶۵ء) کو پھر اس کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"وہ قصیدۂ مدحیہ میرے دیوان فارسی میں مرقوم اور وہ دیوان حضرت کے کتابخانے میں موجود ہے۔" (۳)

بعد ازاں ۱۸ جون سنہ ۶۵ء کو پھر لکھتے ہیں:

"اب عرض یہ ہے کہ حسب الحکم حضور کے یہ قصیدہ میرے دیوان فارسی میں، جو کتابخانے میں موجود ہے، درج کیا جائے۔" (۴)

انتخاب دیوان اردو

نواب خلد آشیاں، اساتذۂ فارسی و اردو کے منتخبہ اشعار کی ایک بیاض مرتب فرمانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے میرزا صاحب کے چیدہ اشعار کی بھی ضرورت تھی۔ لہٰذا انھوں نے ۲۵ اگست سنہ ۱۸۶۶ء کو میرزا صاحب کو لکھا کہ اپنے اردو، فارسی کلام کا انتخاب روانا فرمایئے، تاکہ مجموعۂ مذکور میں شامل کیا جائے۔ میرزا صاحب نے ۱۰ ستمبر کو جواباً تحریر کیا:

"اردو کا دیوان ایک شخص کو دیا ہے بعد اتمام تحریر بہ نذر کیا جائے گا۔" (۵)

۱۸ ستمبر کو پھر تحریر کیا:

"خاطر اقدس میں نگزرے کہ غالب تعمیل احکام میں کاہل ہے۔ بصارت میں قصور، ہاتھ میں رعشہ، حواس مختل۔ ناچار کاتب کی تلاش کی۔ شہر سراسر ویران ہے، کاتب کہاں؟ بارے

(۱) نواب فخرالدین خاں کے متعلق پتا نہیں چل سکا کہ یہ کون بزرگ ہیں۔
(۲) مکاتیب: ۲۰ (۳) ایضاً: ۳۷ (۴) ایضاً: ۳۸ (۵) ایضاً: ۵۷

ایک دوست نے کاتب نشان دیا۔ اردو کا دیوان، اشعار پر صاد کرکے، اوس کو حوالہ کیا۔ کل وہ اجزای منقولہ آئے۔ آج بطریق پارسل مع اس عرضی کے ارسال کیے۔ خط کاتب کا مجکو پسند نہیں آیا۔ حضرت کو کیونکر پسند آئے گا۔ اغلاط اتنے تھے کہ مجکو تحریر کے برابر محنت پڑی۔" (۱)

۲۴ ستمبر کو سہ بارہ اردو دیوان کا اس طرح ذکر کیا ہے:

"اردو دیوان کا انتخاب بھیج چکا ہوں۔ یقین ہے کہ حضرت کی نظر انور سے گزر گیا ہوگا۔" (۲)

انتخاب دیوان فارسی

اسی سلسلے میں، میرزا صاحب نے اپنے فارسی دیوان کا انتخاب بھی روانا کیا تھا۔ ۱۰ ستمبر کے خط میں اس کے متعلق فرماتے ہیں:

"فارسی دیوان کا شیرازہ کھولکر چند شخصوں کے حوالے کیا ہے۔" (۳)

۱۸ ستمبر کے عریضے میں، دیوانِ اردو کے ارسال کی اطلاع کے بعد، لکھتے ہیں:

"فارسی کے کلیات کا شیرازہ کھولکر اجزا اوس کے احباب پر تقسیم کر دیئے ہیں۔ جا بجا اشعار پر صاد کر دیئے ہیں۔ وہ بھی میرے انتخاب کے مطابق نقل ہو رہے ہیں۔ بعد اتمام وہ بھی پیشکش کروں گا۔" (۱)

میرزا صاحب نے ۲۴ ستمبر کو مذکورۂ صدر انتخاب روانا کرکے بطریقِ اطلاع سرکار کو لکھا:

"آج فارسی دیوان کا انتخاب بطریق پارسل اس عرضی کے ساتھ بھیجتا ہوں۔ ۔۔۔۔ اس درویش نے صرف غزلیں اور رباعیوں کا انتخاب بھیجا ہے۔ قصائد و قطعات و مثنویات کا انتخاب ابھی نہیں بھیجا۔ اگر حکم ہو تو وہ بھی بھیجوں۔" (۲)

لیکن اغلب یہ ہے کہ سرکار نے ان اصنافِ نظم کا انتخاب طلب نہیں فرمایا۔ ان دونوں کو "انتخاب غالب" کے نام سے حال میں چھاپ کر شائع کر دیا گیا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ، یہ بھی میرزا صاحب ہی کی لکھی ہوئی ہیں:

کلیات نثر فارسی (جو پنج آہنگ، مہر نیمروز اور دستنبو کا مجموعہ ہے)، پنج آہنگ (مجموعۂ مکاتیب

(۱) مکاتیب: ۵۸ (۲) ایضاً: ۵۹ (۳) ایضاً: ۵۷

فارسی)، درفشِ کاویانی (قاطع برہان کا مرمہ نسخہ)، سید چین (جس میں وہ فارسی اشعار ہیں، جو کلیاتِ نظم کی طباعت کے بعد کہے گئے تھے)، عود ہندی، اردوی معلی (مکاتیب اردو کے مجموعے)، نکاتِ غالب، رقعات غالب، قادر نامہ (خالق باری کی طرز کا رسالہ)، نامۂ غالب، تیغِ تیز، لطائف غیبی، ترجمۂ دعا صباح۔

یہ آخری کتاب ایک چھوٹی سی فارسی مثنوی ہے، جو دراصل امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ایک دعا کا ترجمہ ہے۔ یہ میرزا عباس بیگ صاحب کی فرمائش پر سنہ ۱۲۸۴ھ سے پہلے مطبع نولکشور لکھنؤ میں چھپی تھی۔ بعد ازاں میں نے رسالہ نگار لکھنؤ کے ماہ مئی سنہ ۱۹۴۱ء کے پرچے میں طبع کرادی ہے۔

تلامذۂ رامپور

میرزا صاحب کے رامپوری شاگردوں کی تعداد بھی خاصی تھی لیکن مکاتیب میں صرف مذکورۂ تحت حضرات کا ذکر آیا ہے۔

ناظم

نواب فردوس مکاں کا تخلص ہے۔ آپ فروری سنہ ۵۷ء میں میرزا صاحب کے شاگرد ہوئے تھے۔ پہلے "یوسف" تخلص فرماتے تھے۔ میرزا صاحب کے مشورے پر "ناظم" لکھنے لگے۔

چونکہ میرزا صاحب دہلی میں رہتے تھے، اس لیے بذریعۂ مراسلت اصلاح عمل میں آتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ کئی کئی غزلیں ایک ساتھ بھیجی جاتیں۔ کبھی صرف ایک غزل ہی روانا ہوتی تھی۔ یہ غزلیں سرکار کے مسودے سے خوشنویس صاف کرتے تھے۔ جب میرزا صاحب کے پاس سے اصلاح ہو کر مسودے واپس آتے، سرکار کے ملاحظے کے بعد انھیں دوبارہ خوشنویس صاف کرتے تھے۔ ان اصلاحی مسودوں میں سے چند دستیاب ہو گئے ہیں۔ ان میں اچھے شعروں پر صاد بھی کیے گئے ہیں۔

ان شعروں پر تین صاد کیے ہیں:

حیلۂ پیروئ شرع کہاں سے سیکھا؟ — قبرِ عاشق کا نشاں خوب بتایا تو نے
کی بھلائی بھی، تو کس نخوت و پندار کیساتھ: — بختِ خوابیدہ کو ٹھوکر سے جگایا تو نے

خاطر تو جمع ہے کہ نہیں بعدِ حشر موت — ناظم، گذر ہی جایئے گا روزِ شمار بھی
مارا ہے اس طرح کہ عجب کیا ہے، گر نہ — محشر میں زندہ ہوتے کا میرے یقیں تجھے

ان شعروں پر دو صاد کیے ہیں:

چاہیے، تجھ سے رہیں بندہ و آزاد ملول — چاہیے، تجھ سے کریں کافر و دیندار لحاظ
نہ تجھے حشر کا، اے فتنۂ ایام، خیال — نہ تجھے خلق کا، اے شوخِ ستمگار لحاظ

ان بیتوں پر ایک ایک صاد ہے:

دیکھنا شوخی کہ میرا پوچھتے پھرتے ہیں گھر — سُن لیا ہے یہ کہ اُس کو کچھ نہیں گھر سے غرض

بات کی پچ ہے، جو ناصح سے کیا کرتا ہوں بحث ۔۔۔ ورنہ دل دینے سے ہوں میں خود پشیماں آجکل

آستیں بھی نچوڑ ڈالیں گے ۔۔۔ اشک کے پونچھنے سے فرصت ہو

غلط سہی اثرِ آہ و نالہ، پر ناظم ۔۔۔ رہے نہ دل میں ہوس، آؤ یہ بھی کر دیکھو

طریقِ عشق میں ہرگز رہا نہ میں بیکار ۔۔۔ جو گر پڑا، تو قدم میں نے پاسباں کیلئے

عبث ہے خوفِ شکایت، بس آگے بڑھئے ۔۔۔ رہے ہیں یادِ ستمہائے بیشمار کسے؟

نواب فردوس مکاں کا دیوان دو بار طبع ہو چکا ہے۔ پہلی بار سنہ ۱۲۷۶ھ میں خود انھیں نے چھپوایا تھا۔ یہ میرزا صاحب کے اصلاحی کلام پر مشتمل ہے۔ دوبارہ اُن کے صاحبزادے نواب حیدر علی خاں بہادر نے سنہ ۱۲۸۶ھ میں شائع کیا۔ اس میں وہ غزلیں بھی شامل کر دی گئی ہیں، جن میں اسیر لکھنوی سے مشورۂ سخن کیا گیا تھا۔[1]

بیتاب

نواب فردوس مکاں کے حقیقی چچازاد بھائی، اور نواب خلد آشیاں کے حقیقی ماموں تھے۔ پہلے مومن خاں مرحوم سے تلمذ رہا۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں میرزا صاحب کے شاگرد ہوئے، یہ مومن خاں کے رنگ کے اچھے کہنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ دیوان چھپ چکا تھا، مگر اب نایاب ہے۔ میرزا صاحب نے ان کے اشعار پر بھی حسبِ عادت ایک سے تین تک صاد کیے ہیں۔

اس شعر پر تین صاد ہیں:

لکھ دیا لکھتے تو، لیکن پھر جو کچھ رحم آگیا ۔۔۔ رو دیا اللہ نے میرا مقدر دیکھ کر

اور حاشیے پر لکھا ہے: آپ سے پہلے میری سرنوشت پر بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ غالب

ان شعروں پر دو دو صاد کیے ہیں:

کیا ہوئی جبینِ جبیں؟ ہنستے ہو کیسے نعش پر؟ ۔۔۔ زندگی میں یوں کبھی صورت نہ دکھلائی ہمیں

غیر بھی کہہ نہیں سکتا ہے کہ بیتاب ہوں میں ۔۔۔ نام سے میرے ہوئی ہے اُنھیں نفرت کیسی!

ان اشعار پر ایک ایک صاد ہے:

کیا پشیماں ہوئے وہ مار کے ٹھوکر افسوس ۔۔۔ سنگِ رہ سمجھے تھے جس کو وہ مرا سر نکلا

(۱) دیوانِ اول کے چند نسخے کتابخانۂ رامپور میں موجود ہیں، اور اہلِ ذوق کے ہاتھ فروخت کیے جاتے ہیں۔

ضد تو دیکھو کہ نہ کی غیر کی جانبداری بولنا یوں بھی اُنھیں ہم سے گوارا نہ ہوا
کوئی یوں نیم بسمل کو تڑپتا چھوڑ جاتا ہے یہ بیرحمی تو دیکھو، کس جگہ وہ رحم کھاتا ہے

نواب خلد آشیاں

نواب خلد آشیاں کو فارسی نثر میں میرزا صاحب سے تلمذ ہے۔ اگست سنہ ۶۶ء میں یہ رشتہ قائم ہوا مگر بعض وجوہ سے استوار نہ رہ سکا۔ نواب خلد آشیاں شاعر بھی تھے، اور نواب تخلص کرتے تھے۔ اردو میں امیر مینائی مرحوم سے اصلاح لی تھی، اور فارسی میں مورخ الدولہ سپہر کاشانی کے شاگرد ہیں۔

آپ نے اردو اور فارسی دواوین اپنی حیات ہی میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع فرما دیے تھے (۱) بمقتضائے مقام امیر مینائی مرحوم کے منتخب شعروں میں سے چند لکھے جاتے ہیں:

میں تو مرتا ہوں اپنی ہمت پر - جان دے کر بھی انفعال ہوا
کس خرابی سے دل کو تھامتا ہے ناز سے اب نہ مسکرائیں آپ!
کون کہتا ہے کہ نالوں میں نہیں تاثیر کچھ جو کرتے ہیں وہ ہم پر، اک اثر یہ بھی تو ہے

منشی

منشی سلیچند دارالانشا کے افسر تھے۔ شعر گوئی کا بھی شوق تھا، اور منشی تخلص کرتے تھے۔ نواب فردوس مکاں کے غسل صحت کی تاریخ کا ایک شعر لکھ کر میرزا صاحب کے پاس بغرض اصلاح بھیجا تھا۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ میرزا صاحب کے شاگرد تھے۔ کلام دستیاب نہ ہو سکا۔

شوخی

نادر شاہ خاں نام، اور شوخی تخلص تھا۔ والد کا نام محمد ضامن خاں رسالدار اور وطن رامپور تھا۔ شوخی کی پیدائش دلی کی ہے۔ اوائل شباب میں وہیں ملازمت بھی کی۔ سنہ ۱۸۶۰ء میں میرزا صاحب رامپور تشریف لائے، تو انھوں نے اپنا کلام پیش کیا۔ میرزا صاحب نے انکار کرتے ہوئے فرمایا: "تم جانتے ہو، میں نواب صاحب کا بلایا ہوا حاضر ہوا ہوں۔ انھوں نے اصلاح شعر کی خدمت میرے سپرد کی ہے۔ بغیر اُن کی حکم و اجازت کے یہاں اور کسی کے کلام پر اصلاح نہیں دے سکتا"۔ شوخی اس بات سے بہت مایوس ہوئے، مگر اتفاق کہ میرزا صاحب کے پاس شراب

(۱) یہ دیوان بھی اہل ادب کے ہاتھ فروخت کیے جاتے ہیں۔

ختم ہوگئی۔ نجی ملازموں میں سے کوئی اس کا اہل نہ تھا کہ مراد آباد سے جاکر شراب لادے۔ شوخی آئے، تو اُن سے میرزا صاحب نے سارا حال کہا۔ وہ فوراً اس خدمت کے بجالانے کو تیار ہوگئے۔ میرزا صاحب نے شراب کا نام بتایا، اور خالی بوتل دکھائی اور پھر ایک بوتل لانے کا حکم دیا۔ شوخی نے گھر آکر باپ سے منتیں کر کے روپیہ لیا، اور ایک کی جگہ ۵ بوتلیں خرید کر لادیں۔ میرزا صاحب بہت خوش ہوئے، اور قیمت کے لینے پر اصرار کیا، مگر شوخی نے ایک نہ مانی۔

دوسرے دن شوخی حاضر ہوئے، تو میرزا صاحب نے فرمایا: "وہ تمہاری غزل کہاں ہے، جو اُس دن لائے تھے؟" شوخی نے فوراً جیب سے نکال کر غزل پیش کر دی۔ میرزا صاحب نے اُسے دیکھ کر جابجا اصلاح دی۔ اصلاح دیتے جاتے تھے، اور ساتھ ساتھ ہدایات و افادات کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

اس کے بعد شوخی دہلی جاکر کئی ماہ تک میرزا صاحب کی خدمت میں رہے[1]

وسطِ عمر میں شوخی بنارس چلے گئے، اور نائب ناظر عدالت کلکٹری اور پنشکاری کی خدمات انجام دینے کے ساتھ میرزا صاحب سے مشورۂ سخن کرتے رہے[2]

مولانا ابوالکلام آزاد نے اُن کے پاس ایک قطعہ دیکھا تھا، جس پر میرزا کے قلم کی اصلاحیں تھیں۔

نمونۂ کلام یہ ہے:

ہوں کسی حالت میں، پر غصہ ہے اس دلگیر پر — خود بخود دل آگیا بینائی تصویر پر

ہر ہر سخن پہ جان نہ دینے کا ہے گلہ — اک بات آگئی ہے بتِ خود نما کے ہاتھ

(۱) غالب: ۱۴۴، طبع ثانی

(۲) نخلستان: ۵، ۶۶

لوازماتِ امارت

شاگرد پیشہ

ایک عریضے میں میرزا صاحب نے اپنے ملازموں کا بھی اجمالی ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"حضور کے علیہ پر میرا اور شاگرد پیشہ کا اور حسین علی کا گزارا ہے۔ عالم الغیب جانتا ہے جیسے گزرتی ہے"(۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب غربت میں بھی لوازماتِ امارت کے پابند تھے۔ ان خدمتگاروں میں سے بعض کا تذکرہ، میرزا صاحب کے دوسرے سفرِ رامپور کے ضمن میں آئیگا۔

مختار کار

میرزا صاحب نے روساکی طرح مالی اور دیگر دفتری کاروبار کے انصرام کیلیے مختار کار بھی رکھ چھوڑا تھا۔ یہ قوم کا بنیا اور ساہوکاری پیشہ تھا۔ بسا اوقات اسی سے میرزا صاحب قرض بھی لیا کرتے، اور اسی کے ہاتھ سرکارِ رامپور کی فرستادہ ہنڈوی فروخت کرڈالتے تھے۔

۱۳ اگست سنہ ۱۸۶۶ء کے عریضے میں میرزا صاحب نے پہلی بار اس کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"آج آخر روز توقیع دقیع مع جولائی کی تنخواہ کی ہنڈوی کے پہنچا۔ ہنڈوی مختار کار کو دی اور یہ عرضی لکھنے بیٹھا"(۲)

بعد ازاں ۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۸ء کو منشی سیلچند کے نام کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اگلے مہینے یعنی اگست سنہ ۱۸۶۸ کی تنخواہ کی ہنڈوی جو تم نے بھیجی تھی اوسکا روپیہ ابتک نہیں پٹا۔ میں توحیں دن ہنڈوی آتی ہے اوسی دن یا دوسرے دن اپنے مختار کار کے ہات کو وہ بھی مہاجن ہے، بیچ ڈالتا ہوں۔ مگر اوس مختار کار کو جس کے ہاں ہنڈوی آئی ہے، اوس نے روپیہ ابتک نہیں دیا"(۳)

شاگرد پیشہ کی تنخواہ

میرزا صاحب نے نومبر سنہ ۱۸۶۷ اور نومبر سنہ ۱۸۶۸ء میں نواب خلد آشیاں کو اپنے ماہوار مصارف کی روداد لکھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ہر مہینے ۶۳ روپے نوکروں کی تنخواہ کے ادا کرنا پڑتے تھے(۴)

(۱) مکاتیب: ۵۵ (۲) ایضاً: ۵۶ (۳) ایضاً: ۱۱۱ (۴) ایضاً: ۷۷ و ۸۳

انگریزی تعلقات

دیرینہ نمکخوار

حکومتِ انگلشیہ سے میرزا صاحب کے تعلق کا آغاز، اُن کے چچا نصراللہ بیگ خاں بہادر کے توسط سے ہوتا ہے۔ نصراللہ بیگ خاں بہادر انگریزی فوج میں رسالدار، اور پرگنہ "سونک سونسا" کے جاگیردار تھے۔ میرزا صاحب اپنے والد کے انتقال کے بعد چچا کی سرپرستی میں پرورش پا رہے تھے کہ سنہ ۱۸۰۶ء میں نصراللہ بیگ خاں بہادر کا انتقال ہوگیا۔ لارڈ لیک بہادر نے دیرینہ خدمات کا لحاظ کرکے، جاگیر کے عوض اُن کے متعلقین کی پنشن مقرر کرادی، اور اس طرح میرزا صاحب انگریزوں کے وظیفہ خوار بن گئے۔ یہ پنشن نصراللہ بیگ خاں بہادر کے نسبتی بھائی نواب احمد بخش خاں بہادر، والیٔ فیروز پور جھرکہ کے خزانے سے ملتی تھی۔ لیکن اُن کے جانشین، نواب شمس الدین احمد خاں بہادر کو ولیم فریزر، ریزیڈنٹِ دہلی، کے قتل کرانے کے الزام میں پھانسی دیدی گئی، اور فیروز پور کی جاگیر منبط ہوگئی، تو میرزا صاحب اور دیگر ورثائے نصراللہ بیگ خاں کی پنشن خزانۂ کلکٹری، دہلی، سے تقسیم ہونے لگی اور اپریل سنہ ۱۸۵۷ء تک میرزا صاحب کو ملتی رہی۔

میرزا صاحب اپنی اس "دیرینہ نمکخواری" کے متعلق نواب فردوس مکاں کو تحریر کرتے ہیں:

"حالی رای جہاں آرای باد، کہ دیرینہ نمکخوار سرکار انگریزم، واز سرآغاز سال یکہزار وہشت صد وشش، کہ در انگاہ شمار سنین عمرمن ازدہ انگشتہ بود، بعوض جاگیر عم حقیقی، نسبی خود نصراللہ بیگ خاں بہادر، کہ با جمعیت رسالۂ چہار صد سوار بمعیت جرنیل لارڈ لیک بہادر در فتح ہندوستان کوششہای نمایان کردہ، و پرگنۂ سونک سونسا بفیدحین حیات جاگیر یافتہ، وہم دران عہد بمرگ ناگاہ از جہان رفتہ بود، بفرمان جرنیل لارڈ لیک بہادر و منظوری گورمنٹ، مشت زری شامل جاگیر عم سبتی من نواب

احمد بخش خاں بہادر، در وجہ معاش من منجملۂ زر استمراری سرکاری، کہ بذمۂ نواب احمد بخش خاں بہر دوام واجب الادا بود، قرار یافت۔ چون جانشین احمد بخش خاں کیفر کردار یافت و جاگیر بسرکار باز یافت شد، رسیدن آن وجہ مقرری از خزانۂ کلکٹری دہلی صورت پذیرفت، چنانکہ تا انجام اپریل سنہ ۱۸۵۷ از کلکٹری دہلی یافتہ ام۔"(۱)

دربار اور خلعت

پنشن خوار کی حیثیت سے میرزا صاحب اہم شخصیت کے مالک نہ تھے۔ انھیں ساڑھے سات سو روپے سالانہ یا ساڑھے باسٹھ روپے ماہوار کا معمولی وظیفہ ملتا تھا۔ نواب خلد آشیاں کو ۱۸ ستمبر سنہ ۶۷ء کے عریضے میں لکھا ہے:

"باسٹھ روپے آٹھ آنے دینا انگریزی سرکار سے بعوض جاگیر پاتا ہوں۔"(۲)

دراصل اُن کا حقیقی اعزاز یہ تھا کہ گورنر جنرل کے دربار میں داہنی صف میں دسویں کرسی اور سات پارچے کا خلعت مع جیغہ، سرپیچ و مالای مروارید پاتے تھے۔ نواب فردوس مکاں کو یہ تفصیل لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میں انگریزی سرکار میں علاقہ ریاست و دودمانی کا رکھتا ہوں۔ معاش اگرچہ قلیل ہے مگر عزت زیادہ پاتا ہوں۔ گورمنٹ کے دربار میں داہنی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالای مروارید خلعت مقرر ہے۔"(۳)

غدر اور قصور خدمت

سرکار انگریزی سے میرزا صاحب کے تعلقات، مئی سنہ ۵۷ء تک خوشگوار تھے۔ جب دہلی اور دیگر اطراف ملک میں انگریزوں کے خلاف فوج اور رعایا نے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا، اور بہادر شاہ ظفر مطلق العنان حکمراں قرار دیے گئے، تو میرزا صاحب کے لیے بجز گوشہ گیری کوئی چارۂ کار نہ رہا؛ کیونکہ اگر اپنی محسن سرکار کا ساتھ دیتے، تو باغی گھر بار لوٹ لیجاتے، اور اہل قلعہ کی کھلم کھلا حمایت کرتے، تو بصورت ناکامی، انگریزوں کی طرف سے بدسلوکی کا خوف تھا۔ نصیب کی تائید سے میرزا صاحب کی تدبیر کارگر ہوئی،

(۱) مکاتیب: ۴ (۲) ایضاً: ۳۷ (۳) ایضاً: ۱۵

اور وہ شہرِ دہلی کے اندر باغیوں کے ساتھ "بباطن بیگانہ و بظاہر آشنا" ایام گزاری کرتے رہے تا آنکہ انگریزی فوج نے دوبارہ شہر فتح کیا، اور اُن اشخاص کی دار و گیر شروع ہوئی جنھوں نے باغیوں کی جنبہ داری کی تھی۔ اہلِ شہر نے انگریزی سپاہ کے داخلِ شہر ہوتے ہی بھاگنا شروع کر دیا، لیکن میرزا صاحب اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ شہر میں تحقیقات شروع ہوئی۔ مخبروں نے اطلاعیں بہم پہنچا کر باغیوں کی تلاش میں گورنمنٹ کی مدد کی، مگر باوجودِ تعلقِ قلعہ، میرزا صاحب کے دامنِ وفاداری پر دھبہ نہ آیا۔ حکام کو میرزا صاحب کے قیامِ دہلی کی اطلاع ہوئی، مگر اُنھوں نے اس سے دلچسپی نہ لی۔ خود میرزا صاحب نے کسی حاکم سے اس لیے ملنا مناسب نہ جانا کہ موجودہ اصحاب میں اُن کا کوئی شناسا نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصے کے لیے اُن کے تعلقاتِ انگریزی منقطع ہو گئے۔ دورانِ بغاوت میں، نواب فردوس مکاں نے انگریزوں کی بڑی امداد کی تھی۔ میرزا صاحب اس حقیقت سے واقف تھے۔ جب غدر کی آگ بجھ گئی، تو اُنھوں نے ازراہِ مصلحت، ۱۴ جنوری سنہ ۱۸۵۸ء کو اپنی ساری روداد نواب صاحب کو لکھی، اور آخر میں عرض کیا:

"راستی اینکہ درین فتنہ و آشوب خدمتی بجا نیاوردہ ام۔ لیکن مقام منکر است کہ بہ تقدیم نرسیدن خدمت از راہ بیدستگاہیست و ذریعۂ اخلاص و خلوص ہماں بیگناہیست۔" (۱)

بعد ازاں، نومبر سنہ ۵۸ء کو تحریر کیا ہے:

"خدا کا شکر یہ کہ باوجودِ تعلقِ قلعہ کسی طرح کے جرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں۔" (۲)

اسی سلسلے میں، نومبر سنہ ۵۹ء کو لکھتے ہیں:

"اب تک میں اپنے کو یہی نہیں سمجھا کہ بیگناہ ہوں یا گناہگار، مقبول ہوں یا مردود۔ مانا کہ کوئی خیر خواہی نہیں کی جو نئے انعام کا مستحق ہوں۔ لیکن کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی جو دستورِ قدیم کو برہم مارے ہے۔" (۳)

سمدوی، دربارِ وضعت و شرف

میرزا صاحب نے ایامِ غدر میں جو رویہ اختیار کیا تھا، اُس کی بنا پر حکومتِ انگلشیہ کی

(۱) مکاتیب: ۹ (۲) ایضاً: ۱۱ (۳) ایضاً: ۱۵

نظر میں مجرم ثابت نہوے کہ سزا دیجاتی؛ لیکن کسی خاص خدمت کے انجام نہ دینے کے سبب سے اس کے بھی مستحق خیال نہ کیے گئے کہ پنشن، دربار اور خلعت بحال دکھا جائے چنانچہ یہ تینوں اعزاز بند ہوگئے۔ نواب فردوس مکاں کو ۷ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء کے عریضے میں دربار و خلعت کے ذکر کے بعد لکھا ہے:

"لارڈ ہارڈنگ صاحب کے عہد تک پایا۔ لارڈ دلہوسی یہاں آئے نہیں۔ اب یہ نواب علی القاب آتے ہیں۔ زمانے کا رنگ اور۔ کوئی حاکم، کوئی سکرتر میرا آشنا نہیں بڑے میرے مربی قدردان جناب اڈمنسٹن صاحب۔ وہ بھی چیف سکرتر نہ رہے لیفٹنٹ گورنر ہوگئے۔ وہ سکرتر رہتے تو مجھے کچھ غم نہ تھا۔" (۱)

پنشن کی مسدودی کے بارے میں ۱۴ جنوری سنہ ۵۸ء کے محولۂ بالا عریضے میں لکھتے ہیں:

"چنانکہ تا انجام اپریل سنہ ۱۸۵۷ از کلکٹری دہلی یافتہ ام۔ واز ہی خود آشکارا ست کہ حال چیست۔" (۲)

اس کے بعد ۷ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کو تحریر کرتے ہیں:

"جناب عالی! طرفہ معاملہ ہے۔ خدا کا شکر ہے، اور اپنی قسمت کا گلہ ہے۔ خدا کا شکر یہ کہ باوجود تعلق قلعہ کسی طرح کے جرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں۔ قسمت کا گلہ یہ کہ عطای پنشن قدیم کا حکام کو خیال بھی نہیں۔ یہ تو مبر سنہ ۱۸۵۸ اُنیواں مہینا ہے گویا بن کھائے جیتا ہے۔" (۳)

پنشن کی بحالی کی کوشش

مئی سنہ ۱۸۰۶ء سے اپریل سنہ ۵۷ء تک میرزا صاحب کو خاندانی وظیفہ ملتا رہا۔ مئی میں غدر ہوگیا اور چند ماہ تک اہلِ دہلی اور گورنمنٹ کے تعلقات منقطع رہے۔ فتح دہلی کے بعد، جنوری سنہ ۵۸ء تک میرزا صاحب نے اس لیے تجدید راہ و رسم کی سعی نہ کی کہ شناسا حاکموں میں سے اب کوئی نہ رہا تھا، اور نئے حکام سے ملاقات کی تقریب کوئی خدمت ہونی چاہیے تھی، جو از راہِ احتیاط اُنھوں نے انجام نہیں دی تھی۔ چنانچہ

(۱) مکاتیب: ۱۵ (۲) ایضاً: ۹ (۳) ایضاً: ۱۱

۱۴ جنوری سنہ ۵۸ء کے عریضے میں نواب فردوس مکاں کو لکھا ہے:

"و از سر آغاز سال ۱۸۰۶ ... بعوض جاگیر عم حقیقی نسبی خود ... مشت زری ... در وجہ معاش من قرار یافت چنانکہ تا انجام اپریل سنہ ۵۷، ۱۵ از کلکٹری دہلی یافتہ ام - و از منی خود آشکارا است کہ حال چیست. ... می بایست کہ خود سلسلہ جنبان گشتی و باحکام پیوستی - درین بارہ سخن آنست، کہ درین فرماندھان با ہیچ کس سابقہ معرفتی ندارم - و معہذا موقع و محل آن نمی نگرم کہ نامہ نویسم، و خواہش ملاقات بمیان آورم - راستی اینکہ درین فتنہ و آشوب خدمتی بجا نیاوردہ ام"(۱)

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴ جنوری اور ۲۵ مارچ سنہ ۵۸ء کے درمیان ہی میں بحالیٔ پنشن کی سلسلہ جنبانی شروع کر دی تھی - اس لیے کہ نواب فردوس مکاں کی بالواسطہ دعوت رامپور کے جواب میں، صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر کو ۲۵ مارچ سنہ ۵۸ء کو لکھتے ہیں:

"میں نے اپنے پنشن کے باب میں چیف کمشنر بہادر کو درخواست دی تھی - وہاں سے صاحب کمشنر شہر کے وہ درخواست حوالہ ہوئی - صاحب کمشنر دہلی نے صاحب کلکٹر شہر سے کیفیت طلب کی ہے - پس اگر وہ کیفیت پنشن کی ہے تو یہاں کی کلکٹری کا دفتر اگر نہیں رہا نہ رہے - ریونیو بورڈ کے دفتر اور لفٹنٹ گورنری آگرہ اور نواب گورنر جنرل کلکتہ کے دفتر، اس پنشن کی کیفیت سے خالی نہیں ہیں - اور اگر میری کیفیت مطلوب ہے، تو میرا بیجرم اور بری اور الگ ہونا فساد سے، از روی دفتر قلعہ و اظہار مخبرین ظاہر ہے - بہرحال صاحب کمشنر شہر کیفیت صاحب کلکٹر سے طلب کر کر چیف کمشنر کے ساتھ پنجاب کو گئے ہیں - دیکھیے، کب آویں، اور بعد ملاحظۂ کیفیت کیا حکم دیں"(۲)

مداحوں میں نام

اس عرصے میں میرزا صاحب نے بقولِ خود "مداحانِ حکومتِ انگلشیہ میں اپنا نام درج کرا کے وزرای ملکۂ دارا در بان کے دو سارٹیفکٹ" حاصل کر لیے تھے - اس کے باوجود نومبر

(۱) مکاتیب: ۸ و ۹ (۲) ایضاً: ۸۶

سنہ ۵۸ء تک پنشن جاری نہ ہوئی، اور جب شہر میں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ جنوری سنہ ۱۸۵۹ء میں پنشداروں کو روپیہ ملے گا، تو، نومبر سنہ ۵۸ء کو میرزا صاحب نے، ازراہِ شکایت، نواب فردوس مکاں کو لکھا:

"قسمت کا گلہ یہ کہ عطای پنشن قدیم کا حکام کو خیال بھی نہیں۔ یہ نومبر سنہ ۱۸۵۸ اکیسواں مہینا ہے۔ گویا بن کھائے جیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جنوری شروع سال میں پنشداروں کو روپیہ ملیگا دیکھیے کیا نیا گل کھلے گا۔ پہلی نومبر کو یہاں اشتہار عام ہوگیا ہے، کہ اب قلمرو ہندوستان میں عمل ملکۂ معظمۂ عالی مقام ہوگیا ہے۔ میں پہلے سے مداحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں۔ اور وزرای ملکۂ دادا دریان کے دو سارٹی فکٹ پا چکا ہوں۔" (۱)

اس کے جواب میں نواب صاحب نے لکھا کہ آپ رامپور تشریف لے آئیں۔ میرزا صاحب نے ۳ دسمبر کو جواباً تحریر کیا:

"میرے حاضر ہونے کو جو ارشاد ہوتا ہے، میں وہاں نہ آؤں گا، تو اور کہاں جاؤں گا۔ پنشن کے وصول کا زمانہ قریب آیا ہے۔ اس کو ملتوی چھوڑ کر کیونکر چلا آؤں؟ سنا جاتا ہے، اور یقین بھی آتا ہے، کہ جنوری آغاز سال ۵۹ عیسوی میں یہ قصہ انجام پائے جس کو روپیہ ملنا ہے اوس کو روپیہ، جس کو جواب ملنا ہے اوس کو جواب ملجائے۔" (۲)

عرضی کی روداد

جنوری سنہ ۵۹ء پر دو مہینے اور گزر گئے، مگر ہنوز مقدمۂ پنشن فیصل نہ ہوا۔ سرکار نے ۱۳ اپریل کو پھر دعوتِ آمدِ رامپور دی، تو میرزا صاحب نے امیدِ وصولیابیٔ پنشن کا گیت گاتے ہوئے لکھا:

"مجموع پنشداروں کی مثل مرتب ہے، اور ہنوز صدر کو روانہ نہیں ہوئی۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر نے کلکتے سے میرے پنشن کے کاغذ طلب کیے، اور وہ کاغذ فہرست میں سے الگ ہوکر لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں ارسال ہوئے۔ وہاں سے کلکتہ کو بھیجے جائیں گے۔ پھر وہاں سے حکم منظوری پنجاب ہوتا ہوا یہاں آئے گا، اور یہاں مجھکو روپیہ مل جائے گا۔" (۳)

(۱) مکاتیب: ۱۱ (۲) ایضاً: ۱۲ (۳) ایضاً: ۱۳

راہ چارہ مسدود

جب مہینے پر مہینا گزرنے لگا، اور پنشن کا تصفیہ نہ ہوا، تو میرزا صاحب نے، نومبر سنہ ۵۹ء کو مجبوراً لکھا:

"ابتک میں اپنے آپ کو بھی نہیں سمجھا کہ بیگناہ ہوں یا گناہگار۔ مقبول ہوں یا مردود۔ نہ تو کوئی خیر خواہی نہیں کی، جو نئے انعام کا مستحق ہوں؛ لیکن کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی، جو دستور قدیم کو برہم مارے۔ بہرحال راہ چارہ مسدود اور دکھ موجود۔ عرفی خوب کہتا ہے:

مرا زمانہ بخناز دست بستہ و تیغ زند بفرقم و گوید کہ "ہاں، سری بخار"[1]

نواب فردوس مکاں کی سفارش

نواب فردوس مکاں اپنے استاد کی پریشانی سے کماحقہ واقف تھے۔ آپ نے از راہ نوازش اکثر انگریز حکام سے اس لیے میرزا صاحب کی تعریف کی کہ ان کے سابقہ مدارج عزت بحال ہو جائیں۔ اور جب میرزا صاحب کا یاسنامہ مورخہ ۷، نومبر سنہ ۵۹ء مطالعہ فرمایا، تو تسکین خاطر کے لیے لکھا:

"مشفقا، ہنگام ملاقات کے اکثر بعض صاحبان بہادر ذیشان سے تذکار محامد اوصاف ذاتی اور صفاتی آپ کا عمل میں آیا ہے۔ اللہ تعالے کے فضل اور قدر دانی سرکار دولتمدار سے یقین واثق ہے کہ جو مدارج شریف آپ کے قدیم سے ہیں، پنگاہ گورنمنٹ جلد سے جلد ادی مطابق ظہور میں آوے گا۔ کس واسطے کہ اہالی سرکار ابد قرار قدر دان و قدر شناس ہیں"[2]

اقبال کی تائید

سرکار کی سفارش بار آور ہوئی، اور پنشداروں کا نقشا، بعد صدور حکم، صدر سے واپس آگیا۔ میرزا صاحب نے ۱۲ اپریل سنہ ۶۰ء کو ان الفاظ میں سرکار کو اطلاع دی:

"عالم دو ہیں، ایک عالم شہادت، ایک عالم غیب۔ جس طرح عالم شہادت میں آپ میری دستگیری کر رہے ہیں، عالم غیب میں آپ کا اقبال مجکو مدد پہنچا رہا ہے تفصیل اس

(۱) مکاتیب: ۱۹۱ (۲) ایضاً: ۱۹۷ ح ۲

اجمال کی یہ ہے کہ وہ نقشا پسندارروں کا، جو یہاں سے صدر کو گیا تھا، وہ اب صدر سے بعد صدور حکم آگیا۔ حکم بہ نسبت ہر واحد کے مختلف ہے۔ تقلیل بہت ہے، سو روپیہ مہینے والے کو پچھتر بھی ہیں اور پچیس بھی ہیں اور دس بھی ہیں۔ اب فرمائیے، میرے واسطے کیا احتمال گزرتا ہے۔ یاس کلی ہے۔ لیکن واقع یہ ہوا ہے کہ سب سے پہلے میرا نام اور پورے پنشن کی واگزاشت کا حکم۔ طرفہ یہ کہ میرے نام کے ساتھ ایک انگریزی تحریر ہے، کہ جس کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کا حکم منظوری اس تحریر پر متفرع ہے۔ حکام کے علم میں اور وکلا اور اہل شہر میں یہ مشہور ہے کہ وہ تحریر ولایت سے آئی ہے۔ بہرحال وہ امر ہنوز مبہم ہیں۔ ایک اس انگریزی تحریر کا حال اور دوسرے میرے بھائی کے پنشن کی حقیقت۔ سو یہ دونوں امر چند روز میں معلوم ہو جائیں گے، اور جو معلوم ہوگا وہ عرض کیا جائیگا۔" (۱)

خدا ساز بات

میرزا صاحب نے ۴ مئی سنہ ۶۰ء کو زر پنشن وصول کر لیا۔ اہل دہلی نے اس اجرا کو نواب فردوس مکاں کی سعی و کوشش کا نتیجہ قرار دیا۔ میرزا صاحب ان مراتب سے بخوبی آگاہ تھے، اور جنوری سنہ ۶۰ء میں، رامپور آتے وقت، بعض احباب کو یہ لکھ بھی چکے تھے کہ اس سفر کا مقصد یہ ہے کہ نواب صاحب کے ذریعے سے گورنمنٹ سے میری صفائی ہو جائے۔ لیکن اس کے باوجود، جب یوسف مرزا صاحب نے لکھا کہ خواجہ جان کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ والیٔ رامپور کی کوشش سے آپ کی پنشن جاری ہو گئی، تو اس کے جواب میں میرزا صاحب نے اجرائی پنشن کو مسبب الاسباب کی طرف منسوب کرتے ہوئے، حقیقتِ حال کے اظہار سے اعراض کیا۔ فرماتے ہیں:

"خواجہ جان جھوٹ بولتا ہے۔ والیٔ رامپور کو اس پنشن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں۔ یہ کام خدا ساز ہے، لعلی بن ابیطالب علیہ السلام۔" (۲)

(۱) مکاتیب: ۱۷ (۲) اردوئے معلی: ۳۳۱

بحالیٔ دربار وخلعت کی کوشش

اوپر عرض کیا جا چکا ہے، کہ میرزا صاحب گورنر جنرل کے دربار میں خلعتِ ہفت پارچہ اور سہ رقومِ جواہر لارڈ ہارڈنگ صاحب کے وقت تک حاصل کرتے رہے۔ لارڈ ڈلہوسی نے دلی آکر دربار نہیں کیا؛ اس لیے سنہ ۱۸۴۸ء سے غدر سنہ ۵۷ء تک میرزا صاحب کو شرکتِ دربار اور حصولِ خلعت کا کوئی موقع میسر نہ آیا۔ غدر کے بعد، بعذرِ اشتباہ، پنشن بند ہوئی، تو دربار وخلعت کی امید بھی جاتی رہی۔ لیکن اجرائے پنشن کے بعد میرزا صاحب نے بحالیٔ دربار کی درخواست کی، جس پر عرصے تک تحقیقات ہوتی رہی۔

گورنر کا دربار اور خلعت

سہ شنبہ ۳ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء کو(۱) سر رابرٹ منٹگمری، لفٹنٹ گورنر پنجاب، نے دلی میں دربار کیا۔ میرزا صاحب کو بھی شرکت کا حکم ملا۔ یہ اُس روز نہ گئے۔ دوسرے دن گورنر نے یاد کیا، تو خیامِ گورنری میں حاضر ہوئے۔ صاحب نے خلعت دیا اور فرمایا کہ گورنر جنرل بہادر کا دربار انبالے میں ہونے والا ہے۔ آپ وہاں بھی تشریف لے جائیے، اور دربار میں شریک ہو کر خلعتِ معمولی حاصل کیجیے۔ میرزا صاحب نے غالباً ۴ مارچ کو سرکار سے زادِ راہ کے لیے عبلے کی درخواست کی۔ ۱۱ کو سرکار نے ۲۰۰ روپے بھیجے۔ ۱۶ مارچ کو میرزا صاحب روپیہ کی رسید کے ساتھ نواب فردوس مکاں کو لکھتے ہیں:

"اب سنیے اپنے دعاگو کی داستان۔ منگل ۳ مارچ کو جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے خلعت عطا کیا، اور فرمایا کہ "ہم تمھیں مژدہ دیتے ہیں کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے اپنے دفتر میں تمہارے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم لکھوا دیا۔" میں نے عرض کیا کہ "میں انبالے جاؤں؟" فرمایا، "البتہ انبالے جانا ہوگا۔"

(۱) مولانا مہر نے غالب، صفحہ ۲۳۹ اور ۲۴۰ پر لکھا ہے کہ مارچ سنہ ۱۸۶۲ء میں دربار وخلعت بحال ہوئے۔ یہ رائے درست نہیں ہے۔ دراصل یہ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء کا واقعہ ہے۔ کیونکہ نواب فردوس مکاں اور میرزا صاحب کی مراسلت کا ہر خط موجود ہے۔ اور جن خطوں میں زیرِ بحث مسئلہ کا ذکر آیا ہے، وہ سنہ ۱۸۶۲ء کے نہیں، بلکہ سنہ ۱۸۶۳ء کے تحریر شدہ ہیں۔ غالباً اردوئے معلی کے مطبوعہ نسخہ کی غلطی طباعت سے مہر صاحب کو یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ نیز اردوئے معلی ص ۱۱۲ پر میرزا تفتہ کے نام کے مکتوب کی تاریخ ۴ فروری بھی غلط ہے اس کو ۴ مارچ ہونا چاہیے۔

بعد جناب نواب صاحب کے جانے کے، شہر میں شہرت ہوئی کہ دلی کے لوگ انبالے جانے سے ممنوع ہیں۔ گھبرایا اور صاحب کمشنر کے پاس گیا۔ آپ خط اپنا دے آیا زبانی پرسش کا جواب زبانی پایا۔ پھر خط کے جواب میں خط محررہ، مارچ آیا۔ چنانچہ لفافہ بلحاظ گرانی وزن رہنے دیتا ہوں، اور خط بعینہٖ حضرت کو بھیجتا ہوں۔ کل سے ایک اور خبر اوڑی ہے کہ تعصب اعدا لارڈ صاحب کی طبیعت تاساز ہوگئی ہے۔ انبالے میں دربار نہ کریں گے، اور شملہ کو چلے جائیں گے۔ اب میں دو وجہ سے بین الغرور والسکون متردد ہوں۔ پہلی وجہ خاص اور دوسری وجہ عام۔ دو سو میں سے سو لیکر ساز و سامان درست کیا ہے، اور سو مہاجن کے ہاں ڈاک اور خرچ راہ کے واسطے رہنے دیئے ہیں۔ تار برقی میں جناب نواب صاحب سے حکم منگواؤں گا۔ جو حکم آئے گا، آپ سے عرض کر کے اوس کی تعمیل کروں گا۔" (۱)

گورنر جنرل کے دربار میں نہ جا سکے

نواب فردوس مکاں نے میرزا صاحب کے عریضۂ مورخہ ۱۹ مارچ کے جواب میں کمشنر صاحب کے خط کا جس قدر مضمون دُہرایا ہے(۲) اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب نے انبالے میں گورنر جنرل سے ملاقات نہ ہونے کا امکان ظاہر کیا تھا۔ اتفاقاً اُسی زمانہ میں میرزا صاحب کے بھتیاں بھی نکل آئیں؛ اس لیے مجبوراً خود انبالے جانے کے بجائے اپنا قصیدہ، جو معمولی نذر تھی، بسبیل ڈاک بھیجکر تسکین کر لی، اور ۴ اگست سنہ ۱۸۶۳ء کو نواب فردوس مکاں کو تحریر کیا:

"جب انبالے میرا جانا نہ ہوا، تو میں نے قصیدۂ مدح، جو دربار کی نذر کے واسطے لکھا تھا، بطریق ڈاک جناب چیف سکرٹر بہادر کو اس مراد سے بھیجا کہ آپ اس کو جناب نواب معلی القاب کی نظر سے گزرانیں۔ اور یہ دستور قدیم تھا کہ جب میں قصیدۂ مدحیہ بھیجتا تو صاحب سکرٹر بہادر کا خط بواسطۂ حکام ماتحت مجھکو آجاتا۔ اب جو میں نے موافق معمول قصیدہ بھیجا، یقین ہے کہ مارچ یا اپریل کے مہینے میں وہ لفافہ یہاں

(۱) مکاتیب: ۲۴ (۲) ایضاً: ۲۵، ج ۱

منشکر کو گیا۔ صدا نے برنخاست۔ نا امید ہو کر بیٹھ رہا۔ بلکہ یہ خیال گزرا کہ جب رسم تحریر خطوط نہ رہی، تو دربار و خلعت کہاں؟ ناگاہ، کل شام کو صاحب سکرٹر بہادر کا خط ڈاک میں آیا۔ وہی افغانی کاغذ، وہی القاب۔ جی چاہتا تھا کہ اصل خط مع سرنامہ بھیجدوں، تاکہ حضور ملاحظہ فرمائیں۔ مگر برسات کا اندیشہ مانع آیا۔ نقل سرنامہ اور خط کی بھیجتا ہوں۔" (۱)

اس کے بعد زندگی بھر میرزا صاحب کو گورنر جنرل کے دربار کی شرکت کا موقع نہ ملا اور یہ آرزو بھی دوسری بہت سی آرزوؤں کے ساتھ پیوندِ خاک ہو گئی۔

گورنر کا دوسرا دربار اور خلعت

سر ڈانل میکلوڈ، گورنر پنجاب، نے ۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو دلی میں دربار کیا۔ میرزا صاحب اس میں شریک اور "خلعتِ ہفت پارچہ و سہ رقم جواہر" سے مشرف ہوئے۔ رامپور اس زمانے میں نواب خلد آشیاں کے زیرِ حکومت تھا۔ دربار کے دوسرے دن میرزا صاحب نے سرکار کو لکھا:

"حضرت کی توجہ بالمنی، جو ہمیشہ میری مصلح حال اور افزائش عزو وقار کی کفیل ہے، بعد ادائی شکر الٰہی، اوس کا سپاس بجا لاتا ہوں۔ پیش از ندہ۔ گورنمنٹ کے دربار میں، پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالای مروارید، تین رقمیں جواہر کی مجھکو ملی تھیں۔ بعد ندا گرچہ پنشن اور دربار بحال رہا، لیکن خلعت موقوف ہو گیا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کا کل ۱۲ پر چار بجے دربار تھا۔ حکم سب درباریوں کو پہنچ گیا تھا۔ میں نواب مہدیعلی خاں صاحب کو رخصت کر کے گھر آیا۔ دو گھنٹے کے بعد دربار میں گیا۔ خیال یہی کہ ملاقات ہو گی۔ ایک رباعی، کاغذ مذہب پر لکھی ہوئی، نذر کروں گا۔ کلمات عنایت سنکر چلا آؤں گا۔ نہ مجھے کچھ احتمال، نہ صاحب کمشنر بہادر شہر کو علم۔ بارے بروقت ملاقات، تعظیم معمولی اور مصافحہ کر کے لاڈلے صاحب نے کھڑے کھڑے جیغہ، سرپیچ میری ٹوپی پر باندھا، اور فرمایا کہ "یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا۔"

(۱) مکاتیب: ۲۵

مالای مروارید میر منشی نے گلے میں ڈالدی۔۔۔۔ میں اس عطیہ کو آپ کی بخشش معنوی سمجھتا ہوں"(۱)
یہ میرزا صاحب کا آخری دربار اور خلعت تھا۔

(۱) مکاتیب: ۶۴

تعلقاتِ قلعۂ معلی

تاریخ نویسی

دلی کے لال قلعے سے میرزا صاحب کے تعلقات اکبر شاہِ ثانی کے وقت سے تھے۔ اُن کا ایک فارسی قصیدہ اور دو ایک اردو قطعے ان کی مدح میں موجود ہیں۔ لیکن یہ تعلقات تقریبوں میں آمد و رفت اور قصیدہ خوانی تک محدود تھے۔ شاہِ ظفر کے عہد میں مولانا نصیر الدین عرف کالے میاں، مرشدِ شاہ، اور احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر کے توسط سے رشتۂ ملازمت بھی پیدا ہو گیا۔

جمعرات کے دن ۲۳ شعبان سنہ ۱۲۶۶ھ (۴ جولائی سنہ ۱۸۵۰ء) کو بادشاہ کے حضور میں باریابی حاصل ہوئی۔ خلعتِ شش پارچہ ملازمانِ درگاہ نے پہلے سے پہنا دیا تھا۔ بادشاہ نے دستِ خاص سے جیغہ اور سرپیچ سر پر باندھا، اور مالای مروارید گلے میں ڈالی اور نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ خطاب عطا کیا۔ خدمت یہ قرار پائی کہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر تاریخوں سے جن جن کر مستند واقعات میرزا صاحب کو دیتے رہیں، اور یہ اپنے طرزِ خاص میں اُن واقعات کو لکھیں۔ اس خدمت کے صلے میں ۵۰ روپے ماہوار تنخواہ مقرر کی گئی (۱)۔ میرزا صاحب اس کتاب کا صرف ایک حصہ مرتب کر سکے، جو مہرِ نیمروز کے نام سے چھپ چکا ہے۔

اصلاح اشعار

میرزا صاحب کے تعلقِ خدمت کو کچھ اوپر ۴ برس ہوئے تھے کہ ۲۴ صفر سنہ ۱۲۷۱ھ (۱۶ نومبر ۱۸۵۴ء) کو شیخ ابراہیم ذوق، استادِ شاہِ ظفر، کا انتقال ہو گیا۔ بادشاہ نے اصلاحِ اشعار کی خدمت بھی میرزا صاحب کے سپرد کر دی۔ میرزا صاحب نے ان دونوں خدمتوں کے متعلق نواب فردوس مکاں کو لکھا ہے:

(۱) مہرِ نیمروز: ۱۰، کلیات نثر فارسی: ۲۷۱، غالب: ۲۰۴، غالب نامہ: ۵۷، ذکرِ غالب: ۴۲۔ میرزا صاحب نے سہواً انگریزی تاریخ ۴ جون لکھ دی ہے۔ اردو حساب ۴ جولائی ہونا چاہیے۔

"پیوند تعلق با بہادر شاہ جز آن نبود کہ از ہفت ہشت سال تحریر تاریخ سلاطین تیموریہ دوازدہ سہ سال باصلاح اشعار شہریاری پرداختم" (۱)

(۱) مکاتیب: ۹ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب ۱۰، ۱۲ برس تک تاریخ نویسی اور دو تین برس تک اصلاح کی خدمت انجام دیتے رہے۔ لیکن واقعہ یہ نہیں ہے، بلکہ کل تعلق خدمت ۱۰ برس رہا ہے جن میں سے آخری دو ڈھائی سال اصلاح اشعار میں گزرے۔

تعلقاتِ رامپور

ریاستوں سے تعلق کی نوعیت

میرزا صاحب کو اپنی عالی نسبی پر ہمیشہ فخر رہا۔ وہ اُس زمانے میں بھی، جبکہ سر پر مصائب کے بادل منڈلا رہے تھے، اور چاروں طرف نفسی نفسی کا عالم تھا، اپنی نسبی انفرادیت کے گیت گاتے رہے، اور "زادشم وافراسیاب" کو نہ بھولے۔

لیکن سنہ ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں فیض الحسن خاں، کوتوالِ دہلی، کی ذاتی عداوت کی بدولت میرزا صاحب قمار بازی کے جرم میں گرفتار ہوئے، اور اُنھیں چھ مہینے کی بامشقت قید اور دو سو روپے جرمانے کی سزا ہوگئی (۱) اس واقعے کی جزئیات بیحد افسوسناک تھیں۔

(۱) میرزا صاحب کی قید کا پورا واقعہ یادگار غالب: ۲۹، غالب: ۱۸۳، غالب نامہ: ۵۲، اور ذکر غالب: ۴۰ میں ملاحظہ ہو۔ یہاں صرف یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ میرزا صاحب کو یہ حادثہ سنہ ۱۸۴۷ء میں پیش آیا تھا، جو انکے حساب ۱۲۶۳ھ کے مطابق ہے۔ لہٰذا خواجہ حالی مرحوم کا سنہ ۱۲۶۴ھ تحریر کرنا کسی طرح درست نہیں، اور نہ مولانا مہر کا یہ ارشاد صحیح ہے کہ "سنہ ۱۲۶۴ھ کی عید الفطر ۳۱ اگست سنہ ۱۸۴۷ء کو تھی اور عید اضحیٰ ۹ نومبر سنہ ۱۸۴۷ء کو ہوئی"۔ کیونکہ سنہ ۱۲۶۴ھ کی عید ۳۱ اگست سنہ ۱۸۴۸ء کو ہوئی تھی، اور سنہ ۱۸۴۷ء میں جو عید الفطر آئی، وہ اوّلاً تو سنہ ۱۲۶۳ھ کی تھی، اور ثانیاً ۱۲ ستمبر کے مطابق تھی۔

مہر صاحب کے بیان میں ایک قسامح اور بھی ہے۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ میرزا صاحب کو ۲۵ جون سنہ ۱۸۴۰ء یا اس سے چند روز قبل گرفتار کیا گیا۔ اس خیال کی بنیاد، خود اُنھیں کے بیان کے مطابق، احسن الاخبار بمبئی، کی ۲۵ جون کی اشاعت میں اس خبر کا شائع ہونا ہے۔ پہلے تو یہی باور کرنا مشکل ہے کہ آج سے تقریباً سو برس پہلے دیسی اخباروں کو اتنے دور دراز مقامات سے ہر روز خبریں ملجاتی تھیں۔ لیکن اس سے قطع نظر کرکے بھی ۲۵ جون کو یا اس سے چند روز قبل گرفتاری کا واقع ہونا محل نامل ہے، اس لیے کہ محمد اکرام صاحب نے احسن الاخبار کا جو اقتباس دیا ہے، وہ فقرہ "دہلی ۱۵ جمادی الثانی" سے شروع ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آیندہ بیان ہونے والی خبر دہلی سے ۱۵ جمادی الثانی کو بھیجی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس خبر سے متعلق واقعہ اُسی تاریخ کا یا اُس سے قبل کا ہوگا، بعد کا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ جمادی الثانی سنہ ۱۲۶۳ھ کی پندرھویں تاریخ ۳۱ مئی سنہ ۱۸۴۷ء کے مطابق ہے۔ لہٰذا میرزا صاحب کی گرفتاری ۳۱ مئی سے پہلے ہونا چاہیے۔

اس دعوے کا ناقابل تردید ثبوت کہ یہ واقعہ ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) میں پیش آیا تھا۔ حامی ہی (متوفی سنہ ۱۸۶۵ء) کا قطعۂ تاریخ ہے، جس سے ہجری، عیسوی، فصلی اور بکرمی چار تاریخیں نکلتی ہیں۔ قطعۂ تاریخ سے پہلے اور بعد نثر میں بھی اس واقعے کی جزئیات پر اہم روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ پوری عبارت نقل کر دی جائے۔ حامی لکھتا ہے: (باقی)

کوتوال نے گرفتاری کے وقت اور مجسٹریٹ نے سزا کی تجویز میں اُن کی وجاہت و شرافت کا قطعاً لحاظ نہ کیا۔ پولیس اور عدالت کے اس نامناسب سلوک سے اُن کی حسِ غیرت سخت مجروح ہوئی، خود اپنی نظر میں شرافتِ خاندان پر دھبا آگیا، اور وہ اپنے آپ کو رؤسای ہندوستان سے ملنے جلنے کے قابل شمار کرنے میں پس و پیش کرنے لگے۔

سنہ ۱۸۵۲ء میں، ریاست جیپور سے اتفاقاً رابطہ پیدا ہوا۔ میرزا تفتہ نے اس کی تفصیلات دریافت کرتے ہوئے لکھا کہ میرا بھی خیال رہے۔ اس کے جواب میں جمعہ دہم دسمبر سنہ مذکورہ کو میرزا صاحب نے لکھا:

"جیپور کا امر محض اتفاقی ہے۔ بے قصد و بے فکر درپیش آیا ہے۔ ہوسناکانہ ادھر متوجہ

(بقیہ) "مرزا نوشہ شاعرِ بے بدل دہلی، رند مشرب، المتخلص بہ اسد و غالب سے فیض الحسن خاں کوتوال دہلی کو ناحق عداوت پیدا ہو گئی، اور اُس نے بعلت قمار بازی اُن کو قید کرا دیا جس کی مندرجہ ذیل تاریخ نکالی گئی:

سر اسجد سے فصلی میں تو سب اظہار طوفاں ہو — اور اٹھارہ سو ستتالیس میں قیدِ غریباں ہے
"قلق غالبؔ" نہ کیونکر موش اور گربہ کے دل پر ہو — دبی بلی کٹاتی کان چوہوں سے بدنداں ہے
رہائی روزِ دید سے میرزا نوشہ کی کیوں کر ہو — "زمینِ غمخوار" بن کر واں گیا فیض الحسن خاں ہے
سر بازو پکڑ کر شحنۂ تقدیر نے، عاصی — "اسد کو جو تیوں سے گھیر کر ڈالا بزداں ہے"

بروقتِ گرفتاری کوتوال صاحب رتھ میں بیٹھ کر موقعہ پر گئے، اور ظاہر کیا کہ سواریاں زنانی آئی ہیں۔ اس دھوکے سے اندر داخل ہو گئے۔ اور اندر مکان کے ضربات جوتی باہم اس قدر ہوئیں کہ باہر تک آواز آتی تھی۔ مگر زینہ کے اندر جمعیت بہت تھی، اور کچھ امدادی برمحل آ پہنچ گئے۔ گرفتار کر کے قید کر دیا۔ بہت سے رئیس اور شرفا اس حرکت سے ناراض ہوئے، اور عدالت میں برأت کے ساعی ہوئے، مگر قید ہو ہی گئی۔

ایک روز مسٹر راس صاحب، سول سرجن دہلی، قید یان جیل خانہ کو ملاحظہ کرتے کرتے حضرت کے پاس پہنچ گئے اور حال دریافت کیا۔ آپ نے فی البدیہہ یہ فرمایا ؎

جس دن سے کہ ہم غمزدہ زنجیر بپا ہیں — کپڑوں میں جوئیں بچنے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

اُسی وقت ڈاکٹر صاحب نے گورنمنٹ کو چٹھی لکھ کر رہا کرا دیا۔" (کلام عامی: ۲۶۳)

اس بیان سے یہ امور بالتصریح معلوم ہو جاتے ہیں (۱) کوتوال کا نام (۲) گرفتاری کی تدبیر (۳) میرزا صاحب اور اُن کے احباب کے ساتھ پولیس کا غیر شریفانہ سلوک (۴) رہائی کی سفارش کرنے والے کا نام (۵) اور جس سے سفارش کی گئی تھی۔ اُس کا تعین (۶) میرزا صاحب کے ایک شعر کی وجہ نظم۔ اور چونکہ یہ معاصرانہ بیان ہے، اس بنا پر ہمیں سے خود میرزا صاحب کے بعض بیانوں کی تصحیح کر سکتے ہیں۔

ہوا ہوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں، بہرا ہو گیا ہوں مسرکار انگریزی میں بہت بڑا پایہ رکھتا تھا رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا۔ پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں۔ بہت بڑا دھبا لگ گیا ہے۔ کسی ریاست میں دخل نہیں کر سکتا تھا۔ مگر ہاں، اُستاد یا پیر بلا کر بنکر راہ و رسم پیدا کر دوں، کچھ آپ فائدہ اُٹھاؤں، کچھ اپنے کسی عزیز کو وہاں داخل کر دوں۔ دیکھو کیا صورت پیدا ہوتی ہے؟"(۱)

چونکہ استاد یا پیر بنکر ملنے میں اُن کا درجہ کم از کم والیِ ریاست کے مساوی ہونا یقینی تھا، اور، بصورتِ مداحی، ممدوح سے مساوی برتاؤ کی آرزو نہیں پیدا ہوتی، اس لیے ان صورتوں میں میرزا صاحب کو اپنے اخلاقی دبدبے کے احساس کا خطرہ نہ تھا، اور اب وہ ہر ریاست سے اسی قسم کے تعلقات کے خواہاں تھے۔

رامپور سے ابتدائی تعلق

نواب سید غلام محمد خاں بہادر (نوّر اللہ مرقدہٗ) کے صاحبزادے اپنے والد ماجد کی تخت سے دست برداری کے بعد، حکومتِ انگلشیہ کی زیرِ حمایت رامپور سے باہر اقامت گزیں ہونے پر مجبور ہوئے تھے، اور سابقہ تعلقات کی بنا پر پہلے لکھنؤ اور بعد ازاں دارالسلطنت دہلی کو اپنا مستقر بنایا تھا۔ میرزا صاحب جس زمانے میں دلی تشریف لائے، یہ خاندان وہاں فروکش تھا۔ چونکہ یہ حضرات صاحبِ علم و فضل تھے، اس لیے ان سے میرزا صاحب کے روابطِ خلوص و اتحاد پیدا ہو گئے۔

ایک عریضے میں میرزا صاحب نے ان روابط کا تذکرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہمدریں گنج، کہ مسکن منست، فنیدہ ام کہ والاشان زین العابدین خان بہادر بشہر آمدہ اند نیازمندی من بامرحومی نواب عبداللہ خان بہادر، و مہر و رزی من با اصغر علی خان مرحوم، و محبت و خلت من با نواب عبدالرحمٰن خان بہادر مغفور، کجا دیدہ اند، و آن مدارج کی در نظر دارند، کہ ایشان را در ضمیر بگذشت کہ گدای گوشہ نشین را باید دید۔"(۲)

(۱) اردوی: ۱۴۳ (۲) مکاتیب: ۹

نواب فردوس مکاں کی شاگردی

نواب سید محمد یوسف علی خاں بہادر، فردوس مکاں، نے سنِ شعور میں قدم رکھ کر، اپنی خاندانی روایات کے ماتحت طلبِ علم کی راہ پر گامزنی کی۔ دلی کے اساتذہ میں، مفتی صدرالدین خاں آزردہ اور مولوی فضل حق خیرآبادی عربی میں، اور میرزا صاحب فارسی میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ ان سب سے خاندانِ رامپور کی دوستی تھی، اس لیے نواب فردوس مکاں کی تعلیم انھیں حضرات کے سپرد کی گئی، اور حسنِ اتفاق سے میرزا صاحب ایک ایسے طالبِ علم کے استاد قرار پائے، جس کو قضا و قدر ریاست رامپور کا تاج و تخت سونپنے والی تھی۔

اس تعلق کی طرف میرزا صاحب نے اپنے پہلے عریضے میں اشارہ بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"دوران روزگار رنگین تر از نوبہار، کہ بہ فرخندگیٔ وجود مسعود، و سادہ باسپہر سادہ دلم از بیاہری زہ، نگاشتن و دردان داشتن قطعۂ تاریخ جلوس بہ توانائیٔ آن دانائی و دران آسائیٔ آن شناسائی صورت پذیرفت۔" (۱)

زمانۂ شاگردی

میرزا صاحب نے نواب فردوس مکاں کی اس شاگردی کا متعدد مواقع پر تذکرہ کیا ہے، لیکن کسی جگہ سالِ شاگردی نہیں لکھا۔ تیجبر کو صرف اتنا لکھا ہے کہ

"نواب یوسف علی خاں بہادر والیٔ رام پور... میرے آشنائی قدیم ہیں۔" (۲)

میرزا تفتہ کو قدرے صراحت کے ساتھ لکھا ہے، لیکن یہاں بھی تخمینے کی حد سے آگے قدم نہیں رکھا۔ فرماتے ہیں:

"نواب یوسف علی خاں بہادر تیس بتیس برس کے میرے دوست..... ہیں۔" (۳)

اردوی معلی کے نسخۂ مطبوعہ کی رو سے یہ خط سنہ ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا تھا۔ لیکن اس میں میرزا صاحب نے رامپور کے پہلے سفر کی روداد لکھی ہے، جو سنہ ۶۰ء کا واقعہ ہے؛ اسلیے

(۱) مکاتیب: ۳ (۲) اردوی: ۲۸۲ (۳) ایضاً: ۴۵

اس کو سنہ ۱۸۶۰ء کا نوشتہ ہونا چاہیے۔ اور سنہ ۶۰ء میں دوستی پر ۳۰ یا ۳۲ سال گزرنے کے یہ معنی ہیں کہ سنہ ۲۸ ۱۸ء یا ۳۰ ۱۸ء میں یہ رشتہ پیدا ہوا۔ نواب فردوس مکاں سنہ ۱۸۱۶ء میں متولد ہوئے، اور سنہ ۱۸۴۰ء میں اپنے والدِ ماجد کی تخت نشینی پر رامپور تشریف لائے تھے۔ بنا بریں سنہ ۱۸۲۸ یا ۱۸۳۰ء میں اُن کو میرزا صاحب کا دوست نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ شاگرد ہونا بعید از قیاس نہیں؛ اس لیے کہ اس وقت اُن کی عمر ۱۲ یا ۱۴ سال کی ہوگی جو طلبِ علم کا موزوں ترزمانہ ہے۔

نواب جنت آرامگاہ کی مداحی

سنہ ۱۸۴۰ء میں، نواب سید محمد سعید خاں بہادر، جنت آرامگاہ، وارثِ تختِ رام پور قرار پائے۔ نواب سید عبداللہ خاں بہادر، برادرِ خوردِ نواب جنت آرام گاہ نے، جو میرزا صاحب کے بہت گہرے دوست اور اُس وقت میرٹھ کے صدر الصدور تھے، سابقہ تعلقات کی بنا پر میرزا صاحب سے نواب جنت آرامگاہ کی مدح میں قصیدہ لکھنے کی فرمائش کی۔ میرزا صاحب نے معذرت کرتے ہوئے لکھا:

"خدام حضرت مقام، کہ سرانجام قصیدہ بقصد نام آوری از غالب میخواہند چشم داشتہ اند، مگر آن فرسودہ روان افسردہ دل را، کہ ہنوز نمردہ است، زندہ پنداشتہ اند؟... کاش بکن ایں این کار، چون صنعت نقاشی و گلدستہ بندی، تنہا بکوشش دست و بازو صورت بستی، تا چشم از خستگی دل پوشیدی و فرمان پذیرانہ در پردازش کار کوشیدی و بکنم، چون سر این رشتہ در دست دل است؛ تا دل برجای نباشد، زبان سخن سرای نباشد۔ دیدہ وران صاحبدل دانند کہ چقدر ہا دیدہ و دل بہم آمیختہ شود، تا نقشی بدین شگرفی کہ بالغ نظران پسندند، آئینہ شود۔ ایں دل شکستہ بہم نہ پیوستہ، کہ در سینۂ من دہا نا دشمن دیرینۂ منست، نہ نہار بکار سخن گستری نیاید، و معنی آفرینی را نشاید... اگر دانند، کہ فلانی، با ایں ہمہ پریشانی سخن گفتن میتواند، و من نیز دانم کہ میتوانم، در مصحف بندگان سپہر آستان، امیر المسلمین، قبلۂ دنیا و دین، سرور سلطان نشان، نواب محمد سعید خان بہادر بقا، چرا سخن نرانم؟ تا اگر درین گیتی لعل و گہر سودنہ بردہ باشم، خود و یران گیتی دین و ایمان زیان نکردہ باشم۔

امید کہ دربارۂ گرائش بدین سالیش نظماً و نثراً نامہ نگار را از اصحاب شمارند، و بدعای سلامت ایمان، کہ حسن خجستگی انجام ہمان تواند بود، یاد آرند۔" (۱)

لیکن میرزا صاحب نے سنہ ۱۸۴۰ء میں جس کام کے سرانجام نبانے کا عذر کیا تھا، چند سال کے بعد قدرت اُن سے وہی کام لینے والی تھی۔ بتیک انسان آیندہ واقعات کے علم سے قطعاً محروم رکھا گیا ہے!

نواب فردوس مکاں کی تخت نشینی اور رشتۂ استادی کی تجدید

اس مراسلت کے پندرہ سال بعد اپریل سنہ ۱۸۵۵ء میں، نواب جنت آرامگاہ نے وفات پائی، اور نواب سید محمد یوسف علی خاں بہادر، فردوس مکاں، تخت نشیں ہوئے۔ میرزا صاحب نے قدیم رابطے کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قطعۂ تاریخ جلوس ارسال کیا۔ (۲)

۳ فروری سنہ ۱۸۵۶ء کو مہر نیروز علی بخش خاں خانساماں کی معرفت کتابخانے میں داخل ہوئی، جو غالباً خود میرزا صاحب کی طرف سے دوسری کوشش تھی (۳) معلوم ہوتا ہے کہ دربارِ رامپور سے اس کا کوئی جواب نہ گیا، اور تقریباً دو سال تک تجدیدِ تعلقات کی یہ کوشش بارآور نہ ہوئی۔

حسنِ اتفاق سے، مولانا فضل حق خیرآبادی رامپور میں فروکش تھے۔ اُنھوں نے حقِ دوستی ادا کرنے کے خیال سے وقتاً فوقتاً سرکار کے روبرو میرزا صاحب کی اس قدر تعریف و توصیف کی کہ سرکار اُن کے کلام کے مشتاق ہوگئے۔ حالات کو سازگار پا کر مولانا نے میرزا صاحب کو لکھا کہ سرکار کی خدمت کے لیے کمربستہ ہو جائیے اور اصلاحِ اشعار کا کام انجام دیجے۔ مولانا کا نامۂ گرامی میرزا صاحب کو ۲۷ جنوری سنہ ۱۸۵۷ء

(۱) کلیات نثر فارسی، ص ۲۱۹۔ (۲) مکاتیب: ۳۰

(۳) میں نے غالباً اس لیے لکھا ہے کہ سنہ مذکور کے حساب میں اس کتاب کی قیمت کے چھ آنے خرچ میں دکھائے گئے ہیں، جس سے یہ شبہہ پیدا ہوجاتا ہے کہ کہیں رامپور ہی کے کسی صاحب کی تحریک پر تو اس کا کتابخانے میں داخلہ نہیں ہوا ہے۔ لیکن ظن غالب یہی ہے کہ خود میرزا صاحب نے کسی کے توسط سے کتاب یہاں فروخت کرائی ہوگی۔ وہ اسی قسم کی سوجھ بوجھ کے انسان تھے۔

کو موصول ہوا۔ ۲۸ جنوری کو انھوں نے تعمیلِ ارشاد، نواب فردوس مکاں کی خدمت میں پہلا عریضہ ارسال کیا۔ اس کے جواب میں سرکار نے ۵ فروری کو اپنے کچھ اشعار بغرضِ اصلاح بھیجے اور اُن کے ساتھ تحریر فرمایا:

"نسیمۂ انیقۂ بلاغت آگیں مشعر رسید خط مولوی صاحب مخدوم مولوی محمد فضل حق صاحب بادیگر مراتب محبت و اشفاق بعبارت رنگین و دقیق در عین انتظار سرمہ کش عیون وصول نشاط شمول گردیدہ، باطلاع خیر مبتہاے سرور نامحصور افزودہ، از مزید شفقت و ایتلاف قلبی متصور شد۔" (۱)

اس فرمان نے میرزا صاحب میں نیا ولولہ پیدا کیا، اور انھوں نے ۱۱ فروری کو، سرکار کی مدح میں قصیدہ نظم کر کے، بذریعۂ ڈاک ارسال کیا۔ اس کی ایک نقل میرزا صاحب نے مولانا کی خدمت میں بھی بھیجی تھی، جو انھیں "اورمیں" موصول ہوئی۔ وہاں سے ۱۰ اپریل کو مولانا نے سرکار کو تحریر فرمایا:

"بعرض میرساند، کہ خبر سگال با فضال ایزد بیہمال بصحت و اعتدال با دور رسیدہ، بلاطفۂ مرزا صاحب مشفق نجم الدولہ مرزا اسد اللہ خان صاحب تخلص بغالب مع قصیدۂ مبیہ، کہ در مدح حضور فیض معمور منظوم کردہ اند، از داک خانہ یافت۔ مرزا صاحب موصوف در ثناے ستایش موزونی طبع اقدس و توصیف غزلہائی، کہ نزد شان شرف ارسال یافتہ بودند، و شکر و سپاس عطای مبلغ پانصد روپیہ، کہ بدو دفعہ بمرزا صاحب موصوف عنایت شدند اسہاب در تحریر فرمودہ اند۔ حالانکہ طبع اقدس در علوم عقلیہ و فنون حکمیہ آنچنان دقیقہ رس، کہ عدیل آن در مملکت ہندوستان، کہ حال علماے آن تفصیلاً معلوم است، کمتر بلکہ معدوم است۔ نظم شعر و فہم آن و ایماع معانیٔ تازہ و مضامین مبتکرہ و سرد الفاظ فصیحہ و تراکیب بلیغہ بحسب اوزان عروض نسبت بعلو طبع اقدس و بلندیٔ افکار صائبہ از ادنیٰ مراتب است۔ مرزا صاحب ازین حال لاعلم اند۔ طبع عالی و فکر صائب در دقائق حکمیہ و مفصلات فلسفیہ بجائی میرسد، کہ رسیدن افہام علّام اعلام تا آن مقام معلوم

(۱) مکاتیب: ۳، ج ۳

الانتفاست درین سخن ہیچ مبالغہ و اغراقی نیست۔ حضور را مع السرور بنفس نفیس امتحانات فرمودہ اند، و تکرار امتحان ہم سہل است۔ و نظر بہمت والا و جود و سخا بذل آلاف الوف را اقل قلیل توان پنداشت۔ مرزا صاحب حق سپاسگزاری ادا کردہ اند۔ نظم قصیدۂ بدیعہ در غایت بلاغت و انسجام است۔ غالباً شرف اندوز ملاحظۂ والا شدہ باشد۔۔۔" (۱)

مولانا کی اس تحریر نے میرزا صاحب کے سابقہ تعلقات از سرِ نو استوار کر دیئے، اور ایک مخلص دوست کی کوشش سے میرزا صاحب کی یہ تجویز کہ "آئندہ ریاستوں میں پیر یا اُستاد نکر رسوخ حاصل کرنا چاہیے" ریاست رامپور میں کامیاب ہو گئی۔

نواب فردوس مکاں کا سالِ شاگردی

نواب فردوس مکاں کے سالِ تلمذ کا تذکرہ میرزا صاحب نے متعدد خطوط میں کیا ہے۔ لیکن تقریباً ہر خط میں اُن کا بیان دوسرے خط سے مختلف ہے۔ مارچ سنہ ۶۰ء میں بیخبر کو لکھا ہے:

"سنہ ۱۸۵۵ء میں نواب یوسف علی خاں بہادر والیٔ رام پور، کہ میرے آشنای قدیم ہیں، اس سال یعنی سنہ ۱۸۵۵ء میں میرے شاگرد ہوئے۔ "ناظم" اُن کو تخلص دیا گیا۔ میں پیہم غزلیں اردو کی بھیجتے۔ میں اصلاح دیکر بھیجدیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا۔ قلعہ کی تنخواہ جاری۔ انگریزی پنشن کھلا ہوا۔ ان دن کے عطایا فتوح گنے جاتے تھے۔ جب وہ دونوں تنخواہیں جاتی رہیں، تو زندگی کا مدار ان کے عطیے پر رہا۔ بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے۔ میں عذر کرتا تھا۔ جب جنوری سنہ ۱۸۶۰ء میں گورمنٹ سے وہ جواب پایا کہ جو اوپر لکھ آیا ہوں، تو میں آخر جنوری میں رامپور گیا۔" (۲)

اسی ماہ میں تفتہ کو لکھتے ہیں:

"نواب یوسف علی خاں بہادر تیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیجدیا کرتے تھے۔ اب جولائی سنہ ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینا ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔" (۳)

(۱) شمل نمبر (۲۵۹) سفینۂ احباب، عبد نواب فردوس مکاں، مکتبۂ دارالانشا۔ (۲) اردوی: ۳۰۳/ و عود ۱۳۳۶ عود میں پنشن کھلی ہوئی، بصیغۂ مونث ہے۔ (۳) اردوی: ۵۲۷/۔

اس تخمینے کی رو سے، نواب فردوس مکاں کا سالِ شاگردی سنہ ۵۲ یا ۵۵ء قرار پاتا ہے۔
لیکن ۳۰ جولائی سنہ ۱۸۶۵ء کو سیاح کو تحریر کیا ہے:

"ایک قرن ۱۲ برس سے فردوس مکاں، نواب یوسف علی خاں، والیٔ رامپور، اپنے اشعار میرے پاس بھیجتے تھے، اور سو روپیہ مہینا ماہ بماہ بیبیل ہنڈوی بھجواتے تھے۔" (۱)

اس حساب سے نواب فردوس مکاں کو سنہ ۵۳ء میں میرزا صاحب سے متورۂ سخن شروع کرنا چاہیے۔ میرزا صاحب کے سوانح نگاروں میں سے مولانا مہر نے سنہ ۵۵ء اختیار کیا ہے (۲) غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ بظاہر اول الذکر دونوں سنہ تخمینی اور یہ واقعی ہے۔ لیکن فی الحقیقت یہ سنہ بھی تخمینی ہے، اور میرزا صاحب کے دوسرے تخمینی اعداد و شمار کی طرح دو سال قبل کی تاریخ بتاتا ہے۔

ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ میرزا صاحب نے ۲۸ جنوری سنہ ۵۷ء کو اپنا پہلا "نامۂ بندگی" ارسال کیا تھا، اور اس میں یہ عرض کیا تھا کہ سنہ ۵۵ء میں قطعۂ تاریخ جلوس کا ارسال سابقہ تعلق کی بنا پر تھا؛ اب یہ عریضہ مولانا فضلِ حق خیرآبادی کے ارشاد کی تعمیل میں لکھ رہا ہوں۔ اس کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے ۵ فروری سنہ ۵۸ء کو گرامی نامہ تحریر فرمایا، جس کا ضروری حصہ اوپر نقل کیا جا چکا ہے۔ اس میں یہ الفاظ ارادۂ تلمذ پر دال ہیں:

"مشتاقا! ہرچند کہ کاتب را اتفاق موزونیت یک مصرع ہم نہ شدہ بود؛ لیکن صحبت سماعت کلام سامی زبانی مولوی صاحب صدر الوصف دلم خواست کہ طریقۂ رسل و رسائل جاری شود۔ چون سببی برازین منتظم نرسید، لہذا چند ابیات موزوں نمودہ، بترصد اصلاح پیش آن یگانۂ آفاق مرسل گشت۔ چنداشت کہ بعد اصلاح غزلہای مذکور مع کدام طرح جدید ملفوف فرمودہ شوند۔" (۳)

میرزا صاحب نے ۱۲ فروری کو اس فرمان کے جواب میں عریضۂ ۳ تحریر کیا، اور اس میں غزلیات اور ہنڈوی کے پہنچنے کی اطلاع کے بعد عرض کیا کہ

"اشعار خود ہنگام خوبی خواہ رسید۔"

(۱) اردوئے معلی: ۱۲ (۲) غالب، مصنفہ مولانا مہر، ۱۳۱ دوسرے ایڈیشن میں مولانا نے ۵۸ء کو تسلیم کر لیا ہے۔
(۳) مکاتیب: ۳، ج ۳

نیز ۱۵ فروری کو اصلاح شدہ غزلوں کے ساتھ جو عریضہ بھیجا اُس میں تخلص کے متعلق لکھا:

"میں نہیں چاہتا کہ آپکا اسم سامی اور نام نامی تخلص رہے۔ ناظم، عالی، انور، شوکت نہیں، ان میں سے جو پسند آئے وہ رہنے دیجے، مگر یہ نہیں کہ خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں۔ اگر وہی تخلص منظور ہو، تو بہت مبارک ہے۔" (۱)

سرکار نے یکم مارچ کو جواباً تحریر فرمایا:

"منجملہ الفاظ تخلص لفظ "ناظم" مطبوع طبع نیاز گنت ہے۔" (۲)

ان تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ نواب فردوس مکاں ۵ فروری سنہ ۵۰ء کو میرزا صاحب کے شاگرد ہوئے، ۱۵ فروری کو میرزا صاحب نے انھیں تخلص کے لیے چند الفاظ لکھے، اور یکم مارچ سنہ ۵۰ء کو سرکار نے "ناظم" تخلص پسند آنے کی میرزا صاحب کو اطلاع تحریر فرمائی۔

مومن و اسیر سے تلمذ

امیر مینائی مرحوم نے نواب فردوس مکاں کے ذکر میں تحریر فرمایا ہے:

"طبیعت اول سے موزوں پائی تھی۔ سخن گوئی کا ذوق، اردو شعر فرمانے کا شوق تھا۔ پہلے مومن خاں صاحب دہلوی سے مشورہ رہا، پھر مرزا اسد اللہ خاں غالب سے تلمذ ہوا۔ آخر آخر بوضع استادان لکھنؤ موزوں فرمانے لگے۔ منشی مظفر علی صاحب کو، جو آج لکھنؤ میں سحبان عصر و یکتای دہر ہیں، کلام دکھانے لگے۔" (۳)

جہاں تک حکیم مومن خاں مرحوم کی شاگردی کا تعلق ہے، سرکار کے اس ارشاد کے بعد کہ مکاتب ما اتفاقِ موزونیتِ کیے مصرعہ ہم نہ شدہ بود گے کوئی گنجایش باقی نہیں رہتی (۴)

(۱) مکاتیب: ۲ (۲) ایضاً: ۲ ح ۱ (۳) انتخاب یادگار: ۷۰

(۴) مومن خاں کے کلیات فارسی (نسخہ قلمی کتب خانۂ رامپور ورق ۹۲ الف) میں ایک ۵ بیت کا قطعہ ملتا ہے جس میں نواب فردوس مکاں کے دہ دو دہلی کی تاریخ نظم کی ہے۔ اس کا عنوان ہے "تاریخ آمدن یوسف علی خان بہادر بہ دہلی مدظلہ ولیعہدی"۔ اشعار یہ ہیں: ببیں خضر، نیز رنگ زلیخا + جوان سال، یوسف علی خان بہادر + رسانند گدا را بہ اوج عزیزی + زہے دہ سال یوسف علی خان بہادر + بہ دہ گدیہ نقد حصول آرزو ہا + ز آمال یوسف علی خان بہادر + نظر دہ کہ کرم گرد یا ہش + خوشا حال یوسف علی خان بہادر + توان یافت سالِ ورود ش بدہلی + ز اقبال یوسف علی خان بہادر + ان اشعار میں بھی تلمذ کی طرف کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا۔ بلکہ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ ممدوح کو شعر گوئی سے کوئی تعلق ہے۔

لیکن آسیر لکھنوی کی شاگردی کا ثبوت سرکار کے فرمان بنام آسیر مؤرخہ ۳ مارچ سنہ ۱۸۶۲ء سے بھی ملتا ہے[۱]۔ اس کی ظاہری وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ آسیر سنہ ۱۸۶۳ء میں میرزا صاحب نے ضعیف پیری اور غلبۂ امراض کے باعث سرکار سے استدعا کی تھی کہ آیندہ مجھے خدمتِ اصلاح سے معاف رکھا جائے[۲]۔ سرکار نے اس استدعا کو منظور فرما کر غالباً بمشورۂ امیر مینائی مرحوم آسیر کے پاس اپنا کلام بھیجنا شروع کر دیا لیکن میرزا صاحب سے رشتۂ شاگردی منقطع نہیں فرمایا، چنانچہ مرض الموت میں بھی ایک سلام لکھ کر اُن کے پاس بغرضِ اصلاح ارسال کیا تھا۔ جو بعد انتقال واپس آیا[۳]۔

نذر اور میرزا صاحب کی خبر خواہی

میرزا صاحب کے جدِ بدرشتۂ اُستادی کے قیام پر چند ماہ گزرے تھے کہ نذر سنہ ۱۸۶۵ء کے آثار پیدا ہونے لگے۔ میرزا صاحب نے اپنے محسن شاگرد کی خدمت میں کچھ خطوط لکھے، جو ان کی حسبِ ہدایت چاک کر دیے گئے۔ اس ہدایت کی وجہ بجز اس کے اور کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ اُن تحریروں کا مضمون سیاسیات سے متعلق تھا، اس لیے کہ جب آتشِ نذر بھڑک اٹھی، اور نواب فردوس مکاں کے لیے ناگزیر ہو گیا کہ اپنا ولیعہد تعین کریں، تو اُنھوں نے انتہائی ہوشمندانہ طریقِ کار اختیار کیا۔ "دستنبو" میں میرزا صاحب اس بارے میں لکھتے ہیں:

"چشم بد دور! فرزند ہنرمند، نواب یوسف علی خان بہادر فرمانروای رامپور، کہ ذوق بر بادۂ عرفان سرزمین ہرزہ بانی و شاہد افشانی نیاگان خویش را جانشین است، و بجا بنیاد انگشت در مہر دوزی دیگدان استواری پائش بدان آئین است کہ دست روزگار در ہزار سال ہزار گونہ گرہ کشی آزمانیا مدگست، چارنا چار بفرستادن پیام خشک، زبان ہم سایگان از گفتگو بست"[۴]

یہ رویہ، جسے میرزا صاحب نے "پیامِ خشک" سے تعبیر کیا ہے، اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، جب تک حالات کا صحیح علم اور اُن کے پیدا ہونے کے واقعی اسباب

(۱) مثل ۵۰، صفحۂ احباب (۲) دستنبو، ص ۶۴ (۳) امیر مینائی نے امیر اللغات کے دیباچے میں لکھا ہے کہ فردوس مکاں مجھ سے بھی مسودۂ سخن فرماتے تھے۔ خدا جانے یہ بات اُنھوں نے انتخابِ یادگار میں کیوں نہیں لکھی۔ (۴) کلیاتِ نثرِ فارسی: ۳۸۷۔

قبل ازیں وقت نہ معلوم ہو چکے ہوں۔

ترکِ مراسلت

غدر کے ساتھ حکومتِ ہند کے سلسلۂ نامہ رسانی میں اختلال واقع ہو گیا، نیز دہلی سے خط بکثرت کرنے میں کاتبِ مکتوب الیہ کے لیے لال قلعے یا حکومتِ ہند کی نظر میں مشتبہ قرار پانیکا خطرہ تھا، اس لیے قاصد کے ذریعے سے "خیریت گوئی و عافیت جوئی" بھی سہل اور بےخطر نہ رہی تھی۔ ادھر نواب فردوس مکاں روہیلکھنڈ کی بغاوت فرو کرنے میں منہمک تھے۔ ان حالات کا یہ نتیجہ نکلا کہ میرزا صاحب اور سرکار میں اگست ۱۸۵۷ء سے جنوری سنہ ۵۸ء تک مراسلت نہ ہو سکی۔ عریضۂ ۱ میں میرزا صاحب اس ترکِ مراسلت کا شکوہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"در زمان چیرہ دستی کورنمکان سیاہ رو سیاہ سررشتۂ ایام از ہم گسست۔ ناچار بفرستادن نامہ مساعدت نامہ و پیام صورت بست۔ درین روزگار کہ فرمان داوران داد گر روائی و سلسلۂ آمد شد نامہ رسائی یافت، نامہ و پیام روان داشتہ شد، و نا رسیدن پاسخ آزاجان پنداشتہ شد، کہ مگر آن نیایشنامہ نرسیدہ باشد، یا فرط احتیاط مانع تحریر جواب گردیدہ باشد۔۔۔۔ بہ نگاشتن این نامہ، زحمت اوقات ملازمان ازان رو روا داشتہ ام، کہ اگر نفرستادن نامہ محض از روی احتیاط است، ہویدا گردد، کہ در عنایت تفریطے و در رعایت افراطے است۔"

میرزا صاحب کی مالی پریشانی اور تفرد و خلیفہ

میرزا صاحب کو خزانۂ کلکٹری سے ساڑھے باسٹھ روپیہ ماہوار پنشن ملا کرتی تھی، جسے غدر کے بعد تعلقِ قلعہ کے سبب سے گورنمنٹ نے مسدود کر دیا۔ امن کے بعد میرزا صاحب نے بیگنا ہی ظاہر کی، لیکن مدت تک شنوائی نہ ہوئی۔ غدر سے قبل نواب فردوس مکاں نے وقتاً فوقتاً کچھ عطیات بھیجے تھے۔ میرزا صاحب نے بیخبر کو ان عطیات کے بارے میں لکھا ہے:

"نواب یوسف علی خاں بہادر والیٔ رامپور،۔۔۔۔ میں کبھی غزلیں اردو کی بھیجتے۔ میں اصلاح دیکر بھیجدیتا۔ گاہ گاہ کچھ روپیہ ادھر سے آتا رہتا۔" (۲)

(۱) مکاتیب: ۸ و ۱۰ (۲) اردوئے: ۲۸۳ و عود: ۱۳۶ - ان عطیوں کی تفصیل آیندہ صفحات میں ملاحظہ ہو۔

لیکن ایامِ غدر میں وہ بھی امداد نہ کر سکے۔ بعدِ غدر سنہ ۱۸۵۸ء میں میرزا صاحب نے ایک قصیدے کے توسط سے سالانہ امداد کی درخواست کی۔ نزدوس مکاں نے متعدد بار ڈھائی ڈھائی سو روپے نقد عطا کیے، مگر میرزا صاحب کو اوقات بسر کرنے کے لیے ماہوار امداد کی ضرورت تھی۔ لہٰذا اُنھوں نے "یوسفِ رامپور" کے حضور میں مزید پرورش کی درخواست ارسال کی۔ سوءِ اتفاق سے مثل میں یہ درخواست موجود نہیں۔ البتہ عریضۂ ۱۳ مورخۂ ۱۸ اپریل سنہ ۵۹ء میں ایک حسنِ طلب پر مشتمل نیاز نامے کا ذکر ہے۔ فرماتے ہیں:

"اسی نیاز نامہ میں کچھ حسنِ طلب بھی تھا۔ افسوس کہ ایسا خط ضروری نہ پہنچے۔" (۱)

چونکہ اول الذکر عریضہ سرکار کو موصول نہ ہوا، اور دوسرے میں اُس حسنِ طلب کی تشریح نہ تھی، اس لیے مجبوراً ۱۰ جولائی سنہ ۵۹ء کو میرزا صاحب نے ایک اور عریضہ ارسال کیا۔ مسئلہ میں یہ عریضہ بھی موجود نہیں ہے، لیکن سرکار کے جوابی فرمان، مورخۂ ۱۴ ذیحجہ سنہ ۱۲۷۵ھ، مطابق ۱۶ جولائی سنہ ۵۹ء، سے اس کے مضمون پر روشنی پڑتی ہے۔ سرکار نے ارشاد فرمایا ہے:

"... سامی صحیفۂ تلطف آگین مورخۂ دسویں اس مہینے جولائی سنہ حال کا بیچ مین انتظار کے غازۂ آرائی چہرۂ وصول نشاط شمول کا ہوا، اور اوپر مراتب مرقومہ کے مطلع کیا۔ اور ان غزلوں کی اصلاح سے مخلص کو کمال مسرت ہوئی، اور منظر آپ کی زیر باری کے اس مہینہ جولائی سے سو روپیہ مہینہ مقرر کیا گیا، اور دفتر میں نام آپ کا مندرج کیا گیا۔ ہر مہینے تنخواہ مقررہ پہنچے گی۔ یقین ہے کہ آپ بھی اس کو محمول کمال محبت پر فرماویںگے۔" (۲)

اس فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کسی وجہ سے خط نہ لکھ سکے تھے۔ اور سرکار اُن کے خط کے منتظر تھے۔ ۱۰ جولائی کے عریضے میں اُنھوں نے اپنی زیر باری کا ذکر کیا، تو سرکار نے ازراہِ پرورش سو روپے ماہوار تنخواہ مقرر فرما دی۔ سرکار کا روکار یہ تقریر دلپذیر ۱۶ جولائی کو صادر ہوا، اور میرزا صاحب کو پہلی تنخواہ کی ہنڈوی ۲۸ ذیحجہ سنہ ۱۲۷۵ھ، (۳۱ جولائی سنہ ۵۹ء) کو روانا کی گئی۔ (۳)

(۱) مکاتیب، ۱۴۔ (۲) مثل نمبر ۳۳۵، صیغۂ احباب۔

اپریل سنہ ۶۰ء میں میرزا صاحب نے مجروح کو جو خط لکھا ہے اُس میں بھی جولائی سنہ ۵۹ء سے تنخواہ جاری ہونے کا ذکر ہے۔ فرماتے ہیں:

"قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی سنہ ۱۸۵۹ء سے، کہ جس کو یہ دسواں مہینا ہے سو روپیہ مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔" (۱)

ہنڈوی بھیجنے کا طریقہ

چونکہ میرزا صاحب رامپور میں فروکش نہ تھے، اس لیے اُنھیں ہر مہینے کی دسویں یا بارھویں تاریخ تک سو روپے کی ہنڈوی سرکار کے گرامی نامے کے ساتھ ملفوف بھیجی جاتی تھی بعض عرائض میں میرزا صاحب نے لکھا ہے کہ پہلی دوسری تاریخ تک روپیہ بھیجا یا جایا کرے، سرکار نے اس کو منظور بھی فرمالیا ہے، اور دفتر کو حکم بھی ہوگیا ہے، لیکن بالعموم ان تاریخوں کے بعد ہی روپیہ روانا کیا گیا۔ میرزا صاحب کے مکتوب، مورخہ ۳۰ جولائی سنہ ۶۵ء، بنام سیاح، سے معلوم ہوتا ہے کہ سرکار میرزا صاحب سے روپیہ کی رسید نہیں لیتے تھے۔ میرزا صاحب لکھتے ہیں:

"ایک قرن ۱۲ برس سے فردوس مکاں، نواب یوسف علی خاں، والیٔ رامپور، اپنے اشعار میرے پاس بھیجتے تھے، اور سو روپیہ مہینا ماہ بماہ بسبیل ہنڈوی بھجواتے تھے۔ اور مغفور کی

(۱) اردوئے معلی: ۱۶۲، ۱۶۳۔ میرزا صاحب کی تنخواہ کو تقریر کے سلسلے میں مولانا مہر فرماتے ہیں: "غدر کے بعد جب قلعہ کی تنخواہ جاتی رہی اور خاندانی پنشن بند ہوگئی، تو غالب نے ایک فارسی قصیدہ نواب یوسف علی خاں کے پاس بھیجا، جس میں گہرے دوستانہ روابط کا ذکر کرتے ہوئے نواب صاحب کے تغافل کا شکوہ کیا گیا تھا۔ اس قصیدہ پر نواب یوسف علی خاں مرحوم نے سو روپیہ ماہوار کا وظیفہ غالب کے لیے مقرر فرمادیا، جو ماہ بماہ نواب صاحب خود غالب کو بھیجتے تھے" (ص ۱۴۳) لیکن مولف بالا دستاویزوں کے پیش نظر مجھے مولانا کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے کہ سرکار نے اس قصیدہ پر میرزا صاحب کی تنخواہ مقرر کی، اور نہ مجھے یہ تسلیم ہے کہ اس کے بعد نواب صاحب کو توقیع بریلی کی مبارکباد دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں مفتی یا قاضی یا شحنہ یا عامل کے عہدے کا طلبگار نہیں، بلکہ صرف یہ چاہتا ہوں کہ میرا حصہ مجھے ماہ بماہ پہنچا رہے" (۱۴۳) اس لیے کہ قصیدہ میں میرزا صاحب نے ماہانہ کی جگہ سالانہ امداد کی درخواست کی ہے۔ فرماتے ہیں:

ہر سال ازان شہر بمن وایہ روان دار
کز بہر مہین گشتہ در انقطاع توشامل

اندازہ دانی دیکھیے کہ مجھ سے کبھی اوس روپیہ کی رسید نہیں لی۔ اپنے خط میں ہنڈوی بھیجا کرتے۔ میں خط کا جواب لکھ بھیجتا۔ اس ماہانہ کے علاوہ کبھی دو سو کبھی ڈھائی سو بھیجتے رہتے۔ فتنہ و فساد کے دنوں میں قلعہ کی آمد مفقود۔ انگریزی پنشن مسدود۔ یہ بزرگوار وجہ مقرری ماہ بماہ اور فتوح گاہ گاہ بھیجتا رہا، تب میری اور میرے متوسلوں کی زیست ہوئی۔" (۱)

اس مکتوب میں رسید سے میرزا صاحب کی مراد باضابطہ ٹکٹ چپاں رسید ہوگی، ورنہ سرکار کے ہر فرمان میں روپے کی وصولیابی سے مطلع کرنے کی خواہش، اور میرزا صاحب کے تمام ماہانہ عرائض میں روپے کی رسید کی اطلاع درج ہے۔

اصلاح میں تاخیر

میرزا صاحب کی طرف سے نواب فردوس مکاں کے کلام پر اصلاح دینے میں تاخیر بھی ہو جاتی تھی، چنانچہ متعدد قراین میں تعمیل کا تقاضا اور بعض میں تاخیر کا شکوہ نظر آتا ہے۔ اس کا سبب میرزا صاحب کی علالتِ طبع تھی۔ ۲۰ نومبر سنہ ۶۱ء کے ایک مکتوب میں میرزا صاحب نے سیاح کو لکھا ہے:

"ان دنوں ضعفِ دماغ، دردِ سر میں ایسا مبتلا ہوں کہ دوائی رامپور کا بھی بہت سا کلام یونہی دھرا ہوا ہے۔ دیکھنے کی بھی نوبت نہیں آئی۔ تمہاری بھیجی ہوئی غزلیں سب محفوظ دھری ہوئی ہیں۔ خاطر جمع رکھو۔ جب نواب صاحب کی غزلیں دیکھوں گا، تو یہ بھی دیکھی جائیں گی۔" (۲)

ایک بار تفتہ کے کلام پر اصلاح دینے میں دیر ہوئی۔ اُنھوں نے تقاضائی خط لکھا۔ اس پر ۱۴ اکتوبر سنہ ۶۲ء کو میرزا صاحب نے تحریر فرمایا ہے:

"بھائی! تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھا کہ تمہارے ہی قصائد پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ یرصاحب کا حال تمھیں بھی معلوم ہے اب نجات ہوئی ہے۔ نواب صاحب

(۱) اردوی: ۱۶ (۲) ایضاً: ۲۵

کی غزلیں اور تمہارے قصائد دیکھے جائیں گے۔ میں ناتواں بہت ہو گیا ہوں۔ گویا صاحب فراش ہوں۔ کوئی شخص بے تکلف کی ملاقات کا آجائے، تو اٹھ بیٹھتا ہوں؛ ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں، لیٹے لیٹے مسودات دیکھتا ہوں۔ اللہ! اللہ! اللہ! کب (۱)

اس جواب پر ایک ماہ گزر گیا، لیکن ہنوز تفتہ کو اصلاح شدہ قصائد نہ ملے۔ انھوں نے پھر شکایت آمیز خط لکھا۔ اس کے جواب میں ۲۷ نومبر سنہ ۶۲ء کو میرزا صاحب نے معذرت کرتے ہوئے، نواب صاحب کی غزلوں پر اصلاح نہ دینے کا پھر ذکر کیا۔ فرماتے ہیں:

"مرزا تفتہ! جو کچھ تم نے لکھا یہ بیدردی ہے اور بدگمانی۔ معاذ اللہ! تم سے اور آزردگی۔ مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں، جس کا ہرگوپال نام اور تفتہ تخلص ہے بھائی مجھ میں اب کچھ باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گزر گئی، لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں۔ بیٹھ نہیں سکتا۔ اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں... لالہ بالمکند بیمبر کا ایک پارسل ہے کہ اوس کو بہت دن ہوئے، آجتک سرنامہ بھی نہیں کھولا۔ نواب صاحب کی دس پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں۔

ضعف نے "غالب" نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے (۲)

مگر وظیفہ جاری

لیکن اس تاخیر کے باوجود نواب فردوس مکاں وظیفہ برابر دیتے رہے؛ حتی کہ سنہ ۶۳ء میں میرزا صاحب کے اصلاح سے انکار پر بھی سرکار نے وظیفہ بند نہ کیا۔ سرکار کی اس مہربانی و پرورش کا ایک خط میں میرزا صاحب نے ذکر کیا ہے۔ واقعہ یہ درپیش آیا کہ ایک تفتہ کے کلام پر اصلاح دینے میں دیر ہوئی۔ انھوں نے تقاضا کیا۔ میرزا صاحب نے عذر ضعف کیا، جسے تفتہ نے باور نہ کیا۔ اس پر میرزا صاحب نے تحریر فرمایا:

"میرا عجب حال ہے۔ حیران ہوں کہ تمھیں میرا کلام کیوں باور نہیں آتا۔ سامعہ مر گیا تھا۔

(۱) اردوی: ۹۷ (۲) ایضاً: ۹۹ و ۱۰۰

اب با مرض بھی ضعیف ہو گیا۔ ... رئیس رام پور سو روپیہ مہینا دیتے ہیں۔ سال گزشتہ اونکو لکھ بھیجا کہ اصلاح نظم حواس کا کام ہے، اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے، عوض خدمات سابقہ میں شمار کیجیے، تو میں سکھ سے بسر کروں، ورنہ خیرات خوار سہی۔ اور اگر یہ عطیہ بشرط خدمت ہے، تو جو آپکی مرضی ہے، وہی میری قسمت ہے۔ برس دن سے اون کا کلام نہیں آتا۔ فتوح مقرری نوسہر تک آئی۔ اب دیکھیے، آگے کیا ہوتا ہے۔ آجتک نواب صاحب ازراہ جوانمردی دیے جاتے ہیں۔" (۱)

یہ خط میرزا صاحب نے ۱۴ رجب کو لکھا تھا۔ اس کے آخر میں سنہ درج نہیں ہے، لیکن قیاس چاہتا ہے کہ سنہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۴ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء تاریخ کتابت ہوگی، اس لیے کہ اس میں میرزا صاحب نے نومبر کی تنخواہ موصول ہونے کی اطلاع دی ہے، لہذا خط لکھتے وقت دسمبر کا مہینا ہونا چاہیے، اور جیسا کہ خود میرزا صاحب کے عریضہ ۳۹ سے معلوم ہوتا ہے، رجب سنہ ۱۲۸۱ھ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ کے ساتھ شروع ہوا تھا۔

اس خط میں میرزا صاحب نے اُس عریضہ کا مضمون دُہرایا ہے، جو نواب فردوس مکاں کی خدمت میں ارسال کیا تھا۔ گو وہ عریضہ امثلہ میں موجود نہیں ہے، لیکن دوسری مثلوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کا یہ ارشاد کہ "برس دن سے اُن کا کلام نہیں آتا" حقیقی عذر ہے۔ کیونکہ دسمبر سنہ ۶۳ء سے دسمبر سنہ ۶۴ء تک نواب فردوس مکاں نے تقریباً ہر ماہ خط بھیجا ہے، مگر کسی میں اشعار کے ارسال کی اطلاع یا مرسلہ کلام کی واپسی کا تقاضا درج نہیں ہے۔ اُن کا آخری کلام وہ واسوخت تھا، جو میرزا صاحب نے آخر اکتوبر سنہ ۶۳ء میں واپس بھیجا اور یہاں ۲۹ اکتوبر سنہ مذکور مطابق ۱۵ جمادی الثانیہ سنہ ۸۱ھ کو موصول ہوا۔ اس کے بعد اکتوبر سنہ ۶۴ء کے آخر یا نومبر کے آغاز میں سرکار مرضِ سرطان میں مبتلا ہو گئے، اور غالباً سنہ ۶۵ء کے شروع میں محرم سنہ ۸۲ھ کی مجالس کے لیے صرف ایک سلام لکھ کر بھیج سکے، جو اُن کے انتقال کے

(۱) اردوئے معلی: ۳۰۰، ۳۰۱

بعد میرزا صاحب نے نواب خلد آشیاں کی خدمت میں واپس ارسال کیا تھا۔(۱)

رام پور کا پہلا سفر، اور سرکار کے پانچ دعوتنامے

نواب فردوس مکاں کو میرزا صاحب کا شاگرد ہوئے چند ماہ گزرے تھے کہ ہنگامۂ غدر برپا ہو گیا، اور کچھ عرصے تک مراسلت بند رہی۔ لیکن مملکتِ ہند میں امن و امان قائم ہوتے ہی، سرکار نے میرزا صاحب کو رامپور تشریف لانے کی دعوت دی۔ نواب صاحب کا پہلا دعوتنامہ مثل میں موجود نہیں ہے، لیکن مکتوب بنام صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر مورخہ ۲۵ مارچ سنہ ۵۸ء میں میرزا صاحب نے اپنے رامپور نہ آنے کے وجوہ تحریر کیے ہیں، اس لیے یقیناً پہلی دعوت ابتدای سنہ ۵۸ء میں دی گئی ہو گی۔ خود میرزا صاحب کے الفاظ "بعد فتح دہلی وہ ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے، میں عذر کرتا تھا،"(۲) سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے۔ ۲۵ نومبر سنہ مذکور کو سرکار نے پھر تحریر فرمایا:

"مشفقا! جو کہ مخلص کو اشتیاق حصول معانقہ اور مکالمہ آپ کا بدرجۂ کمال ہے، اور اب تشریف آوری آپ کی اس جگہ مناسب ہے، اس واسطے حوالہ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ دیدار فائض الانوار اپنے سے مخلص کو مسرور فرمایئے۔"(۳)

اس کے بعد ۲ فروری سنہ ۱۸۵۹ء کو سرکار نے سہ بارہ تحریر فرمایا:

"اور بھی حال وصول چٹھی سے اور یہ کہ آپ کا ارادہ تشریف آوری کا اس طرف کو کب ہے، مطلع فرمانا موجب مزید مسرور خاطر محبت آثار کا متصور ہے۔"(۴)

بعد ازاں ۱۳ ماہ اپریل سنہ ۵۹ء کو چوتھی بار تحریر فرمایا:

"حال تشریف آوری آپ کا اس طرف کو ابھی تک سامعہ نواز نہیں ہوا۔ اور دل صفا منزل مشتاق اور منتظر دریافت مسرور ملاقات کا ہے۔ اس واسطے حوالہ خامۂ اشتیاق نگار کے ہوتا ہے کہ آپ براہ عنایت کے زید تشریف فرمائی اس سمت سے، کہ کب تک ممکن الوقوع ہے، مطلع اور مطمئن فرمایئے۔"(۵)

(۱) مکاتیب: ۳۹ (۲) اردوی: ۲۸۳ (۳) مکاتیب: ۱۱ح۴ (۴) شمل نمبر ۱۵۳، صیغۂ احباب، عہد نواب فردوس مکاں (۵) مکاتیب: ۱۲ح۳

۲۰ مئی کو پانچویں مرتبہ لکھا:

"مشفقا! عرصۂ مدید ہوا کہ اتنک نو بد تشریف فرمائی آپ کی اس طرف کو سامعہ نواز نہیں ہوئی۔ اور آپ کہ انتظار مقدمۂ پنشن کا تحریر فرماتے ہیں، کیا خبر گیری مقدمۂ پنشن کی تشریف رکھنے آپ کے سے یہاں پر محتاج آ نہیں ہو سکتی؟ آپ براہ لطف اور مہربانی کے حال قصد تشریف آوری سے جلد مطلع اور مسرور فرمائیے گا کہ رفع انتظار ہو۔" (۱)

میرزا صاحب کا عذر

میرزا صاحب، مطلعِ سیاست صاف ہو جانے کے بعد، اپنی انگریزی پنشن کے اجرا کی سعی میں مصروف تھے۔ حکامِ انگریزی کی معدلت گستری و انصاف پژوہی کے بدل معترف تھے، اور اپنے آپ کو جرمِ بیوفائی و غداری سے قطعاً بری جانتے تھے، اس لیے حکام کی ہر دفتری حرکت اُن کی امید کو پیامِ کامیابی نظر آتی تھی۔ وہ روزانہ اس یقین کے ساتھ بیدار ہوتے، کہ آج پنشن کے اجرا کا حکم ہو جائے گا، اور میں شام تک قرض کے بار سے سبک دوش ہو سکوں گا۔ بسا اوقات اُن سے یہ موہوم خوشی ضبط نہیں ہوتی تھی اور احباب کو کامیابی کی منزل قریب آ جانے کی اطلاعیں تک دیدیتے تھے (۲) ایسی حالت میں کس طرح ممکن تھا کہ دلّی سے باہر چلے جاتے۔ چنانچہ یہی امروز و فردا دلّی چھوڑ کر رامپور آنے سے مانع رہے، اور اُنھوں نے ہر دعوت نامے کے جواب میں عذر کیا کہ پنشن کے وصول کا زمانہ قریب آگیا ہے، اس کو ادھورا چھوڑ کر نہیں آسکتا۔ اس سلسلے میں صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر کو تحریر کرتے ہیں:

"جناب نواب صاحب میرے محسن اور میرے قدردان اور میری امید گاہ ہیں میں اگر رامپور آؤں گا تو کہاں جاؤں گا۔ یہ جو آپ کہتے ہیں کہ تحکیم آنے میں تردد کیا ہے، تردد کچھ نہیں، توقف ہے۔ وجہ توقف کی یہ کہ میں نے اپنے پنشن کے باب میں چیف کمشنر بہادر کو درخواست دی تھی۔ وہاں سے صاحب کمشنر شہر کے درخواست حوالہ ہوئی۔ صاحب کمشنر نے

(۱) مثل نمبر ۲۵۲، صفحۂ احباب۔ (۲) اردو ئے معلی اور عود ہندی میں اس مضمون کے متعدد خطوط موجود ہیں۔

صاحب کلکٹر شہر سے کیفیت طلب کی ہے۔ ۔ ۔ ۔ بہر حال صاحب کمشنر شہر کیفیت صاحب کلکٹر سے طلب کر کر چیف کمشنر کے ساتھ پنجاب کو گئے ہیں۔ دیکھیے کیا آویں اور بعد ملاحظۂ کیفیت کیا حکم دیں۔ مگر تا صدور حکم میں یہاں سے کہیں جا نہیں سکتا۔ ہاں بعد ملنے حکم کے، خواہی دلخواہ ہو خواہی مخالف مدعا، دونوں صورت میں اپٹو آؤں گا۔" (۱)

نواب فردوس مکاں کے دعوت نامۂ مورخہ ۲۵ نومبر سنہ ۵۸ء کے جواب میں بھلا ہی عذر کا اعادہ کیا ہے۔ تحریر کرتے ہیں:

"میرے حاضر ہونے کو جو ارشاد ہوتا ہے، میں وہاں نہ آؤں گا، تو اور کہاں جاؤنگا۔ پنشن کے وصول کا زمانہ قریب آیا ہے۔ اس کو ملتوی چھوڑ کر کیونکر چلا آؤں؟ سنا جاتا ہے اور یقین بھی آتا ہے کہ جنوری آغاز سال ۵۹ عیسوی میں یہ قصہ انجام پائے۔ جس کو روپیہ ملنا ہے اوس کو روپیہ، جس کو جواب ملنا ہے اوس کو جواب ملجائے۔" (۲)

لیکن جنوری سنہ ۵۹ء بھی یونہی گزر گیا، تو انھوں نے اپنی صادق الاعتقادی میں اور وسعت پیدا کر لی، اور جب سرکار نے ۱۳ ماہِ اپریل سنہ مذکور کو چوتھی بار آمدِ رامپور کی دعوت دی، تو اُس کے جواب میں لکھا:

"پہلے خط میں یہ عرض کیا ہے کہ مجموع پنشداروں کی مثل مرتب ہے، اور ہنوز صدر کو روانا نہیں ہوئی۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر نے کلکتہ سے میرے پنشن کے کاغذ طلب کیے اور وہ کاغذ فہرست میں سے الگ ہو کر لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں ارسال ہوتے۔ وہاں سے کلکتہ کو بھیجے جائیں گے۔ پھر وہاں سے حکم منظوری پنجاب ہوتا ہوا یہاں آئیگا، اور یہاں مجکو روپیہ مل جائے گا۔ آج روپیہ ملا، کل میں نے آپ سے سواری اور باربرداری مانگی۔ آج سواری اور باربرداری پہنچی اور کل میں نے رامپور کی راہ لی۔" (۲)

(۱) مکاتیب: ۸۶ (۲) ایضاً: ۱۳

چھٹی دعوت

اس عذر کو سرکار نے اپنے محولۂ بالا فرمان مورخہ ۲۰ مئی میں تسلیم نہ فرمایا اور ہر فرمان میں اشتیاقِ ملاقات ظاہر فرماتے رہے، تا آنکہ سنہ ۵۹ء ختم ہونے کے قریب آگیا، اور پنشن کا معاملہ ہنوز لیت ولعل میں پڑا رہا۔ آخر سرکار نے ۱۶ دسمبر سنہ ۵۹ء کو پھر ارقام فرمایا:

"سابق میں چند مرتبہ درباب تشریف فرمائی یہاں کے متکلف ہوا ہوں، لیکن ابتک آپ نے سرور ملاقات بہجت آیات سے مسرور نہیں فرمایا۔ اب لازم اشتیاق کا یہ ہے کہ آپ تشریف شریف باسرع ازمنہ ارزانی فرمادیں، اور مخلص کو متشکر الطاف کا کریں۔"(۱)

میرزا صاحب اس عرصے میں نواب فردوس مکاں کے اخلاص اور اعانت کے بدل معترف ہو چکے تھے، اور یہ عزم کر کے، کہ مقدمۂ پنشن کے متفصل ہوتے ہی رامپور روانا ہو جائینگے، یوسف مرزا کو لکھا تھا:

"میں تو پنشن کے باب میں حکم اخیر سن لوں، پھر رامپور چلا جاؤں گا۔ جمادی الاول سے ذی الحجہ تک ۸ مہینے، اور پھر محرم سے سنہ ۱۲۷۷ سال شروع ہوگا۔ اس سال کے دو چار، حد دس گیارہ مہینے، غرض کہ اونیس بیس مہینے ہر طرح بسر کرنے ہیں۔ اس میں رنج و راحت و ذلت و عزت جو مقسوم میں ہے وہ پہنچ جائے۔ اور پھر "علی" "علی" کہتا ہوا ملک عدم کو چلا جاؤں۔ جسم رامپور میں اور روح عالم نور میں۔ یا علی! یا علی! یا علی!"(۲)

میرزا صاحب کا عزم سفر اور اُس کا مقصد

جب آغاز سنہ ۱۸۶۰ء میں گورنمنٹ نے مقدمۂ پنشن کا فیصلہ میرزا صاحب کی خواہش اور امید کے خلاف صادر کیا، تو اُنھوں نے حسبِ وعدہ سفرِ رامپور کی تیاری کی۔ اس سلسلے میں ہیجیر کو لکھتے ہیں:

"بعد فتح دہلی وہ (نواب فردوس مکاں) ہمیشہ میرے مقدم کے خواہاں رہتے تھے۔ میں عذر کرتا تھا۔ جب جنوری سنہ ۱۸۶۰ میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا، کہ جو اوپر لکھ آیا ہوں، تو میں آخر جنوری میں رامپور گیا۔"(۳)

(۱) مکاتیب: ۱۷ ح ۲ (۲) اردوی: ۵ ۳۴ (۳) ایضاً: ۳ ۲۸۳

نواب فردوس مکاں ایامِ غدر میں گورنمنٹ کے وفادار اور معاون رہے تھے۔ بنابریں انگریز حکام کی نظر میں اُن کی بڑی عزت و وقعت تھی۔ میرزا صاحب سے بھی اُن کے تعلقات بیحد پُرخلوص تھے، اس لیے مقدمہ خلاف فیصل ہونے کے بعد میرزا صاحب نے مناسب جانا کہ رامپور جائیں اور سرکار سے زبانی عرض کریں کہ گورنمنٹ سے میرا معاملہ صاف فرما دیجے۔ شیوتراین کو ۳ مارچ سنہ ۶۰ء کو رامپور سے لکھا ہے:

"میں حسب الطلب نواب صاحب کے دوستانہ یہاں آیا ہوں۔ اور اپنی صفائی گورنمنٹ سے بذریعہ ان کے چاہتا ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔" (۱)

اس کے علاوہ ایک اور واقعہ، جو قیامِ رامپور کے زمانہ میں پیش آیا، اس امر پر شاہد ہے کہ سفرِ رامپور سے میرزا صاحب کا مقصد "گورنمنٹ سے اپنی صفائی" تھی۔ ۱۴ فروری سنہ مذکورہ کو حکیم غلام نجف خاں کو تحریر کیا ہے:

"یہاں کا یہ حال ہے کہ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر آگرہ مراد آباد آیا چاہتے ہیں۔ مراد آباد یہاں سے بارہ کوس ہے۔ نواب صاحب دورے کو اپنے ملک کے گئے ہیں۔ دو چار دن میں پھر آئیں گے۔ اگر اون کی ملاقات کو مراد آباد جائیں گے، میں بھی ساتھ جاؤں گا۔ اگرچہ گورنر غرب و شمال کو دلی سے کچھ علاقہ نہیں، مگر دیکھوں، کیا گفتگو درمیان آتی ہے۔" (۲)

اگر میرزا صاحب کے پیشِ نظر گورنمنٹ سے صفائی نہ ہوتی، تو یہ جانتے ہوئے کہ غرب و شمال کے گورنر کو دلی سے کچھ واسطہ نہیں، سرکار کے ساتھ مراد آباد جانے کا تہیا نہ کرتے۔

دلی سے روانگی

میرزا صاحب نے ارادہ کیا کہ آخر جمادی الآخرہ میں دلی سے روانا ہوں، اور رجب المرجب کا چاند رامپور آکر دیکھیں۔ حسین مرزا کو سہ شنبہ ۳۱ دسمبر سنہ ۵۹ء کو لکھتے ہیں:

"رامپور زندگی میں میرا مسکن اور بعد مرگ میرا مدفن ہو لیا۔ جب تم لکھتے ہو کہ "للہ تم وہاں جاؤ!" تو مجھکو ہنسی آتی ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ ہلال ماہ رجب المرجب رامپور میں دیکھوں۔" (۳)

(۱) اردوی: ۳۸۰ (۲) ایضاً: ۳۲۹ (۳) ایضاً: ۳۲۹

اس خط کی تحریر سے ۱۹ دن کے بعد میرزا صاحب دلی سے روانا ہوے۔ دلی سے روانگی کی تاریخ کا ذکر متعدد خطوط میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً بنیر کو مجملاً لکھدیا ہے:

"جب جنوری سنہ ۱۸۶۰ میں گورنمنٹ سے وہ جواب پایا کہ جو اوپر لکھ آیا ہوں، تو میں آخر جنوری میں رامپور گیا۔" (۱)

رامپور سے واپس جاکر شیو نرائن کو مہینے کے ساتھ تاریخ بھی لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

۱۹ یا ۲۰ جنوری سنہ ۱۸۶۰ کتاب اور دونوں عرضیاں ولایت کو روانہ کرکے رامپور گیا ہوں۔" (۲)

لیکن آخر عمر میں میرزا صاحب کا حافظہ خراب ہوگیا تھا، اس لیے انھیں صحیح تاریخ یاد نہیں رہی۔ دراصل وہ ۱۹ جنوری سنہ ۶۰ کو دلی سے روانا ہوے تھے۔ چنانچہ ۲۱ جنوری کو میرٹھ پہنچکر تفتہ کو لکھا ہے:

"بھائی! میں نے دلی کو چھوڑا، اور رامپور کو چلا۔ پنجشنبہ ۱۹ کو مرادنگر اور جمعہ ۲۰ کو میرٹھ پہنچا۔ آج شنبہ ۲۱ کو بھائی مصطفےٰ خاں کے کہنے سے مقام کیا۔ یہاں سے یہ خط تم کو لکھ کر بھیجا۔ کل شاہجہانپور پرسوں گڑھ مکیشر رہوں گا۔ پھر مرادآباد ہوتا ہوا رامپور جاؤں گا۔" (۳)

اسی تاریخ کو حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

"یہاں میں تم سے رخصت ہوکر اس دن مرادنگر میں رہا۔ دوسرے دن، یعنی جمعہ کو، میرٹھ پہنچا۔ نواب مصطفےٰ خاں نے ایک دن رکھ لیا۔ آج شنبہ ۲۱ جنوری یہاں مقام ہے۔ تو بیٹھ گئے ہیں۔ بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ مفت کا کھانا ہے۔ خوب پیٹ بھر کر کھاؤں گا۔ کل شاہجہانپور، پرسوں گڑھ مکیشر، رہوں گا۔ مرادآباد سے پھر تم کو خط لکھوں گا۔" (۴)

ان تمام تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعرات کے دن صبح کے وقت ۱۹ جنوری سنہ ۶۰ کو میرزا صاحب دلی سے روانا ہوے۔

(۱) اردوی: ۲۸۳ (۲) ایضاً: ۲۸۲ (۳) ایضاً: ۸۶ (۴) ایضاً: ۲۳۲

اخفائے حال

روانگی سے پہلے میرزا صاحب نے کسی مصلحت کے ماتحت مختلف اصحاب سے مختلف مقامات کے سفر کا اظہار کیا تھا۔ میرٹھ پہنچکر اخفا کی ضرورت نہ سمجھی، اور وہیں سے حکیم غلام نجف خاں کو لکھا:

"ہاں، بھائی! میں از روی مصلحت اپنے کو مقامات مختلف کا عازم کہہ آیا ہوں۔ اب جو شخص تم سے پوچھا کرے، اوس سے پردہ نہ کرنا اور صاف کہدینا کہ رامپور کو گیا ہے۔ یعنی سب کو معلوم ہو جائے، اور کوئی تذبذب میں نہ رہے۔" (۱)

اس مکتوب میں میرزا صاحب نے اُس مصلحت کو ظاہر نہیں کیا، جو مقامِ سفر کے اخفا کی بنا تھی۔ لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ کسی سیاسی مصلحت سے ایسا کیا ہوگا، جو کم از کم یہ ہو سکتی ہو کہ اُس وقت تک گورنمنٹ نے میرزا صاحب کی پنشن اور دربار و خلعت بحال کر کے اُن کی پوزیشن تسلیم نہیں کی تھی، نیز انھیں غدر کے بعد کسی ریاست کے سفر کا یہ پہلا اتفاق تھا، اس لیے یہ خطرہ لاحق ہوا ہوگا کہ کہیں رامپور جانے سے روک نہ دیے جائیں، یا یہ کہ کوئی حاسد سرکار کو یہ نہ لکھدے کہ میرزا صاحب گورنمنٹ کی نظر میں ابھی مشتبہ ہیں، انھیں اپنی ریاست میں نہ آنے دیجے۔

منازلِ سفر

۱۹ جنوری کی صبح کو دلی سے روانا ہو کر میرزا صاحب نے شام کو مراد نگر میں قیام کیا۔ دوسرے دن جمعے کو میرٹھ پہنچے۔ ایک دن نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفتہ کے یہاں ٹھہر کر اتوار کو شاہجہانپور اور پیر کو گڑھ مکتیسر میں اُترے۔ یہاں سے مراد آباد تک کے منازل کا پتا نہیں، جو منگل اور بدھ دو دن میں طے کیے ہوں گے؛ لیکن یہ یقینی ہے کہ آخری منزل مراد آباد تھی، یہ تمام تفصیل مرزا تفتہ اور حکیم غلام نجف خاں کے نام کے مکاتیب میں ابھی گزر چکی ہے۔

(۱) اردوی: ۲۳۳

رفقائے سفر

اس سفر میں عارف مرحوم کے دونوں لڑکے، باقر علی خاں اور حسین علی خاں، عنایت اللہ خادم، اور ایک دو اور ملازم میرزا صاحب کے ہمرکاب تھے۔ لڑکوں کا ذکر متعدد خطوط میں کیا گیا ہے۔ یہاں صرف اُس خط کا اقتباس کافی ہوگا، جس میں تمام ہمراہیوں کا ذکر ہے۔ میرزا صاحب حکیم غلام نجف خاں کے خط کے آخر میں لکھتے ہیں:

"لڑکے بھی تندرست، آدمی بھی توانا؛ مگر ہاں ایک عنایت اللہ دو دن سے کچھ بیمار ہے۔ خیر اچھا ہو جائے گا" (۱)

ورود رام پور کی تاریخ

غالباً میرزا صاحب جمعرات کے دن مراد آباد پہنچے، اور وہاں رات کو آرام کرکے دوسرے دن جمعے کو رامپور وارد ہوئے۔ جمعہ ۳ فروری کو رامپور سے حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

"آج تک، کہ جمعہ آٹھواں دن میرے پہنچے کو ہے، کچھ کلام نہیں ہوا" (۲)

اس سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے، کہ میرزا صاحب جمعے کے دن رامپور پہنچے؛ لیکن مرزا نفتہ اور حکیم غلام نجف خاں کو میرٹھ سے جو خطوط لکھے ہیں، اُن میں میرزا صاحب نے جمعے کو ۲۰ اور شنبے کو ۲۱ جنوری تاریخ تحریر کی ہے۔ اس حساب سے جس جمعے کو میرزا صاحب نے سرزمینِ رامپور پر قدم رکھا، ۲۷ جنوری سنہ ۶۰ء تاریخ انگریزی ہونی چاہیے۔

قیام گاہ

رامپور پہنچکر میرزا صاحب نے سرکار کی خاص کوٹھی میں قیام کیا۔ لڑکے میرزا صاحب کے ساتھ آئے تھے۔ یہاں چار دن گزارنے کے بعد از روی احتیاط جداگانہ مکان کی خواہش کی۔ سرکار نے ایک مکان، جو تین چار حویلیوں پر مشتمل تھا، قیام کے لیے عطا فرمایا۔ میرزا صاحب نے نفتہ کے پتہ پوچھنے پر جو خط لکھا ہے، اُس میں فرماتے ہیں:

(۱) اردوئے معلی ۲۲۹ (۲) ایضاً ۲۲۸

"پہلے یہ تو بتاؤ کہ رامپور میں مجھے کون نہیں جانتا۔ کہاں مولوی وجیہ الزماں صاحب، کہاں میں؟ اون کا مسکن میرے مسکن سے دور، پھر درِ دولت رئیس کہاں اور میں کہاں؟ چار دن والی شہر نے اپنی کوٹھی میں اوتارا۔ میں نے مکان جداگانہ مانگا۔ دو تین حویلیاں برابر برابر مجھ کو عطا ہوئیں۔ اب اُس میں رہتا ہوں۔ بسبب اتفاق ڈاک گھر مسکن کے پاس ہے۔ ڈاک منشی آشنا ہو گیا ہے۔ برابر دلی سے خط چلے آتے ہیں۔ صرف رامپور کا نام اور میرا نام محلہ کی اور عرف کی حاجت نہیں۔ بلکہ درِ دولت اور مولوی صاحب کے نشان سے شاید خط تلف ہو جائے۔" (۱)

حکیم غلام نجف خاں کو لکھا ہے:

"مکان کا پتہ ضرور نہیں۔ ڈاک گھر میرے گھر کے پاس۔ ڈاک منشی میرا آشنا۔۔۔۔۔ ایک مکان، کہ وہ تین چار مکانوں پر مشتمل ہے، رہنے کو ملا ہے۔" (۲)

مجروح کو تحریر کیا ہے:

"تمہارا خط پہنچا۔ تردد عبث۔ میرا مکان ڈاک گھر کے قریب اور ڈاک منشی میرا دوست ہے۔" (۳)

مکان کی تحقیق

بزرگانِ شہر سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ محلہ راجدارہ کی اُس شاہراہ پر، جو خاص باغ پیلس کو جاتی ہے، مفتی احمد یار خاں صاحب کے مکان کے محاذ میں ڈاک خانہ تھا اور میرزا صاحب نے اُس کے متصل مکان میں قیام کیا تھا۔ اس مکان میں آجکل ایک لوہار رہتا ہے۔ چونکہ یہ مکان اردو ادب کے نیرِ رخشاں کا فرودگاہ رہ چکا ہے اس لیے عالی مرتبت صاحب چیف منسٹر بہادر کے حسب الحکم اسپر پتھر کا کتبہ لگایا جا رہا ہے۔

مہمانداری

میرزا صاحب کے لیے ابتداءً سرکاری بادرچی نے کھانا پکایا۔ چنانچہ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

(۱) اردوئے معلی: لاہور اڈیشن، ۱: ۳۸۱ (۲) ایضاً: ۲۷۸ (۳) ایضاً: ۱۶۹

"کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا ہے، اور وہ سب کو کافی ہوتا ہے۔ غذا میرے بھی خلاف طبع نہیں۔" (۱)

مجروح کے خط میں بھی سرکاری مہمانداری کا ذکر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"یہاں کا حال سب طرح خوب ہے، اور صحت مرغوب ہے۔ اس وقت تک مہمان ہوں۔" (۲)

چند دن کے بعد کھانے کے سو روپے ماہوار مقرر کر دیے گئے۔ دلی جا کر میرزا صاحب نے مجروح کو لکھا ہے:

"اب جو میں وہاں گیا، تو سو روپیہ مہینا بنام دعوت اور دیا۔ یعنی یہ سو روپے لوں تو دو سو روپیہ مہینا پاؤں، اور دلی رہوں تو سو روپیہ۔" (۳)

آب و ہوائی رام پور

رامپور کی آب و ہوا میرزا صاحب کے مزاج کے موافق ثابت ہوئی۔ آخر رامپور کے ۸ دن بعد حکیم غلام نجف خاں کو لکھا ہے:

"پانی کا شکر کس منہ سے ادا کروں! ایک دریا ہے کوسی۔ سبحان اللہ! اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت صاف ہے، سبک، گوارا، ہاضم، مسیل النفوذ۔ اس آٹھ دن میں قبض و انقباض کے صدمے سے محفوظ ہوں۔ صبح کو بھوک خوب لگتی ہے۔ لڑکے بھی تندرست، آدمی بھی توانا، مگر ہاں، ایک عذاب ہے دو دن سے کچھ بیمار ہے۔ خیر اچھا ہو جائے گا۔" (۴)

رامپور ہی سے مجروح کو تحریر کیا ہے:

"یہ رامپور ہے، دارالسرور ہے، جو لطف یہاں ہے، وہ اور کہاں ہے، پانی سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے، اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آب حیات کی کوئی صورت اس میں ملی ہے۔ خیر مگر یوں بھی ہے، تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے، اتنا شیریں کہاں ہوگا؟" (۵)

(۱) اردی: ۳۲۹ (۲) ایضاً: ۳۲۹ (۳) ایضاً: ۱۹۷ (۴) ایضاً: ۲۲۵ (۵) ایضاً: ۲۲۵

ملاقات اور تعظیم و توقیر

نواب فردوس مکاں کا اخلاق میرزا صاحب کی امید کے مطابق ثابت ہوا۔ سرکار نے بروقتِ ملاقات احباب کی طرح معانقہ کیا، اور احباب میں تعظیم و توقیر کی جو رسم ہے، اُس کو ملحوظ رکھا۔ میرزا صاحب نے خود نذر پیش کرنے کے عوض دونوں لڑکوں سے نذر دلوائی۔ سرکار کے اس برتاؤ کے بارے میں مجروح کو لکھتے ہیں:

"تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں ہے۔" (۱)

بھازاں ولی جا کر لکھا ہے:

"ملاقات بھی دوستانہ رہی۔ معانقہ، تعظیم جس طرح احباب میں رسم ہے۔ وہ صورت ملاقات کی ہے۔ لڑکوں سے میں نے نذر دلوادی تھی، بس۔" (۱)

اسی سلسلے میں رامپور سے حکیم غلام نجف خاں کو تحریر کیا ہے:

"اب میرا حال سنو۔ تعظیم و توقیر بہت۔ ملاقاتیں تین ہوئی ہیں۔" (۲)

ابھی گفتگو نہیں ہوئی

اگرچہ نواب فردوس مکاں نے جولائی سنہ ۵۹ء سے میرزا صاحب کو سو روپے ماہوار بطور امداد عطا فرمانا شروع کر دیے تھے، جو اُنھیں بذریعۂ ہنڈوی ماہ بماہ ارسال ہوا کرتے، لیکن جب میرزا صاحب رامپور تشریف لائے، اور چند روز تک خدمت اور معاوضے کے بارے میں سرکار سے رو در رو گفتگو نہیں ہوئی، تو اُنھیں مختلف خطرات پیدا ہوئے۔ خدمت اور ماہانے کے خطرے کو حکیم غلام نجف خاں کے نام کے مکتوب میں اس طرح ظاہر کیا ہے:

"ہنوز کچھ گفتگو درمیان نہیں آئی۔ میں خود ان سے ابتدا نہ کروں گا۔ وہ بھی مجھ سے بالمشافہ نہ کہیں گے۔ مگر بواسطۂ کارپردازانِ سرکار دیکھوں کیا کہتے ہیں، اور کیا مقرر کرتے ہیں۔" (۳)

یہ خط ۳ فروری کو لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۴ فروری کو پھر لکھتے ہیں:

(۱) اردوئے معلی: ۱۹۳ (۲) ایضاً: ۲۲۸

" یہاں کا رنگ نواب صاحب کے آنے پر جو ہوگا، اور جو قرار پائے گا، وہ مفصل تم کو لکھوں گا۔" (۱)

مجروح کو بھی دبے الفاظ میں لکھا ہے:

" اس وقت تک مہمان ہوں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔" (۲)

رامپور کی اقامت کے خطرے کو تفتہ کے خط میں ظاہر کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

" دوسری بات جو تم نے لکھی ہے، وہ بھی مطابق واقع و مناسب حال نہیں۔ اگر اقامت قرار پائی، تو تم کو بلا لوں گا۔" (۳)

۱۴ فروری کو تفتہ کے خط کے جواب میں پھر لکھا ہے:

" میری جان! آخر لڑکے ہو۔ بات کو نہ سمجھے۔ میں اور تفتہ کا اپنے پاس ہونا غنیمت نہ جانوں۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ بشرط اقامت بلا لوں گا۔ اور پھر لکھتا ہوں کہ اگر میری اقامت یہاں کی ٹھہری، تو بے تمہارے نہ رہونگا، زنہار! نہ رہونگا۔" (۴)

سہ بارہ یکم مارچ کو تحریر کرتے ہیں:

" بالفعل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر مراد آباد اور وہاں سے رامپور آئیں گے۔ بعد اون کے جانے کے کوئی طور اقامت، یا عدم اقامت کا ٹھہرے گا۔ منظور مجھ کو یہ ہے کہ اگر یہاں رہنا ہوا، تو فوراً تم کو بلا لوں گا۔" (۵)

تعینِ خدمت و اقامت

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار یہی طے پایا کہ میرزا صاحب رامپور کی اقامت اختیار کرنے پر مجبور نہیں ہیں۔ البتہ رامپور آکر رہیں گے، تو دعوت کے سو روپے ماہوار مزید عطا ہوں گے، اور دلی رہیں گے تو صرف سو روپے تنخواہ ملے گی۔ اس تصفیے کے متعلق میرزا صاحب نے مجروح کو لکھا ہے:

" قرارداد یہ ہے کہ نواب صاحب جولائی سنہ ۱۸۵۹ سے، کہ جس کو یہ دسواں مہینا ہے، سو روپیہ مجھے ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ اب جو میں وہاں گیا، تو سو روپیہ مہینا بنام دعوت

(۱) اردوئے معلی: ۲۳۰ (۲) ایضاً: ۲۱۹ (۳) ایضاً ۲۷۲ لاہور ایڈیشن (۴) ایضاً: ۳۷۰ (۵) ایضاً: ۷۹

اور دیا۔ یعنی رامپور رہوں تو دو سو روپیہ مہینا پاؤں، اور دلی رہوں تو سو روپیہ۔ بھائی، سو دو سو میں کلام نہیں۔ کلام اس میں ہے کہ نواب صاحب دو سو نہ دیتے ہیں۔۔۔۔ بہرحال غنیمت ہے۔ رزق کے اچھی طرح ملنے کا شکر چاہیے۔ کمی کا شکوہ کیا۔" (۱)

تفتہ کو تحریر کیا ہے:

"وہ سو روپیہ مہینا یہاں رہوں، وہاں رہوں، خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔" (۲)

جنون بریلوی کو لکھا ہے:

"حق تعالیٰ والیٔ رامپور کو صد و سی سال سلامت رکھے! اون کا عطیہ ماہ بماہ مجھکو پہنچتا ہے۔ کرم گستری اور استاد پروری کر رہے ہیں۔ میرے رنج سفر اوٹھانے کی اور رامپور جانے کی حاجت نہیں۔" (۳)

علائی کو قدرے تفصیل سے لکھتے ہیں:

"رئیس کی طرف سے بطریق وکیل محکمۂ کمشنری میں معین نہیں ہوں۔ جس طرح اصلاع کے فقرا کے وجہ معاش مقرر کر دیتے ہیں، اسی طرح اس سرکار سے میرے واسطے مقرر ہے۔ ہاں، فقیر سے دعای خیر اور مجھ سے اصلاح نظم مطلوب ہے۔ چاہوں دلی رہوں چاہوں اکبر آباد، چاہوں لاہور، چاہوں ہردوار۔" (۴)

لڑکوں کی شرارت

رامپور کی آب و ہوا کی موافقت اور سرکار کی تعظیم و توقیر کے باعث سے میرزا صاحب زیادہ قیام کرنا چاہتے تھے۔ لیکن باقر علی خاں اور حسین علی خاں ساتھ تھے۔ میرزا صاحب سے ان کا دل بہلنے کے خیال سے طفلانہ کھیل کود کے تمام لوازمات مہیا کر دیے تھے۔ اس پر بھی یہ برابر اُن کے سکون و آرام میں خلل ڈالتے رہے، چنانچہ ۱۴ فروری کو میرزا صاحب حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

"لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں۔ کبھی میرا دل بہلاتے ہیں، کبھی مجھکو ستاتے ہیں۔ بکریہ

(۱) اردو: ۱۶۲ (۲) ایضاً ۵۴ (۳) ایضاً: ۲۱۱ (۴) ایضاً ۲۰۴

کبوتر، بٹیریں، تکل، کنکوا سب طعام درست ہے۔" (۱)

اپنے ارادۂ قیام اور ان کی شرارت کے متعلق یوسف مرزا صاحب کو تحریر کرتے ہیں:

"مجھکو لڑکوں نے بہت تنگ کیا، ورنہ چند روز اور رامپور میں رہتا۔" (۲)

مجروح کو لکھا ہے:

"لڑکوں کو ساتھ لے گیا تھا۔ وہاں انھوں نے میرا ناک میں دم کر دیا۔ تنہا بھیجنے میں وہم آیا، کہ خدا جانے اگر کوئی امر حادث ہو تو بدنامی عمر بھر رہے۔ اس سبب سے جلد چلا آیا؛ ورنہ گرمی برسات وہاں کاٹتا۔ اب بشرط حیات جریدہ بعد برسات جاؤں گا، اور بہت دنوں تک یہاں نہ آؤں گا۔" (۳)

دلی کو واپسی

لڑکوں کی شرارت سے تنگ آکر میرزا صاحب نے برسات تک کے ارادۂ قیام رامپور کو فسخ کر دیا۔ سرکار نے ہر چند روکا اور آموں کا لالچ دیا، لیکن میرزا صاحب نہ رکے اور آخر مارچ مطابق آخر شعبان میں دلی کو روانا ہو گئے۔ رامپور سے روانگی کی تاریخ بھی میرزا صاحب نے متعدد خطوط میں تحریر کی ہے۔ قاضی عبدالجمیل خیون بریلوی کو لکھتے ہیں:

"سال گزشتہ مہینوں میں رامپور تھا۔ مارچ ۱۸۶۰ء میں یہاں آگیا ہوں۔" (۴)

تفتہ کو لکھتے ہیں:

"یہاں، میں جو آخر جنوری کو رامپور جا کر آخر مارچ میں یہاں آگیا ہوں، تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔" (۵)

مجروح کو تحریر کرتے ہیں:

"میر مہدی! تم میری عادت کو بھول گئے۔ ماہ مبارک رمضان میں کبھی مسجد جامع کی تراویح ناغہ ہوئی ہے؟ میں اس مہینے میں رامپور کیونکر رہتا؟ نواب صاحب مانع رہے اور بہت منع کرتے رہے۔ برسات کے آموں کا لالچ دیتے رہے۔ مگر، بھائی،

(۱) اردو، ۲۲۹ (۲) ایضاً ۲۲۹ (۳) ایضاً: ۱۶۱ (۴) ایضاً: ۲۱۱، دعود: ۱۹۶ (۵) اردو: ۵۴

میں ایسے انداز سے چلا کہ چاند رات کے دن یہاں آ پہنچا۔ یکشنبہ کو غرۂ ماہِ مقدس ہوا۔"(۱)

قدر بلگرامی کو سہ شنبہ ۱۳ مارچ سنہ ۶۰ء کو لکھا ہے:

"اب جو خط بھیجیے، دلی کو بھیجیے گا، کہ میں اس مہینے میں ادھر کو جاؤں گا۔ رویت ماہ صیام۔ اغلب ہے کہ دلی ہی میں ہو۔" (۲)

ان خطوط سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب آخرِ شعبان سنہ ۱۲۷۶ھ مطابق آخرِ مارچ سنہ ۱۸۶۰ء میں رامپور سے روانا ہو کر ۳۰ شعبان کو دلی پہنچے، اور وہاں پہنچکر رمضان المقدس کا چاند دیکھا۔ لیکن انگریزی و ہجری تاریخیں ابھی متعین نہیں ہوئی ہیں۔ انگریزی تاریخ کے بارے میں شیو نرائن کو رامپور سے لکھتے ہیں:

"اب میں شنبہ کے دن ۱۷ مارچ کو دلی روانا ہونگا۔" (۳)

یوسف مرزا کو ۹ رمضان مطابق ۲ اپریل کو ہجری تاریخ کے متعلق تحریر کیا ہے:

"میں ۲۳ شعبان کو رامپور سے چلا اور ۳۰ شعبان کو دلی پہنچا۔ اسی دن چاند ہوا۔" (۴)

میرزا صاحب نے اس خط میں رمضان کی نویں تاریخ کو اپریل کی دوسری تاریخ سے مطابق لکھا ہے، اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس سال رمضان کا چاند ۳۰ کا ہوا تھا۔ اس حساب سے ۲۳ شعبان سنہ ۱۲۷۶ھ ۱۷ مارچ سنہ ۱۸۶۰ء کے مطابق، اور ۳۰ شعبان سنہ مذکورہ ۲۴ مارچ سنہ ۶۰ء کے مطابق ہوگی۔ لہذا میرزا صاحب کی رامپور سے روانگی کی تاریخ ۲۳ شعبان سنہ ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۷ مارچ سنہ ۶۰ء اور دلی میں ورود کی تاریخ ۳۰ شعبان سنہ ۱۲۷۶ھ مطابق ۲۴ مارچ سنہ ۶۰ء قرار پاتی ہے۔

مراد آباد میں قیام

سرسید کہتے تھے کہ جب میں مراد آباد میں تھا، اُس وقت میرزا صاحب نواب یوسف علی خاں مرحوم سے ملنے کو رامپور گئے تھے۔ اُن کے جانے کی تو مجھے خبر نہیں ہوئی۔ مگر جب دلی کو واپس جاتے تھے، میں نے سنا کہ وہ مراد آباد میں سرائے میں آکر ٹھہرے ہیں۔ میں فوراً سرائے میں پہنچا، اور مرزا صاحب کو مع اسباب اور تمام ہمراہیوں

(۱) اردو ی: ۱۶۱ (۲) ایضاً: ۴۰۶، لاہور ایڈیشن (۳) اردو ی: ۳۸۰ (۴) ایضاً: ۳۴۴

اپنے مکان پر لے آیا۔ ظاہر اجب سے کہ سرسید نے تقریظ کے چھاپنے سے انکار کیا تھا، وہ میرزا سے اور میرزا اُن سے نہیں ملے تھے، اور دونوں کو حجاب دامنگیر ہوگیا تھا، اور اس لیے میرزا نے مراد آباد آنے کی اُن کو اطلاع نہیں دی تھی۔ الغرض جب مرزا سرائے سے سرسید کے مکان پر پہنچے، اور پالکی سے اُترے، تو ایک بوتل اُن کے ہاتھ میں تھی۔ اُنھوں نے اُس کو مکان میں لاکر ایسے موقع پر رکھدیا جہاں ہر ایک آتے جاتے کی نگاہ پڑتی تھی۔ سرسید نے کسی وقت اُس کو وہاں سے اُٹھاکر اسباب کی کوٹھری میں رکھدیا۔ میرزا نے جب بوتل کو وہاں نہ پایا، تو بہت گھبرائے۔ سرسید نے کہا: "آپ خاطر جمع رکھیے۔ میں نے اُس کو بہت احتیاط سے رکھدیا ہے۔" میرزا نے کہا: "بھئی مجھے دکھادو تم نے کہاں رکھی ہے۔" اُنھوں نے کوٹھری میں لیجاکر بوتل دکھادی۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے بوتل اُٹھاکر دیکھی، اور مسکراکر کہنے لگے کہ "بھئی، اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے۔ سچ بتاؤ، کس نے پی ہے۔ شاید اسی لیے تم نے کوٹھری میں لاکر رکھی تھی۔" حافظ نے سچ کہا ہے:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند — چوں بخلوت می روند، آں کارِ دیگر می کنند

سرسید ہنس کے چپ ہو رہے، اور اس طرح وہ رُکاوٹ، جو کئی برس سے چلی آتی تھی، رفع ہوگئی۔ میرزا دو ایک دن وہاں ٹھہر کر دلّی چلے آئے۔[1]

کل مدت قیام رامپور

میرزا صاحب کے بعض خطوط میں رامپور کے قیام کی کل مدت کا بھی ذکر آیا ہے۔ لیکن وہ تخمینی ہے۔ نیّر کو لکھتے ہیں:

"میں آخر چودری میں رام پور گیا۔ چھ سات ہفتہ وہاں رہ کر دلی آیا۔"[2]

تفتہ کو لکھتے ہیں:

"نواب یوسف علی خاں بہادر... بلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا، دو مہینے رہ کر چلا آیا۔"[3]

(۱) حیات جاوید: ۱، ۵۰، ح۔ اردو حساب منازلِ میرزا صاحب نے سرسید کے پاس دو دن کا دن قیام نہیں کیا تھا، بلکہ اسی دن وہاں سے روانا ہوئے تھے۔" (۲: اردو ۳: ۳۰۔ (۳) ایضاً ۵۴۱

علائی کو تحریر فرماتے ہیں:

"سال گزشتہ بیڑی کو زادیۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رامپور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔" (۱)

ان خطوط میں "چھ سات ہفتے، کچھ دن کم دو مہینے"، اور "دو ماہ" تین مختلف بیان ملتے ہیں۔ ان میں سے "کچھ دن کم دو مہینے" صحیح ہے، اس لیے کہ میرزا صاحب ایک ماہ بیس یوم رامپور میں رہے تھے۔

رامپور میں عدیم الفرصتی

قیامِ رامپور کے زمانے میں میرزا صاحب اس قدر عدیم الفرصت رہے کہ اکثر احباب کے محبت ناموں کا بروقت جواب تک نہ دے سکے۔ ایک خط میں اس کی وجہ تحریر فرماتے ہیں:

"از بسکہ یہاں کے حضرات مہربانی فرماتے ہیں اور ہر وقت آتے ہیں، فرصت شاید اوراق نہیں ملی۔" (۲)

نادر خاں شوخی رامپوری کا بیان ہے کہ رامپور میں میرزا صاحب کا یہ معمول تھا کہ جس دن نواب صاحب کے یہاں جاتے، سہ پہر کا دیوان خانہ ملتوی رہتا۔ ورنہ سہ پہر کو عام طور پر لوگوں سے ملاقات کرتے۔ ریاست میں جس قدر اہلِ علم و فن تھے میرزا صاحب کی موجودگی کو مغتنم تصور کرتے، اور بالالتزام آیا کرتے۔ شب کی صحبت خاص ہوتی تھی، کیونکہ یہ اُن کے کیف و سرور کا وقت ہوتا تھا۔ صرف انھیں لوگوں کو حاضری کا موقع دیتے، جن سے کسی طرح کا تکلف نہ ہوتا۔ (۳)

واپسی پر دلی میں چہ میگوئیاں

میرزا صاحب نے دلی سے روانا ہوتے وقت اپنا صحیح ارادۂ سفر ظاہر نہیں کیا تھا۔ جب رامپور سے واپس دلی پہنچے، تو حساد نے اس اخفا کا انتقام لیا، اور شہر میں واپسی کی

(۱) اردوئے معلی: ۱۰۴ (۲) ایضاً: ۷۳ (۳) غالب: ۱۳۴، طبع ثانی۔

خوب رای زنی کی گئی۔ میرزا صاحب کو اس رای زنی سے سخت اذیت پہنچی، اور اُنھوں نے شکایت آمیز لہجے میں تفتہ کو لکھا:

"میاں، میں جو آخر جنوری کو رامپور جا کر آخر مارچ میں یہاں آگیا ہوں تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک گروہ کا قول یہ ہے کہ یہ شخص والیِ رامپور کا استاد تھا، اور وہاں گیا تھا۔ اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا، تو بھی پانچ چار ہزار روپیہ سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نوکری کو گئے تھے مگر نوکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر رکھ لیا تھا۔ دو سو روپیہ مہینا کر دیا تھا۔ لفٹنٹ گورنر الہ آباد جو رامپور آئے، اور اُن کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہوا، تو اُنھوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اس کو جواب دو۔ نواب نے برطرف کر دیا۔" (۱)

یہ اربابِ دہلی کی آرا تھیں۔ اصل حقیقت کے متعلق فرماتے ہیں:

"یہ تو سب سن لیا۔ اب تم اصل حقیقت سنو۔ نواب یوسف علی خاں بہادر تیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھ برس سے میرے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیجا کرتے تھے۔ اب جولائی سنہ ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینا ماہ بماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے۔ اب میں گیا۔ دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ بشرطِ حیات بعد برسات کے پھر جاؤں گا۔ وہ سو روپیہ مہینا، یہاں رہوں، وہاں رہوں، خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔" (۱)

نواب فردوس مکاں کی علالت اور میرزا صاحب کا تردد

ماہِ اکتوبر سنہ ۱۸۶۴ء کے آخر یا نومبر کے آغاز میں نواب فردوس مکاں عارضۂ سرطان میں مبتلا ہوئے۔ میرزا صاحب کو کسی ذریعے سے اس کی اطلاع ملی، تو انھیں اپنے سخی داتا شاگرد کی علالت سے سخت تردد لاحق ہوا۔ چونکہ نواب صاحب اُن کے پورے خاندان کے مربی تھے، اس لیے میرزا صاحب کی بی بی اور حسین علی خاں بھی

(۱) اردوی معلی ۵۴۶

پریشانی کا شکار رہنے سے نہ بچے۔ اُس وقت تک میرزا صاحب کو یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ سرکار کو کیا مرض لاحق ہوا ہے۔ اس امر کی تحقیق کے لیے اُنھوں نے ۸ نومبر ۶۴ء کو انتہائی احتیاط کے ساتھ تحریر کیا:

"جب سے حضرت کی ناسازیٔ مزاج مبارک کا حال خارج سے مسموع ہوا ہے عالم الغیب گواہ ہے کہ مجھ پر اور میری بی بی پر اور میرے فرزند حسین علی خاں پر کیا گزر رہی ہے۔ ایک دن رات میرے گھر میں روٹی نہیں پکی، ہم سب نے فاقہ کیا۔ بارے وہ خبر وحشت اثر غلط نکلی، حواس ٹھکانے ہوئے۔ بالکل اطمینان جب ہوگا کہ آپ سے غسلِ صحت کی نوید سنوں گا، اور قطعۂ تاریخ غسلِ صحت لکھ کر بھیجوں گا۔ فی الحال اتنا چاہتا ہوں کہ اس خط کا جواب پاؤں اور حقیقتِ مرض سے آگہی حاصل ہو۔" (۱)

۱۲ نومبر کو سرکار کا نامۂ مبارک موصول ہوا۔ غالباً اُس میں نوعیت و کیفیتِ مرض کا ذکر نہ تھا، جس سے تشویش رفع ہوتی، اس لیے اُس کے جواب میں ۱۳ نومبر کو میرزا صاحب نے پھر لکھا:

"ابتدائی یکم نومبر سے ۱۱ تک عرض نہیں کر سکتا کہ لیل و نہار مجھ پر کیسے گزرے ہیں۔ راہ دور، میں رنجور، معہذا بے مقدور۔ اگر دلی سے رامپور تک تنکرم کی ڈاک جاتی ہوتی، تو میں یہاں ایک دم نہ ٹھہرتا، اور خدمت میں حاضر ہوتا۔ تار برقی بھی نہیں، جو صحت و عافیت کی خبر جلد حاصل ہو۔ ناچار از راہ اضطرار ۸ ماہ حال یعنی نومبر کو عریضہ روانہ کیا۔ خدا کی عنایت اور مرشد کامل، یعنی حضرت کی ہدایت نے اوس خط کے جواب آنے کی مدت سے پہلے مجھے گرداب اضطراب سے نکالا۔ کل ۱۲ نومبر کو نشاط آگیا۔ گویا میری جان بچ گئی۔ بلکہ ایک اور نئی جان میرے بدن میں آگئی۔ اب استدعا یہ ہے کہ حال ناسازیٔ مزاج اقدس مفصل معلوم ہو۔" (۲)

اس عریضے کے جواب میں ۱۹ نومبر کو سرکار نے تحریر فرمایا کہ "پھوڑا نکل آیا تھا، لیکن

(۱) مکاتیب: ۲۷ (۲) ایضاً: ۲۸

اب بحمداللہ افاقہ ہے۔" میرزا صاحب اس خبر سے بیحد مسرور ہوئے۔ اور ۲۷ نومبر کو اس کے جواب میں لکھا:

"کس زبان سے کہوں، اور کس قلم سے لکھوں کہ یہ ہفتہ عشرہ کس تردد و تشویش سے بسر ہوا ہے! ہر روز شام تک جانب دہنگراں رہتا، کہ ڈاک کا ہرکارہ آئے، اور حضرت کا نوازشنامہ لائے۔ بارے خدا کی مہربانی ہوئی، از سر نو میری زندگانی ہوئی، کہ کل چار گھڑی رات گئے ڈاک کے ہرکارے نے وہ عطوفت نامہ عالی دیا، جس کو پڑھکر روح تازہ رگ و پے میں دوڑ گئی۔ نیند کس کی؟ سونا کس کا؟ روشنی کے سامنے بیٹھا، اور اشعارِ تہنیت لکھنے لگا۔ سات شعر مع مادۂ حصولِ صحت جب لکھ لئے تب سویا۔" (۱)

غسلِ صحت کی تہنیت

سرکار کے خط سے صحت و افاقتِ مرض کی اطلاع مل گئی، لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ غسلِ صحت ہو چکا ہے یا نہیں، اور بصورتِ دیگر کونسی تاریخ اس تقریبِ سعید کے لیے مقرر ہوئی ہے۔ اس تحقیق کے لیے میرزا صاحب نے منشی سیلچند کو ۲۵ دسمبر کو لکھا:

"اگرچہ از روی خطوط حضور صحت و عافیت حضور معلوم ہوئی ہے، لیکن یہ کہیں سے نہیں سنا کہ غسلِ صحت کیا، یا کس دن کریں گے۔ آپ سے یہ فقیر کا سوال ہے کہ مجھکو لکھیئے کہ حضرت غسل کس دن فرمائیں گے۔ اور اگر موافق میری آرزو کے نہا چکے ہوں تو غسل کی تاریخ سے اطلاع دیجیے۔" (۲)

منشی صاحب نے جواباً لکھا کہ ابھی غسلِ صحت نہیں فرمایا ہے۔ غالباً رمضانِ مبارک میں یہ تقریب عمل میں آئے گی۔ میرزا صاحب کو ۱۴ جنوری سے قبل سرکار کا نامۂ صحت مل چکا تھا، اور وہ اس عرصے میں قصیدۂ تہنیت بھی ارسال کر چکے تھے۔ اس لیے التوارِ تاریخِ غسل پر ۱۹ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء کو پھر منشی صاحب کو لکھا:

"یہ جو میں نے قصیدۂ تہنیت لکھ کر بھیجا ہے، منشا اس کا یہ ہے کہ شاہ کبیرالدین صاحب

(۱) مکاتیب: ۱۲۹، بقطعۂ تاریخ اسی صفحے کے حاشیہ ۱۱ میں ملاحظہ ہو (۲) ایضاً: ۱۰۹

رامپور سے آئے، اور انھوں نے کہا کہ نواب صاحب جمعہ کے دن ساتویں تاریخ شعبان کو نہائیں گے۔ اب تمھاری تحریر سے معلوم ہوا، کہ ماہ آئندہ یعنی (رمضان) میں نہائیں گے۔ خیر، وہ کاغذ تو حضور کی نظر سے گزرے گا۔ اگر موقع پاؤ تو حضور میں یہ ماجرا عرض کر دینا کہ میں نے بموجب روایت شاہ کبیرالدین کے اس کے ارسال میں جلدی کی ہے۔" (۱)

غسلِ صحت کا جشن ماہِ عید میں منایا جانا تجویز ہوا۔ لیکن ابھی مرض قدرے باقی تھا، اور رامپور سے جس قدر سرکاری تحریریں جاتی تھیں، اُن میں مزاج کی کیفیت کا مذکور نہیں ہوتا تھا، اس لیے میرزا صاحب نے ۱۴ مارچ سنہ ۶۵ء کو منشی صاحب سے پھر استفسار کیا:

"منشی صاحب! عجب اتفاق ہے کہ حضور اپنے خط میں اپنے مزاج مبارک کا حال کچھ نہیں لکھتے، اور میرا دھیان لگا ہوا ہے۔ خدا کے واسطے! تم مفصل حال لکھو کہ کیا عارضہ باقی ہے، اور صورت کیا ہے۔ دربار بدستور ہوتا ہے یا نہیں؟" (۲)

منشی صاحب کا جواب مثل میں موجود نہیں، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے مرض کے متعلق کیا لکھا۔ لیکن ۲۳ شوال سنہ ۱۲۸۱ھ (۲۲ مارچ سنہ ۱۸۶۵ء) کو میرزا صاحب نے اپنا فارسی تہنیت نامہ ارسال کیا ہے، جو صفحہ ۴۱ پر درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخِ مذکورہ تک میرزا صاحب کو صحت کی اطلاع تھی۔

عودِ مرض اور وفات

لیکن مادۂ مرض کا بالکل استیصال نہیں ہوا تھا۔ کسی معمولی بے احتیاطی نے مادے کو دوبارہ چھیڑ دیا، اور سرکار پر از سرِ نو مرض کا حملہ ہو گیا۔ یہ حملہ اتنا شدید تھا کہ اطبا مجبور ہو گئے، اور حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی، تا آنکہ یومِ جمعہ ۲۴ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۱ھ (۲۱ اپریل سنہ ۱۸۶۵ء) کو نواب فردوس مکاں رہگرائے عالمِ بقا ہوئے، اور میرزا صاحب کے ہاں قیامتِ صغریٰ کا منظر نظر آنے لگا۔

(۱) مکاتیب: ۱۰۹

خلد آشیاں کی تخت نشینی اور میرزا صاحب کا وظیفہ

نواب فردوس مکاں کے بعد، نواب خلد آشیاں نے مسندِ آبائی پر قدم رنجہ فرمایا۔ میرزا صاحب کا تعلق سرکار کی ذات سے تھا، اس لیے دورِ جدید میں اس کے ختم ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اس خطرے کا میرزا صاحب کو احساس ہوا اور انھوں نے فوراً تہنیت نامہ لکھا۔ سوءِ اتفاق سے یہ مکتوب مثل میں موجود نہیں، لیکن نواب خلد آشیاں نے یکم مئی سنہ ۶۵ء کو اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

"مشفقا! آنچہ مشاہرۂ آن کرمفرما از عہد نواب صاحب و قبلہ فردوس مکان مقرر است انشاء اللہ تعالیٰ، بدستور جاری ماندہ، حسب ضابطہ پیامی خدمت رسیدہ خواہد ماند۔" (۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے تہنیت کے ساتھ اپنے وظیفے کے متعلق بھی کوئی درخواست کی تھی۔ یہ خواہش معرضِ قبول تک پہنچی، اور وظیفہ بدستور جاری رہا۔ اس سلسلے میں میرزا صاحب نے ۳۰ جولائی کو سیاح کو لکھا ہے:

"اپریل کا روپیہ رئیس حال سے میں نے پایا۔" (۲)

لیکن اس مکتوب سے ۲۴ روز قبل بخیر کو قدرے تفصیلاً تحریر فرمایا تھا:

"والیٔ رامپور کو خدا سلامت رکھے! اپریل مئی ان دو مہینوں کا روپیہ موافق دستورِ قدیم آیا۔ جون ماہ گزشتہ کا روپیہ خدا چاہے تو آجائے۔ آج جمعہ، جولائی ہے۔ معمول یہ ہے کہ دسویں بارھویں کو رئیس کا خط مع ہنڈوی آیا کرتا ہے۔" (۳)

تہنیت نامے کا امید افزا جواب پاکر، میرزا صاحب نے قصیدۂ مبارکباد ارسال کیا۔ یہ بھی مثل میں موجود نہیں، لیکن میں نے عودِ ہندی سے عریضۂ نمبر ۴۶ کے حاشیے میں نقل کر دیا ہے۔ اس قصیدے کی پذیرائی موافقِ امید ہوئی، اور میرزا صاحب کو بڑھاپے کی تمام مجبوریوں کے باوجود سفرِ رامپور کے لیے آمادہ ہونا پڑا۔

نواب خلد آشیاں کا دعوتنامہ

میرزا صاحب نے اپنے ارادۂ سفر کی اطلاع میرزا داغ کو دی۔ انھوں نے کسی مناسب

(۱) مکاتیب: ۳۶ ج ۱ (۲) اردوئے معلی: ۷۰ (۳) ایضاً: ۲۹۰

موقع پر سرکار کے حضور میں ذکر کیا۔ سرکار نے ۱۱ جون سنہ ۶۵ء کو قصیدے کے ذکر کے بعد تحریر فرمایا:

"درینولا زبانی نواب مرزا عزم سامی باین طرف مسموع گشتہ موجب کمال مسرتہاست، چراکہ راقم نیز متمنی ملاقات شریف است۔ ادتعالی شب یلدای فراق را بزودی ہرچہ تمامتر بایام وصال مبدل گردانند۔" (۱)

اس دعوت کے بعد میرزا صاحب نے تقریباً چار ماہ توقف کیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ سرکار نے جشنِ تخت نشینی کے لیے دسمبر کا پہلا ہفتہ مقرر فرمایا تھا۔ میرزا صاحب نے اسی زمانے کو سفر کے لیے زیادہ مناسب خیال کیا، اور سرکار کو لکھا:

"حضرت کی خدمت میں نہ آؤں گا تو اور کہاں جاؤں گا؟ وہ آگ برس رہی ہے کہ طیور کے پر جل رہے ہیں۔ بعد آگ کے پانی برسے گا۔ سفر خصوصاً بوڑھے رنجور آدمی کو دونوں صورت میں متعذر۔ آفتاب میزان میں آیا، اور ہنگامۂ آتش و آب رفع ہوا، اور میں نے احرام بیت المعمور رامپور باندھا۔ انشاء اللہ العلی العظیم۔" (۲)

"ہنگامۂ آتش و آب" کے رفع ہو جانے کے بعد ماہِ اکتوبر سنہ ۶۵ء میں "احرامِ بیت المعمور رامپور" باندھنے کی نوبت آئی۔

سفر کی غرض

میرزا صاحب کے اس سفر کی غرض و غایت نواب فردوس کے انتقال کی تعزیت اور نواب خلد آشیاں کی مسند نشینی کی تہنیت تھی۔ شاکر کو سفر کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے:

"قبلہ و کعبہ! فقیر یا در رکاب ہے۔ سہ شنبہ چار شنبہ ان دونوں دنوں میں سے ایک دن عازم رام پور ہوگا۔ تقریب وہاں جانے کی رئیس مرحوم کی تعزیت اور رئیس حال کی تہنیت۔ دو چار مہینے وہاں رہنا ہوگا۔" (۳)

جنوں بریلوی کو رامپور سے تحریر فرمایا تھا:

(۱) مکاتیب: ۲۶ ح ۳ (۲) ایضاً: ۳۸ (۳) اردو ی: ۲۱۶، دعود: ۱۶۰ مؤخرالذکر میں "عازم رامپور ہونگا" ہے۔

پیرو مرشد! نواب صاحب کا وظیفہ خوار، گویا اس در کا فقیر تکیہ دار ہوں۔ مسند نشینی کی تہنیت کے واسطے رامپور آیا۔" (۱)

لیکن اس تعزیت و تہنیت کی تہ میں جو غرض پنہاں تھی، اُس کا اظہار مرزا اتفتہ کے خط میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"میں نڑکی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا۔ بھیک مانگنے آیا ہوں۔" (۲)

تاریخ روانگی

ابتداءً میرزا صاحب کا ارادہ تھا کہ سہ شنبہ یا چہارشنبہ ان دونوں میں سے ایک دن رامپور روانا ہوں گے۔ چنانچہ شاکر کو یہی لکھا بھی تھا۔ لیکن علائی کو یکم اکتوبر سنہ ۶۵ء کو لکھا:

"میاں! تم جانتے ہو کہ میں عازم رامپور تھا۔ اسباب مساعد ہو گئے۔ بشرط حیات جمعہ کو روانا ہونگا۔" (۳)

مگر ثاقب کے نام کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ہفتے کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے دلی سے روانا ہوئے۔ فرماتے ہیں:

"ہفتے کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ پلکنوے رہوں۔ وہاں قافلے کی گنجایش نہ پائی۔" (۴)

حکیم غلام نجف خاں کو مراد آباد پہنچکر جو خط لکھا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہفتے کو ماہِ اکتوبر کی، تاریخ تھی۔ فرماتے ہیں:

"بدھ کا دن پہر بھر دن چڑھا ہوگا کہ میں نقط پالکی پر مراد آباد پہنچا۔ ۱۰ جمادی الاول کی اور ۱۱ اکتوبر کی ہے۔" (۵)

حکیم احمد حسن مودودی کو صراحت سے لکھا ہے کہ

"ہفتم اکتوبر کو دلی سے رامپور کو روانا ہوا۔" (۶)

(۱) اردو ئے: ۲۰۸، ۲۰۹ (۲) اردو ئے: ۹۸ (۳) ایضاً: ۳۹۵ (۴) ایضاً: ۲۹۳ (۵) ایضاً: ۲۳۳
(۶) ایضاً: ۲۳۳

رفقائے سفر اور سواری

اس سفر میں میرزا صاحب کے ساتھ باقر علی خاں، حسین علی خاں، کلو، نیاز علی اور دو آدمی اور، کل ۶ نفوس تھے۔ میرزا صاحب نے پالکی میں اور دونوں لڑکوں نے کبھی رتھ اور کبھی گھوڑوں پر راستہ طے کیا۔ بقیہ چار آدمیوں اور سامانِ سرائی کے لیے دو گاڑیاں ہمراہ تھیں۔ حکیم غلام نجف خاں کو مونہ بالا خط میں لکھا ہے:

"میں فقط پالکی پر مراد آباد پہنچا... دونوں لڑکے دونوں گاڑیاں اور رتھ اور آدمی سب پیچھے ہیں۔"

ثاقب کے خط میں لکھا ہے:

"دونوں گھوڑے کوتل آگئے، دونوں لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں۔"

آدمیوں کے بارے میں رامپور سے روانگی کے وقت علائی کو لکھا ہے:

"آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی... دلی کو روانا ہوئے۔ دو آدمی میرے اون کے ساتھ گئے۔ کلو اور لڑکا نیاز علی، یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔" (۱)

کیفیت و مناظر سفر

میرزا صاحب نے دلی سے رامپور تک ۶ منزلیں طے کی تھیں۔ حکیم احمد حسن مودودی کو تحریر فرمایا ہے:

"ہفتم اکتوبر کو دلی سے رامپور کو روانا ہوا۔ بعد قطع منازل ستہ وہاں پہنچا۔" (۲)

ثاقب کو ان منازل کی تفصیل بتاتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"غازی آباد کا حال شاد علی سے سنا ہوگا۔ ہفتے کے دن دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ قصد یہ تھا کہ مکنوے رہوں۔ وہاں قافلے کی گنجایش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانا ہوا۔ دونوں برخوردار گھوڑوں پر سوار چلے چلے۔ چار گھڑی دن رہے میں ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو

(۱) اردو ئے: ۳۴۹ (۲) ایضاً: ۳۴۳۔

بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا۔...
آج میں نے تمہارے والد کی نصیحت پر عمل کیا۔ چار بجے پانچ کے عمل میں ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے بابو گنڈھ کی سرائے میں آپہنچا۔ چارپائی بچھائی، اوس پر بچھونا بچھا کر حقہ پی رہا ہوں، اور یہ خط لکھ رہا ہوں۔ دو نوں گھوڑے کوتل آگے دونوں لڑکے رتھ میں سوار آتے ہیں۔ اب وہ آئے اور کھانا کھا لیا اور چلے۔" (۱)

حکیم غلام نجف خاں کو ہاپوڑ سے مراد آباد پہنچکر لکھا ہے:

"بدھ کا دن پہر بھر دن چڑھا ہوگا کہ میں فقط پالکی پر مراد آباد پہنچا۔ ۱۰ جمادی الاولیٰ کی اور ۱۱ اکتوبر کی ہے۔... رات بخیر گزرے بشرط حیات کل رامپور پہنچ جائینگے گھبرایا ہوا ہوں۔ تیسرا دن ہے پاخانہ پھرنے کو۔" (۲)

مناظرِ سفر کے متعلق حکیم غلام رضا خاں کو تحریر کرتے ہیں:

"تم سے رخصت ہو کر اور قصبہ، خدا کو سونپ کر روانہ رامپور ہوا۔ موسم اچھا تھا۔ گرمی گزر گئی تھی۔ جاڑا ابھی چمکا نہ تھا۔ عالم اعتدال آب و ہوا، سایہ و سرچشمہ جابجا۔ آرام سے رامپور پہنچا۔" (۳)

توشۂ راہ

ہاپوڑ کی سرائے میں میرزا صاحب نے اپنے واسطے چھٹانک بھر گھی میں دو شامی کباب تلوائے۔ لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی تیار کرائی، اور خوب گھی ڈالکر خود بھی کھائی، اور آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دوسرے دن کے لیے سادہ سالن بغیر ترکاری کا پکوایا۔

منزل پر پہنچکر حسین علی خاں پاپڑ اور مٹھائی کے کھلونے خرید لاتے اور باقر علی خاں کے ساتھ بیٹھ کر کھا لیتے۔ ثاقب کے خط میں میرزا صاحب نے لکھا ہے:

"میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اوس میں ڈالدیے۔ رات ہونگ تھی۔ شراب پی، کباب کھائے۔ لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈالکر آپ بھی کھائی، اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن واسطے سادہ سالن

(۱) اردوئے: ۲۹۳ (۲) ایضاً: ۲۳۳ (۳) ایضاً: ۲۵۲

کپڑا یا، تر کاری نہ ڈلوائی۔ بارے آجتک دونوں بھائیوں میں موافقت ہے آپس کی صلاح و مشورت سے کام کرتے ہیں۔ اتنی بات زائد ہے کہ حسین علی منزل پر اوتر کر پاپڑ اور مٹھائی کے کھلونے خرید لاتا ہے۔ دونوں بھائی ملکر کھا لیتے ہیں۔"(۱)

ناسازیٔ طبیعت

اوقاتِ غذا میں اختلال اور راستے کی تھکن سے میرزا صاحب کو قبض کی شکایت ہو گئی تھی۔ حکیم غلام نجف خاں کو مراد آباد سے تحریر کیا ہے:

"گھبرایا ہوا ہوں، تیسرا دن ہے پاخانہ پھرے کو۔"(۲)

تاریخ ورود رامپور

آخر کار چھ منزلیں طے کر کے میرزا صاحب جمعرات کے دن ۱۲ اکتوبر سنہ ۶۶۵ کو رامپور تشریف لائے۔ قاضی عبدالجمیل صاحب بریلوی کو رامپور سے تحریر فرمایا:

"۱۲ اکتوبر کو یہاں پہنچا۔ بشرط حیات آخر دسمبر تک دہلی جاؤں گا۔"(۳)

حکیم غلام نجف خاں کے محولۂ بالا خط میں بھی، جو ۱۱ اکتوبر کو مراد آباد سے لکھا تھا، یہی تحریر کیا ہے کہ کل یعنی بارہ اکتوبر کو رامپور پہنچ جاؤں گا۔ حکیم سید احمد حسن مودودی کے نام کے خط سے بھی یہی تاریخ مستنبط ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہفتم اکتوبر کو دلی سے رامپور کو روانہ ہوا۔ بعد قطع منازل شش روز وہاں پہنچا۔"(۴)

نواب خلد آشیاں کی تواضع

نواب خلد آشیاں نے میرزا صاحب کی بہت تواضع اور مدارات کی۔ قیام کیلیے جرنیلی کی کوٹھی عطا ہوئی(۵)، اور یاور چیخانۂ سرکاری سے دونوں وقت کھانا مقرر ہوا۔ حکیم غلام نجف خاں نے اپنے خط میں کھانے کے متعلق تشویش کا اظہار کیا تھا۔

(۱) اردوی: ۲۹۳ (۲) ایضاً: ۲۳۳ (۳) ایضاً: ۲۰۸، دعود: ۱۶۹ (۴) ایضاً: ۲۴۳

(۵) یہ عمارت قلعۂ معلی کے مشرقی دروازے کے باہر واقع تھی۔ نواب جنت مکاں نے قلعۂ معلی کی قدیم عمارتیں منہدم کرا کے نئی عمارات تعمیر کرتے وقت بعد ترمیم مناسب قلعہ کے اندر داخل کر لیا ہے۔

اس سلسلے میں میرزا صاحب نے لکھا ہے :

"صبح شنبہ ۲۱ اکتوبر سنہ ۱۸۶۵ء - اقبال نشان عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں کو غالب علیشاہ کی دعا پہنچے۔ تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو میرے کھانے پینے کی طرف سے تشویش ہے۔ خدا کی قسم! میں یہاں خوش اور تندرست ہوں۔ دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن، پلاؤ، متنجن، پسندے، دونوں وقت روٹیاں خمیری، چپاتیاں، مربے، اچار۔ میں بھی خوش، لڑکے بھی خوش۔ کلوا اچھا ہو گیا ہے۔ سقا، مشعلچی، خاکروب سرکار سے متعین ہے۔ حجام اور دھوبی تو کر رکھا ہے۔" (۱)

۲۴ اکتوبر کو میرزا صاحب نے پھر حکیم صاحب کو خط لکھا۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں سرکار نے کھانے اور جانوروں کے دانے گھاس کی نقدی مقرر فرما دی تھی۔ فرماتے ہیں :

"آج منگل کا دن ۴ جمادی الثانی کی اور ۲۴ اکتوبر کی ہے۔ کھانے کی اور گھوڑوں اور بیلوں کے گھاس دانے کی نقدی ہو گئی۔ لیکن اس میں میرا فائدہ ہے، نقصان نہیں۔" (۲)

تعظیم و توقیر اور اخلاص

نواب خلد آشیاں قدر دانیٔ علم و ہنر میں اپنے والدِ مرحوم کے سچے جانشین تھے۔ انھوں نے میرزا صاحب کی تعظیم و توقیر اور خاطر و مدارات کا بیحد لحاظ کیا۔ میرزا صاحب ۲۱ اکتوبر کو حکیم صاحب کو لکھتے ہیں :

"آج تک دو ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ تعظیم، تواضع، اخلاق، کسی بات میں کمی نہیں۔" (۱)

سرکار کا التفات روز بروز زیادہ ہونے لگا، تو میرزا صاحب نے ۲۴ ماہِ مذکور کو پھر حکیم صاحب کو تحریر کیا :

(۱) اردوی: ۲۱۹ و ۲۲۰ (۲) ایضاً: ۲۲۳ -

" اب روداد سنو۔ نواب صاحب کا اخلاص و التفات روز افزوں ہے۔" (۱)

اُس بات کی کچھ اصل نہیں

رامپور کے سفر سے قبل میرزا صاحب نے کوئی ایسی بات سنی تھی، جو اُن کے تخلیِ ریاست کے لیے خطرناک تھی۔ یہاں آکر نواب صاحب کے التفات و اخلاص نے اُس کی تغلیط کر دی۔ میرزا صاحب اپنی بیوی سے اس خطرے کا ذکر کر چکے تھے، اس لیے اُن کی پریشانی رفع کرنے کے خیال سے حکیم صاحب کے خط کے آخر میں اُن کے صاحبزادے کو مخاطب کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

" ظہیر الدین خاں بہادر کو دعا پہنچے۔ یہ خط لیکر تم اپنی دادی صاحب پاس جاؤ اور یہ خط پڑھ کر سناؤ اور ان سے یہ کہدو کہ وہ بات جو میں نے تم سے کہی تھی، وہ غلط ہے۔ اس کی کچھ اصل نہیں ہے۔" (۲)

نواب خلد آشیاں کے متعلق میرزا صاحب کی رائے

میرزا صاحب، سرکار کے حسن صورت و سیرت کے اس قدر گرویدہ ہوئے کہ اُنھیں بعض شبوہ درویش میں نواب فردوس مکاں پر ترجیح دینے لگے۔ اُس زمانے میں سرکار نے بعض عمالانِ ریاست کو سرکاری مطالبات اور عام رعایا کو غلے کا محصول معاف کر دیا تھا۔ ان تمام واقعات نے میرزا صاحب کے دل پر اچھا نقش کیا۔ چنانچہ حکیم غلام رضا خاں کے خط میں ان کا اس طرح ذکر کیا ہے:

" نواب صاحب حال بمقتضای "اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ" حسن اخلاق میں نواب فردوس آرامگاہ کے برابر بلکہ بعض شبوہ درویش میں اون سے بہتر ہیں۔ مجرد مسند نشینی کے غلہ کا محصول یک قلم معاف کیا۔ علی بخش خاں خانساماں کو ۳۰ ہزار روپیہ بابت مطالبۂ سرکاری بخشدیا۔ مفصل حالات بذل و نوال عند الملاقات زبانی کہوں گا۔" (۳)

مرزا الفتہ کو لکھتے ہیں:

" نواب صاحب از روی صورت روح مجسم، اور باعتبار اخلاق آیت رحمت ہیں،

(۱) اردوی: ۲۲۳ (۲) ایضاً: ۲۱۹ و ۲۲۰ (۳) ایضاً: ۴۵۲

خزانۂ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفترِ ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے، اوس کے
پٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپیہ سال غلہ کا محصول معاف کر دیا۔
ایک اہل کار پر ساڑھے ہزار کا محاسبہ معاف کیا، اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ منشی
نولکشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی۔ خلاصہ عرضی کا سُن لیا۔ واسطے منشی صاحب
کے کچھ بتقریب شادیٔ صبیہ تجویز ہو رہا ہے۔ مقدار معجر نہیں کھلی۔" (۱)

علائی کے خط میں نواب صاحب کی تصویر کھینچتے ہیں:

"رئیس کی تصویر کھینچتا ہوں۔ قد، رنگ، شکل، شمائل بعینہٖ بھائی ضیاء الدین خاں
عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور لہجہ متفاوت۔ حلیم، ظریف، باذل، کریم، متواضع،
منشرح، متورع، شعر فہم، سینکڑوں شعر یاد، نظم کی طرف توجہ نہیں، نثر لکھتے
ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالائی طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔ خامہ جیبیں ایسے کہ
اون کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ اوس کی تقریر سنکر
ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔ اَللّٰھُمَّ دَامَ اِقْبَالُہٗ وَزَادَ اِجْلَالُہٗ!" (۲)

نواب صاحب کی دوسرے کو روانگی اور میرزا صاحب کا لطیفہ

نواب خلد آشیاں نے جشنِ تخت نشینی سے قبل اضلاعِ ریاست کے معائنے
کے لیے تشریف لیجانے کا ارادہ فرمایا تھا۔ اس سلسلے میں میرزا صاحب نے رمضان کو
۴ نومبر سنہ ۶۵ء کو تحریر کیا ہے:

"آج شنبہ ۴ نومبر کی ہے پرسوں نواب صاحب دورہ کو گئے ہیں۔ فرما گئے ہیں کہ
دو ہفتے میں آؤں گا۔ اگر چار روز یہاں رہیں گے۔ پھر نمائشگاہ بریلی کی سیر کو جائینگے
وہاں سے پھر کر جب آئیں گے تو صاحب کمشنر بریلی کا انتظار فرمائیں گے۔ دہم
دسمبر تک آجائیں گے۔ تین دن جشن رہے گا۔ اوس کے دو چار روز بعد غالب
رخصت ہوگا۔ خدا کرے تم تک زندہ پہنچ جائے۔" (۳)

خواجہ حالی فرماتے ہیں کہ جب سرکار سوار ہونے لگے، تو مشایعت کے لیے میرزا صاحب

(۱) اردو ی: ۹۸ و ۹۹ (۲) ایضاً: ۴۴۱ (۳) ایضاً: ۴۲۰

بھی سواری تک ساتھ آئے۔ سرکار پا برکاب ہوے، تو حاضرین کے ساتھ میرزا صاحب نے بھی آداب و کورنش ادا کی۔ سرکار نے میرزا صاحب کے آداب پر تبسم کے ساتھ ارشاد فرمایا۔ "خدا کے سپرد" میرزا صاحب کی شوخیٔ طبع نے گدگدایا، اور آپ قدرے حزیں صورت بناکر بولے: "حضرت، خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے۔ آپ پھر اُلٹا مجھکو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔" (۱)

جشنِ جمشیدی

دسمبر کا پہلا ہفتہ جشنِ تخت نشینی کے لیے مقرر ہوا تھا، اور اس تقریب کا اس درجہ شاندار اہتمام کیا گیا تھا کہ میرزا صاحب نے اس کو "جشنِ جمشیدی" سے تعبیر کیا ہے۔ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:

"نواب صاحب دورے سے یا آج شام کو یا کل آجائیں گے۔ جشنِ جمشیدی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔" (۲)

۲۴ اکتوبر کو تاریخِ جشن کے متعلق لکھتے ہیں:

"دسمبر کی پہلی سے جشن شروع ہوگا۔ ہفتہ دو ہفتہ کی مدت اوس کی ہے۔ بعد جشن کے رخصت ہونگا۔ خدا چاہے تو آخر دسمبر تک تم کو آ دیکھتا ہوں۔" (۳)

مرزا تفتہ کو تحریر کیا ہے:

"جشن یکم دسمبر سے شروع، ۵ دسمبر کو خلعت کا آنا مسموع۔" (۴)

۶ دسمبر سنہ ۶۵ء کو علائی کو اس جشنِ جمشیدی کی روداد لکھتے ہوے فرماتے ہیں:

"یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ اگر جمشید دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس پر آغا پور نامی ایک بستی ہے۔ آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھے۔ پرسوں صاحب کمشنر بہادر بریلی مع چند صاحبوں اور میموں کے آئے، اور خیموں میں اترے کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوے۔ سب سرکار رامپور کے مہمان۔ کل سہ شنبہ ۴ دسمبر حضور پر نور بڑے تجمل سے آغا پور تشریف لے گئے۔ بارہ پر دو بجے گئے، اور شام

(۱) یادگار غالب: ۴۳ (۲) اردوے معلی: ۲۳۱ (۳) ایضاً: ۲۳۴ (۴) ایضاً: ۹۹

کو پانچ بجے خلعت پہنکر آئے ۔ وزیر علی خاں خانساماں خواصی میں سے روپیہ پھینکتا ہوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصہ میں دو ہزار روپیہ سے کم نہ نثار ہوا ہوگا۔ آج صاحبان عالی شان کی دعوت ہے "ٹین" شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ روشنی، آتشبازی کی وہ افراط کہ رات دن کا سامنا کرے گی۔ طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع، کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہنا چاہیے۔ کوئی کہتا ہے کہ صاحب کلکٹر بہادر مع صاحبان عالی شان کے کل جائیں گے، کوئی کہتا ہے پرسوں" (۱)

مبارکباد خلعت

میرزا صاحب نے اس تقریب پر ایک فارسی نثر اور ۳۰ شعروں کا ایک قصیدہ خلد آشیاں کے حضور میں پیش کیا۔ نثر کے انجام میں لکھتے ہیں: (۲)

آخر بفضای بارگاہ آمدہ است — ہنگام فروزش نگاہ آمدہ است
چون نور کہ از مہر بماہ آمدہ است — تشریف شہنشاہ بشاہ آمدہ است

قصیدے کے یہ شعر امیر مینائی مرحوم کے منتخبہ ہیں: (۳)

تا چہ نیرنگ است این کاندر جہان آوردہ اند
نوبہاری طرفہ در فصل خزان آوردہ اند
در بہشت آن خود نباشد، بگزر از اردی بہشت
رونقی کز بہر باغ دیوستان آوردہ اند
چون جواہر را شماری نیست، گویم مجملاً
حاصل صد سالۂ دریا و کان آوردہ اند
تازہ بخششہای شاہنشاہ ہند و انگلند
خلعت از بہر خدیو شہ نشان آوردہ اند
از شعاع مہر تار، از پرتو مہتاب پود
جامہ ہای زرنگار و زرفشان آوردہ اند

(۱) اردو ی: ۱۴۴ (۲) یہ نثر کلیات نثر فارسی: ۹۱ میں چھپ چکی ہے (۳) انتخاب یادگار: ۲۴۹، پورا قصیدہ سید حسن: ۲۱۰ میں طبع ہو چکا ہے۔

درحمائل کز گلوی شہریار آویختند
گوہر از پروین و تارازکہکشاں آوردہ اند
تیزدم سنگی کہ ہمچون برقش از روزِ ازل
بی نیاز از گردشِ سنگِ فساں آوردہ اند
وآن زحل پیکر سپر کز بہرِ دفعِ تیغ و تیر
از سعادش جسم راحرزِ امان آوردہ اند
ابر ماناپبل کز رعدش صدا بخشیدہ اند
برق دش توسن کہ از بادش عنان آوردہ اند
دیگر آن زرین سلب خورشید منظر بالکی
کز نی خم دادہ توسش درمیان آوردہ اند
دولت واقبال وفخر وعزت وجاہ وجلال
کز فراوانی نہ گنجد درگمان، آوردہ اند
شاہِ داور را نویدِ دولت ودین دادہ اند
شہریان را مژدۂ امن وامان آوردہ اند

عزم مراجعت

ابتداءً میرزا صاحب کا یہ ارادہ تھا کہ دو چار مہینے رامپور میں قیام کریں گے۔ چنانچہ شاکر کو تاریخ روانگیٔ رامپور کی اطلاع دیتے ہوئے تحریر کیا تھا:

"دو چار مہینے وہاں رہنا ہوگا۔ اب جو کوئی خط آپ بھیجیں، تو رامپور بھیجیں۔" (۱)

لیکن رامپور میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد یہ طے کیا کہ اختتامِ جشن کے بعد رخصت طلب کریں، اور آخرِ دسمبر تک دلی جا پہنچیں۔ حکیم غلام نجف خاں کے خط میں اس کا ذکر آچکا ہے۔ (۲) علائی کو ۶ دسمبر کو تحریر کیا ہے:

"بعد اختتام محفل طالب رخصت ہونگا۔ بعد حصول رخصت دلی جاؤں گا۔" (۳)

(۱) اردوی: ۲۱۶/ دعود: ۱۳۰ (۲) اردوی: ۲۲۴ (۳) ایضاً ۲۴۲

اسی طرح قاضی عبدالجلیل صاحب بریلوی کو بریلی کی دعوتِ قدوم کے جواب میں لکھا ہے :

"پیر و مرشد! نواب صاحب کا وظیفہ خوار گویا اس در کا فقیر تکیہ دار ہوں۔ مسند نشینی کی تہنیت کے واسطے رامپور آیا۔ میں کہاں اور بریلی کہاں؟ ۱۲ اکتوبر کو یہاں پہنچا بشرط حیات آخر دسمبر تک دہلی جاؤں گا۔" (۱)

لڑکوں کی روانگی

باقر علی خاں اور حسین علی خاں اب نوجوان تھے، اور انھیں تنہا بھیجنے میں اس قسم کے خطرات پیدا نہیں ہوتے تھے، جن کے خوف سے سنہ ۶۰ء کے سفر میں میرزا صاحب نے فردوس مکاں کے اصرار کے باوجود رام پور قیام نہیں کیا تھا، اور بچوں کی صندپر راہی دہلی ہو گئے تھے۔ لہٰذا میرزا صاحب نے دونوں کو سرکار سے مرحمت کی اجازت دلا کر جمعے کے دن ۲۲ دسمبر کو دو آدمیوں کے ساتھ دلی روانا کر دیا۔ سرکار نے وقتِ رخصت ایک ایک دوشالہ مرحمت کیا۔ علائی کو اس کے متعلق میرزا صاحب نے لکھا ہے :

"آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی، ۱۴ مرغ، ۹ بڑے اور آٹھ چھوٹے (لے) کے دلی کو روانہ ہوئے۔ دو آدمی میرے ان کے ساتھ گئے۔ کلو اور لڑکا نیاز علی، یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔ نواب صاحب نے وقتِ رخصت ایک ایک دوشالہ مرحمت کیا۔" (۲)

میرزا صاحب کی تاریخ روانگی

اسی خط کے آخر میں میرزا صاحب نے لکھا ہے :

"میرے چلنے کا حال یہ ہے کہ انشاءاللہ تعالیٰ اسی ہفتہ میں چلوں گا۔"

۲۶ دسمبر کو پھر تحریر فرماتے ہیں :

"جانا! جانا! ایک خط میرا تمہارے دو خطوں کے جواب میں تم کو پہنچا ہوگا۔ . . .

(۱) اردوی: ۲۰۸ و عود: ۱۶۹ (۲) اردوی: ۳۹۴

آج منگل ہے، شعبان کی اور ۲۶ دسمبر کی۔ دونوں بھتیجے تمہارے جمعہ کے دن ۲۲ دسمبر کو روانۂ دہلی ہوئے۔ میں پرسوں یوم الخمس کو مرحلہ پیما ہونگا" (۱)

اس حساب سے میرزا صاحب جمعرات کے دن ۲۸ دسمبر سنہ ۶۵ء کو رامپور سے رخصت ہوئے۔

احباب رامپور سے آخری ملاقات

سرکار سے رخصت حاصل کرکے میرزا صاحب قیام گاہ پر تشریف لائے۔ یہاں رامپور کے بعض احباب الوداع کہنے کے لیے پہلے سے جمع تھے۔ صاحبزادہ سید نجابت علی خاں بہادر نے حقیر عرشی سے بیان کیا، کہ جب میرزا صاحب سرکار سے رخصت ہوکر قیامگاہ پر واپس آئے، تو میں اپنے والد صاحبزادہ سید ہدایت علی خاں بہادر کے ہمراہ اُن کی قیامگاہ پر موجود تھا۔ میرزا صاحب نے احباب کی طرف مخاطب ہوکر فرمایا: "بھئی ہم نے ابھی یہ شعر کہا ہے:

اب رہے دلی کی طرف کوچ ہمارا غالب — آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے" (۲)

رخصتانہ کی رقم

میرزا صاحب نے ۲۸ نومبر کو رامپور سے نفقہ کو لکھا تھا:

"میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا، سرکار سے ملتی ہے۔ وقت رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت" (۳)

نواب خلد آشیاں ۳۰ اکتوبر سنہ ۶۵ء کو ایک ہزار روپیہ عطا فرما چکے تھے (یہ ہم

(۱) اردوی: ۳۹۰ (۲) مولانا نظامی بدایونی نے شرح دیوان غالب اردو (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں سنہ ۱۹۲۷ء) کے صفحہ ۲۵۴ پر یہ مقطع اور ایک شعر نقل کرکے حاشیہ میں لکھا ہے: "حضرت نواب سے نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ رامپور کی طرف اشارہ ہے۔ یہ اُس غزل کے شعر ہیں جو رامپور سے رخصت ہونے وقت لکھی تھی۔ چونکہ دیوان اُس وقت مرتب ہوکر شایع ہو چکا تھا، اس لیے دیوان میں شامل نہیں ہوئی" اس بیان میں مولانا سے تسامح ہوا ہے، کیونکہ ایک عینی شاہد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں نواب سید محمد کلب علی خاں بہادر مراد ہیں۔ علاوہ ازیں چونکہ پہلے سفر میں میرزا صاحب رامپور سے دیوان اردو کی نقل لے گئے تھے جس سے دیوان طبع ہوا، اس لیے نواب فردوس مکاں کے بجائے نواب خلد آشیاں کے عہد کی غزل کا اُس میں شامل ہونا قرین قیاس اور مطابق واقعہ ہوسکتا ہے۔ (۳) اردوی: ۹۸ (۴) اداریۂ خزانۂ سنہ ۶۶-۱۸۶۵ء، بہ انعام و عنایات ۷ نومبر سنہ ۱۸۶۵ء۔

۲۶ دسمبر سنہ ۶۵ء کو ۲۰۰ روپے بوجہ زادِ راہ مرحمت فرما کر میرزا صاحب کی اس آرزو کی بھی تکمیل کر دی(۱)

نواب ضیاء الدین خاں بہادر کی فرمایش

نیّر نے میرزا صاحب سے فرمایش کی تھی کہ رامپور سے بانس کی غلیل لائیں۔ میرزا صاحب نے فرمایش پوری کی۔ لیکن غلیل پر جو کچھ بیتی وہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ علائی کے نام مؤرخہ ۲۶ دسمبر کو لکھا ہے:

"تو کمان گروہ کہا کر۔ فارسی بھگارا کر۔ مجھ سے ہندی کی چندی سن۔ ایک غلیل حضور نے دینی کی ہے۔ ایک علی اصغر خاں سے اینٹھی۔ دونوں کل آئیں گی۔" (۲)

لیکن سوءِ اتفاق سے فرمایش کی تکمیل میں سعی کے بعض مدارج رہ گئے، اور غلیل پر نئی افتاد پڑی۔ ۱۳ جنوری سنہ ۶۶ء کو میرزا صاحب علائی کو لکھتے ہیں:

"میاں چلتے وقت تمہارے چچا نے غلیل کی فرمائش کی تھی۔ رامپور پہنچکر وہ بے سعی و تلاش ہات آگئی، بنوا رکھی۔ لڑکوں نے ملاقاتیوں نے سب نے مجھ سے سن لیا کہ یہ نواب ضیاء الدین خاں کے واسطے ہے۔ اب چلنے سے ایک ہفتہ پہلے تم نے غلیل مانگی۔ بھائی کیا بتاؤں کہ کتنی جستجو کی؟ کہیں بہم نہ پہنچی۔ دس روپیہ تک مول کو نہیں ملی۔ نواب صاحب سے مانگی۔ توشہ خانہ میں بھی نہ تھی۔ ایک امیر کے ہاں پتا لگا، دوڑا ہوا گیا۔ کھپچی موجود پائی۔ لیکن کیا کھپچی؟ جیسے نجف خاں کے عہد میں تورانیوں میں ہماری تمہاری ہڈی۔ بنوانے کی فرصت کہاں؟ آج ہی کل چلدیا۔ اس بانس کی قدر کرنا، اور اس کو اچھی طرح بنوالینا۔" (۳)

سفر کے مصائب

رامپور سے واپسی میں میرزا صاحب کو سخت تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ دریای "رام گنگا" میں سرمائی بارش کے سبب سیلاب تھا۔ میرزا صاحب کی پالکی کے پار ہوتے ہی پانی کے زور سے کشتیوں کا عارضی پُل ٹوٹ گیا۔ اسباب کی گاڑیاں اور خدام

(۱) اوراقِ خزاں سنہ ۶۶-۱۸۶۵ء مذاقِ انعام و عنایات ۹ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء (۲) اردوی: ۳۹۶
(۳) ایضاً: ۱۵۴، نسخہ میں "کرتا" اور "بنوالیتا ہے"۔

سب مجبوراً اُس پار رہ گئے، اور میرزا صاحب یکہ و تنہا صرف ایک کمبل ساتھ لیے مرادآباد کی سرائے میں اقامت گزیں ہوئے۔ بڑھاپے کی کمزوری سرمائی تکلیفوں کا مقابلہ نکرسکی اور یہ بیمار ہوگئے۔ پانچ دن صدرالصدور مرادآباد کے یہاں قیام کیا، اور جب قدرے روبصحت ہوئے، تو دلی کا عزم کیا۔ دلی پہنچکر نواب خلد آشیاں کو لکھتے ہیں:

"بعد تسلیم معروض ہے۔ مرادآباد پہنچا، بعد پالکی کے اوتر آنے کے پل کا ٹوٹ جانا، گاڑی اسباب یہاں تک کہ رخت خواب کا مع آدمیوں کے اوسی زہریر کے میدان میں رہنا، بغیر جاڑے کے کچھ نہ کھانا، خیر جو اوپر گزری وہ جانیں، میں مرادآباد کی سرا میں ایک چھوٹی سی حویلی میں ٹھہرا۔ سیو کا پیاسا کمل اوڑھکر پڑ رہا۔ یہ شعر اپنا پڑھ پڑھکر صبح کی۔

گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے تب اماں ہجر میں دی برد لیالی نے مجھے

صبح کو خستہ و رنجور اوٹھا۔ صاحبزادہ ممتاز علی خاں بہادر کے بھیجے ہوئے دو فرشتے آئے۔ اوٹھاکر سعیدالدین خاں صاحب کے ہاں لے گئے۔ صاحبزادہ صاحب نے وہ تعظیم و تکریم، اور سعیدالدین خاں صاحب نے وہ تکریم و تعظیم کی، کہ میری ارزش سے زیادہ تھی۔ ناگاہ مولوی محمد حسن خاں بہادر صدرالصدور آئے، اور مجھے اپنے گھر لیگئے۔ پانچ دن وہاں رہا۔ بھائی نواب مصطفی خاں بہادر وہیں مجھ سے آکر ملے۔ دوسرے دن وہ رہگرای دارالسرور رامپور اور میں جادہ نورد ستم آباد دہلی ہوا۔" (۱)

سرکار کی ہمدردی۔

یہ عریضہ ۱۰ جنوری سنہ ۶۶ء کو تحریر کیا گیا تھا۔ مگر سرکار کو اس کے پہنچنے سے پہلے شیفتہ کی زبانی تمام حالات کی اطلاع مل چکی تھی لہٰذا انھوں نے مرادآباد کے پتے سے میرزا صاحب لکھا تھا:

"زبانی نواب مصطفی خاں بہادر کے دریافت ہوا کہ مرادآباد میں کچھ طبیعت آپ کی علیل ہوگئی ہے۔ باستماع اس امر کے باعث کمال تردد کا ہوا۔ اس واسطے حوالۂ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ خیریت مزاج سے مطلع کیجے۔ اور اگر ہنوز طبیعت مائل بہ

(۱) مکاتیب: ۴۸

ہو، اور آپ کا ارادہ قیام مراد آباد کا تادرستیٔ طبیعت ہو، تو آپ رامپور میں تشریف لائیے۔ یہاں معالجہ بخوبی عمل میں آئیگا۔" (۱)

یہ فرمان میرزا صاحب کو نہیں ملا۔ وہ اُسی دن مراد آباد سے روانا ہوگئے تھے جس دن شفیقہ وہاں سے رامپور کو چلے تھے۔ دلی پہنچ کر ۱۰ جنوری کو میرزا صاحب نے روداد سفر پر مشتمل عریضہ روانا کیا تو اُس کے جواب میں سرکار خلد آشیاں نے تحریر فرمایا

"الحمد للہ کہ وصول نمبقۂ لطف آگہیں باعث اطمینان ہوا۔"

اس فرمان کے جواب میں میرزا صاحب نے ۲۱ جنوری کو لکھا:

"اس سفر کا حال کیا عرض کروں۔ دلی سے رامپور تک ذوق قدمبوس میں جوانا نہ گیا۔ اختلافات آب و ہوا و تفرقۂ اوقات غذا کو ہرگز نہ مانا، اور رنج راہ کو ہرگز خیال میں نہ لایا۔ وقت معاودت اندوہ فراق نے وہ فشار دیا کہ جوہر روح گداز پاکر ہر بن مو سے ٹپک گیا۔ اگر آپ کے اقبال کی تائید نہوتی، تو دلی تک میرا زندہ پہنچنا محال تھا۔ جاڑا، منہ، قبض و انقباض، فقدان جوع، فاقہ ہای متواتر، منزلہای نامانوس، ہاپوڑ تک آفتاب کا نظر نہ آنا، شب و روز ہوای زمہریر کا جانگزا رہنا، بارے ہاپوڑ سے چل کر تیراعظم کی صورت دکھائی دی۔ دھوپ کھاتا ہوا دلی پہنچا۔ ایک ہفتہ کوفتہ و رنجور رہا۔ اب تو یہ پیر و ناتوان ہوں جیسا کہ اس سفر سے پہلے تھا۔ خدا وہ دن کرے کہ پھر اوس در پہ پہنچوں!" (۲)

مرزا صاحب لٹ گئے

اس سفر میں میرزا صاحب کی تکالیف اُس حد کو پہنچ گئی تھیں کہ وہ اُسے حسن فکر کی بربادی سے تعبیر کرتے تھے۔ رضوان کو لکھتے ہیں:

"رامپور کے سفر میں تاب و طاقت، حسن فکر، لطف طبیعت، یہ سب اسباب لٹ گیا۔" (۳)

سفر رامپور کا رہ آورد

ان جسمانی اذیتوں نے میرزا صاحب کی صحت پر بہت بُرا اثر کیا، اور انھیں رعشہ

(۱) مکاتیب: ۴۸۰ ج ۲ (۲) ایضاً: ۴۹ (۳) اردوی: ۳۲۱

وضعفِ بصر کی شکایت زیادہ ہوگئی۔ ۱۲ مئی سنہ ۶۶ ع کو ذکا کو تحریر فرماتے ہیں:

"تم کو میری خبر بھی ہے۔ آگے ناتوان تھا، اب نیم جان ہوں۔ آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رامپور کے سفر کا رہ آورد ہے رعشہ و ضعفِ بصر۔ جہاں چار سطریں لکھیں، اُنگلیاں ٹیڑھی ہوگئیں، حرف سوجھنے سے رہ گئے۔" (۱)

وقت و تاریخ ورود دہلی

عناصر کی اس بیرخی کا مقابلہ کرتے ہوئے میرزا صاحب ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء کو دوشنبے کے دن گیارہ بجے دلی پہنچے۔ مرزا تفتہ کو ورود کی اطلاع دیتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

"لو صاحب! کھچڑی کھائی دن بہلائے۔ کپڑے بھانے گھر کو آئے۔ ۸ جنوری ماہ وسال حال دوشنبہ کے دن غضب الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔ تمہارا خط مضامین دردناک سے بھرا ہوا رامپور میں میں نے پایا۔ جواب لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ بعد روانگی کے مراد آباد میں پہنچکر بیمار ہوگیا۔ پانچ دن صدر الصدور صاحب کے ہاں پڑا رہا۔ انھوں نے بیمارداری اور غمخواری بہت کی۔" (۲)

حکیم احمد حسن مودودی کو لکھا ہے:

"ہشتم جنوری کو دلی پہنچا۔ عرض راہ میں بیمار ہوا۔ پانچ دن مراد آباد میں صاحب فراش رہا۔ اب بیا فرسودہ رواں ناتواں تھا دلیا ہوں۔" (۳)

بیخبر کو لکھتے ہیں:

"بندۂ گنا ہگار شرمسار عرض کرتا ہے، کہ پرسوں غازی آباد کا اوٹھا ہوا گیارہ بجے اپنے گھر پر مثل بلای ناگہانی نازل ہوا ہوں۔

باید کہ کنم ہزار نفرین بر خویش اما بزبان جادۂ راہ وطن" (۴)

شاکر کو لکھا ہے:

"قبلہ! یہ تو آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ ۸ جنوری کو فقیر دلی پہنچا، تھکا ماندہ خستہ و رنجور۔ ہنوز اقامت کلی نہیں پائی۔" (۵)

(۱) اردوی: ۳۷ (۲) ایضاً: ۱۰۸ (۳) ایضاً: ۳۴۳ (۴) عود: ۲۷۹ (۵) عود: ۱۲۳

یہی تاریخ نواب خلدآشیاں کو بھی لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

"دوشنبہ ۲۰ شعبان ۱۲۸۲ھ، ۸ جنوری ۱۸۶۶ء غمکدہ پر پہنچا۔ حضور کے اقبال کی تائید تھی، ورنہ میں اور جیتا دلی پہنچتا!" (۱)

دلی سے باہر رہنے کی کل مدت

میرزا صاحب ۷ اکتوبر سنہ ۶۵ء کو دلی سے روانا ہوئے اور ۸ جنوری سنہ ۶۶ء کو دلی واپس پہنچے۔ اس حساب سے اُن کی دلی سے باہر رہنے کی کل مدت تین ماہ ہے۔

ارسال ہدایا

حسبِ ضابطہ مودت و خلوص رامپور سے میرزا صاحب کو تحفے بھی بھیجے جاتے تھے، جو بیشتر رامپور کے آم ہوتے تھے۔ میرزا صاحب کو آم طبعاً مرغوب تھے، اس لیے یہ تحفے انھیں انگریزی خلعت اور سرکاری عطیات سے کم نہ معلوم ہوتے ہوں گے۔ ۱۷ جون سنہ ۶۲ء کو میرزا صاحب نے سیاح کو لکھا ہے:

"رامپور سے نواب صاحب اپنے باغ کے آموں میں سے اکثر ببیل ارمغان بھیجتے رہتے ہیں۔" (۲)

۸ جون سنہ ۶۰ء کو نواب فردوس مکان نے آموں کی دو ہنگیاں تحفۂ بہار یکمکر روانا کی تھیں (۳) اس کے بعد ۲۹ جون کو دو ہنگیاں اور ارسال کی گئیں۔ (۴) ۲۱ جون سنہ ۶۲ کو قلمی آموں کی دو ہنگیاں روانہ کرتے ہوئے سرکار نے "حسبِ دستور" کے الفاظ سے اس تحفے کے ارسال کو تعبیر فرمایا ہے۔ (۵) جولائی سنہ ۶۴ء میں سرکار نے دو سو آم بھیجے تھے۔ میرزا صاحب ۵ جولائی کو اس عنایت کی رسید میں لکھتے ہیں:

"نوازشنامہ اور آموں کے ساتھ دو ہنگیاں دو سو آموں کی پہنچیں۔

"شکر نعمتہای تو چندانکہ نعمتہای تو"۔" (۶)

فرمائشیں

اس کے علاوہ کبھی کبھی دونوں طرف سے بعض چیزوں کی فرمائش بھی ہو جاتی تھی۔ ۱۷ اپریل سنہ ۶۰ء کو نواب فردوس مکاں نے میرزا صاحب کو لکھا تھا:

(۱) مکاتیب: ۴۸ (۲) اردو ی: ۲۹ (۳) مثل نمبر ۲۸۶ (۴) مثل نمبر ۳۱۹ (۵) مثل نمبر ۴۴۰ (۶) مکاتیب: ۲۶

"مشفقا! جو یہ ایام رنگترہا ی سرنیزی کے ہیں، اس واسطے حوالۂ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ بمقتضای لطف وعنایت فرمائی مخلصانہ کے ایک ایک بہنگی رنگترہای سبز سرنیزی کی بتعاقب دس دس روز کے تا اختتام فصل روانہ اس سرکار کیے فرماتے رہیے، اور قیمت رنگتروں اور اجرت کہاروں بہنگی سے مخلص کو مطلع فرمائیے تاکہ مطابق اوس کے ہنڈوی آپ کی حامی خدمت میں بھیجی جائے۔

اگرچہ آپ کو اس خصوص میں تکلیف ہو گی، لیکن آپ کی محبت اور الفت قلبی سے چشداشت یہ ہے کہ اس باب میں جانب ملازمان سامی سے بجو بی عمل میں آئے گا۔" (۱)

میرزا صاحب نے اس فرمایش کی فوراً تعمیل کی، اور ۲۹ اپریل سے قبل رنگترے سرکار کو مل گئے۔ چنانچہ اس تاریخ کے ایک مکتوب میں سرکار نے اس کا شکریہ ادا فرمایا ہے (۲) اس کے بعد سنہ ۶۱ میں بھی میرزا صاحب نے رنگترے ارسال کیے تھے، ۲۰ اپریل سنہ ۶۱ء کو سرکار نے ان کا بھی شکریہ ادا کیا ہے (۳) سنہ ۶۴ء میں نواب فردوس مکاں نے چوب چینی کی فرمایش کی تھی۔ میرزا صاحب نے بڑی کوشش سے پانچ سیر "رنگین وسنگین و بے گرہ یا کم گرہ قطعاتِ چوب چینی" مہیا کر کے سرکاری کہار کے ہاتھ روانا کیے، اور از راہِ معذرت لکھا:

"دلی اب شہر نہیں، چھاؤنی ہے، کنبہ ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر کے امرا، نہ اطراف شہر کے رؤسا۔" (۴)

رامپور کے دوسرے سفر میں نیز کے لیے میرزا صاحب نے نواب خلد آشیاں سے ایک بانس کی غلیل مانگی تھی۔ سرکار نے حکم دیا کہ توشہ خانۂ خاص سے عطا کر دیجائے۔ میرزا صاحب رامپور سے، شعبان سنہ ۸۲ھ مطابق ۲۶ دسمبر ۶۵ء کو علائی کے خط میں لکھتے ہیں:

"مجھ سے ہندی کی چندی سن۔ ایک غلیل حضور نے دیتی کی ہے۔" (۵)

(۱) شل نمبر ۲۲۶ (۲) شل نمبر ۲۵۲ (۳) شل نمبر ۲۲۳ (۴) مکاتیب ۳۰ (۵) اردوی: ۳۹۶

بعدازاں اسی غلیل کے متعلق ۲۵ شعبان، مطابق ۱۳ جنوری سنہ ۶۶ء کو لکھا ہے:

"اب چلنے سے ایک ہفتہ پہلے تم نے غلیل مانگی۔ بھائی، کیا بتاؤں کہ کتنی جستجو کی! کہیں بہم نہ پہنچی، دس روپیہ تک مول کو نہ ملی۔ نواب صاحب سے مانگی۔ توشہ خانہ میں بھی نہ تھی۔" (۱)

۱۱ جولائی سنہ ۶۱ء مطابق غرۂ محرم سنہ ۸۰ھ کو میرزا صاحب نے آموں کی فرمائش کی تھی۔ اس کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے تحریر فرمایا:

"دربارہ ترسیل انبہ ہای کے کہ زیب ترقیم فرمایا ہے، حال یہ ہے کہ امسال بہار انبہ کی باغات اس سرکار میں بہت قلیل اور کم رہی۔ اور علاوہ اس کے عجب کیفیت اون میں پیدا ہوئی کہ قابل رکھنے دو چار دن کے نہ تھی، یعنی درصورت رکھنے کے خراب اور بوسیدہ ہو جاتے تھے۔ اس سبب سے بھیجنا انبہ ہای کا متعذر ہوا۔ ظہور اس امر کا بعالم مجبوری تصدق فرمایئے۔" (۲)

دیگر خدمات

میرزا صاحب سرکار کی دیگر خدمات بجا لانے کے لیے بھی ہر وقت تیار رہتے تھے۔ دسمبر سنہ ۶۱ء میں نواب فردوس مکاں نے میرزا صاحب کو لکھا تھا کہ چوبے گردھاری لال کے لیے حکیم نیاز علی صاحب سے خلاں مرض کا نسخہ تجویز کرا دیجے۔ میرزا صاحب نے جواباً لکھا کہ حکیم صاحب مریض کا معائنہ کرنے کے بعد دوا تجویز کریں گے۔ اس کے جواب میں ۱۹ دسمبر کو سرکار نے تحریر فرمایا:

"الحال چوبی معزی الیہ قصداً نجا بضرورت استعلاج از حکیم صاحب می دارند۔ لہٰذا حوالۂ خامہ محبت نگار می شود کہ ہنگام رسیدنِ چوبے صاحب از حکیم صاحب ملاقات شان بخوبی کنانیدہ تجویز علاج بخوبی بعمل آید۔" (۳)

۱۰ ربیع الاول سنہ ۱۸ھ مطابق ۱۴ اگست سنہ ۶۴ء کو نواب فردوس مکاں نے تحریر فرمایا:

(۱) اردو ئے معلی، جلد ۲ (۲) مثنل نمبر ۲ (۳) مثنل نمبر ۹۹

"درینولا لالہ شب سہای ساہو رہنے والے رامپور کے واسطے معالجہ آنکھوں اپنی کے شاہجہان آباد کو آتے ہیں۔ اور لالہ مذکور متوسل اس سرکار کے ہیں۔ اس واسطے حوالہ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ دربارۂ علاج لالہ معزی الیہ کے اطبائے حاذق سے مراتب لطف اور مہربانی کے اون کے حال پر مرعی اور مبذول فرماویں۔" (۱)

میرزا صاحب نے ساہو صاحب کا دلی میں بخوبی علاج کرا دیا۔

جولائی سنہ ۶۷ء میں نواب خلد آشیاں نے حیات سے لکھوایا کہ دلی کے فاضل شطرنج باز کو رامپور روانا کر دیجے۔ میرزا صاحب نے اُس کو زادِ راہ دیکر روانا کیا اور اطلاعاً نواب صاحب کی خدمت میں لکھا:

"بموجب تحریر میرزا رحیم الدین بہادر حیا کے، فاضل شطرنج باز کو خرچ دیکر روانہ کیا۔" (۲)

سرکار کا طریقِ خطاب

سرکاری فرامین میں میرزا صاحب کو مساویانہ، بلکہ بڑے کسی حد تک بزرگانہ، مخاطب کیا جاتا تھا۔ چنانچہ القاب، آداب اور خاتمے میں ہر جگہ مساوات و محبت کا لحاظ پایا جاتا، اور علی العموم فرمان کا اندازہ یہ ہوتا ہے:

"نواب صاحب مشفق مہربان کرمفرمای مخلصان سلمہ اللہ تعالی۔ بعد اشتیاق مواصلت موفور المسرت کہ متاخر الحریر بے مشہود ضمیر مودت تخمیر کے ہو.... زیادہ جمعیت و نشاط ہو۔"

اثنای مطالب میں جہاں میرزا صاحب کے خط کا حوالہ آیا ہے، وہاں اُن کے مکتوب کو "سامی صحیفۂ لطف آگیں" یا "نیقۂ انیقۂ بلاغت مشحون" یا دیگر تعظیمی الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہر جگہ لفظ "مشفقا" سے تخاطب نظر آتا ہے۔ نواب فردوس مکاں نے ایک مکتوب میں اپنے تعلقات کی صراحت بھی فرمادی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"جو کہ آپ خفا ہونا مخلصی کا بسبب عدم رسی رقائم اخلاص محتوی رسیدات صحائف

(۱) مثل نمبر ۸۴ ۔ (۲) مکاتیب: ۷۲

موصوفہ اپنے تحریر فرماتے ہیں، اے حضرت، مخلص صمیم تو آپ کو بزرگ اور عنایت فرما اپنا جانتا ہے۔ توقف رسی رقائم نیاز کے باعث خفگی نہ تصور فرمائیے۔"(۱)

ان رواسم و آداب سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سرکار رامپور سے میرزا صاحب کے تعلق کی نوعیت کیا تھی۔

میرزا صاحب کا طریق خطاب

خود میرزا صاحب کے عرائض کے القاب، آداب اور خاتمے بھی اس پر شاہد ہیں کہ اس رشتے کی بنا احسان و عنایت سے زیادہ محبت و خلوص پر تھی۔ تقریباً تمام عرائض میں میرزا صاحب نے "ولی نعمت" سے مخاطب کیا ہے، اور "بعد تسلیم معروض ہے" سے مطلب کا اظہار شروع کر کے "زیادہ حد ادب" پر عریضے کو ختم کر دیا ہے۔ خاتمے میں دو دعائیہ شعر پائے جاتے ہیں، جن میں کا ایک مصرع لیکر کبھی تیسرا شعر بنا لیا ہے۔ یہ بھی بناوٹ اور تصنع سے پرہیز پر دلالت کرتا ہے۔

رامپور سے کل مالی امداد

میرزا صاحب کو بارہ برس میں دربار رامپور سے جو مالی مدد ملی، اس کی مجموعی مقدار ۱۷ ہزار ۳ سو ۷۵ روپے ہے۔(۲) اس رقم میں سے کچھ اوپر ۱۰ ہزار نواب فردوس مکان نے اور باقی نواب خلد آشیاں نے عطا فرمائے تھے۔

اس امداد میں وقتی عطیے اور وظیفہ دونوں شامل ہیں۔ وظیفے کا تقرر جولائی سنہ ۵۹ء میں ہوا تھا، جو میرزا صاحب کی تاریخ انتقال، ۱۵ فروری سنہ ۶۹ء تک برابر ملتا رہا۔ اس کی کل مقدار ۱۱ ہزار ۵ سو ۵۰ روپے ہوتی ہے۔

عطیات کا سلسلہ ۵ فروری سنہ ۵۷ء سے شروع ہو کر میرزا صاحب کے انتقال کے

(۱) مثل ضمیمہ (۲۲)، صفحہ احباب۔

(۲) یہ مرتب مکاتیب کی اس وقت تک کی جستجو کا نتیجہ ہے۔ ممکن ہے کہ مزید تفتیش سے اور وقتی عطیوں کا پتا چل سکے، اور امداد کی مد میں اضافہ کرنا پڑے۔ ہاں تنخواہ کی رقم میں وہ سو روپے ماہوار شامل نہیں کیے گئے ہیں، جو رامپور کے قیام میں بنام دعوت ملا کرتے تھے۔ کیونکہ وہ نہ تو تنخواہ کے تھے اور نہ امدادی عطیہ کہے جا سکتے ہیں۔ وہ کھانے وغیرہ مصارف کے لیے مہمانداری کی مد سے ملا کرتے تھے، اس لیے مالی امداد میں شمار کیے جانے کے قابل نہیں ہیں۔

بعد تک جاری رہا۔ اس مد میں جتنا روپیہ اُنھیں مرحمت ہوا، اُس کی تاریخ وار تفصیل یہ ہے:

۱) ۵ فروری سنہ ۵۷ء	۲۵۰ روپے	بتقریب شیرینی مشاگردی۔
۲) ۲۳ مارچ 〃	۲۵۰ 〃	بتقریب تبرید نوشی
۳) ۲۷ جولائی 〃 (۵ ذیحجہ ۱۲۷۴ھ)	۲۵۰ 〃	بغرض امداد مالی
۴) ۳۱ اگست سنہ ۵۸ء	۲۵۰ 〃	〃
۵) ۲۵ نومبر 〃	۲۵۰ 〃	〃
۶) ۳۰ مئی سنہ ۵۹ء	۲۵۰ 〃	بغرضِ مصارفِ خدام
۷) ۱۶ دسمبر 〃	۳۰۰ 〃	بغرضِ امدادِ مالی
۸) ۱۸ مارچ سنہ ۶۰ء	۵۰۰ 〃	〃 (۱)
۹) ۲۴ جنوری سنہ ۶۱ء	۲۰۰ 〃	بتقریبِ شادی نوابِ سید علیخاں بہادر
۱۰) ۱۲ جولائی 〃	۱۲۵ 〃	〃 (تورے اور جوڑے کے)
۱۱) ۲۲ مارچ سنہ ۶۲ء (سے پہلے)	۲۰۰ 〃	بغرضِ طباعتِ قاطعِ برہان (۲)
۱۲) ۱۱ مارچ سنہ ۶۳ء	۲۰۰ 〃	سفر خرچ انبالہ برائے شرکت دربار گورنر جنرل
۱۳) ۳ اکتوبر 〃	۲۰۰ 〃	بغرضِ امدادِ مالی
۱۴) ۱۶ اگست سنہ ۶۵ء	۲۰۰ 〃	بتقریبِ غسلِ صحتِ نواب خلد آشیاں
۱۵) ۷ نومبر 〃	۱۰۰۰ 〃	بتقریبِ جشنِ تخت نشینی نواب خلد آشیاں
۱۶) ۹ جنوری سنہ ۶۶ء	۲۰۰ 〃	زادِ راہِ دہلی
۱۷) ۱۶ اکتوبر سنہ ۶۶ء اور ۸ جنوری سنہ ۶۷ء کے درمیان	۴۵۰ 〃	بغرض ادای قرض
۱۸) ۹ نومبر سنہ ۶۹ء	۶۰۰ 〃	بیگم غالب کو میرزا صاحب کا قرض ادا کرنے کیلئے

(۱) اداریِ خزانہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رقم میں سے دو سو روپے سابق میں ارسال ہوئے تھے اور رسید نہ آنے کے باعث نزوا صہ میں چلے آتے تھے، خرچ میں مجرا ہو گئے تھے مارچ کی ۱۸ تاریخ میں ان کا حساب اس بنا پر ڈالا گیا ہے کہ اس تاریخ کو رسید کمو صول ہوئی تھی۔

(۲) ممکن ہے کہ یہ رقم وہی ہو جس کا سابق میں عطا ہونا ادا ہے سے معلوم ہوتا ہے۔

ان عطیوں کی مجموعی رقم ۵ ہزار ۵ سو ۵۰ روپے ہوتی ہے۔ ان میں سے نمبر ۱، ۳، ۵، ۷، ۸، ۱۱، ۱۲، ۱۴، اور ۱۷ کا ذکر مکاتیب میں، اور بقیہ کا خزانے کے سنہ وار اوارجوں میں موجود ہے۔

۳ اکتوبر سنہ ۶۳ء کو دو سو روپے کی جو رقم ارسال ہوئی تھی۔ اُس کے متعلق فردوس مکاں کے دستِ خاص کا نوشتہ حکم منشی سیلچند کے نام مثل (ص۵۵) میں شامل ہے۔ فرمایا ہے:

"منشی سیلچند، میرزا نوشہ صاحب کو خط لکھ کر روانہ کرو کہ یہ دو سو روپیہ تنخواہ سے کچھ علاقہ نہیں رکھتے ہیں۔ آپ شوق سے صرف کیجے۔ تنخواہ موافق معمول کے پہنچ جائے گی۔ یہ علاوہ تنخواہ سے ہیں۔ فقط"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے کسی عریضے کے ذریعے اس بارے میں سرکار سے استفسار کیا تھا۔ اس کا جوابی فرمان ۱۱ اکتوبر کو سرکار کی طرف سے بھیجدیا گیا۔

قاطع برہان کی طباعت میں امداد

طباعتِ قاطع برہان کے لیے دو سو روپے کی رقم کا ذکر خود میرزا صاحب نے سیاح کے نام کے خط میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"میرے پاس روپیہ کہاں، جو قاطع برہان کو دوبارہ چھپواؤں۔ پہلے بھی نواب مغفور نے دو سو روپے بھیجدیے تھے، تب پہلا مسودہ صاف ہو کر چھپوایا گیا تھا۔ اب بھی وعدہ کیا تھا کہ اپریل کی وجہ مقرری کے ساتھ دو سو پہنچیں گے۔ وہ آخر اپریل سنہ ۱۸۶۵ء حال میں مر گئے۔ اپریل کا روپیہ رئیسِ حال سے میں نے پایا۔ معرفِ کتاب کا روپیہ نہ آیا۔ یاد دلاؤں گا۔ مگر اوس مرحوم کا وعدہ سررشتۂ دفتر سے نہ تھا، جو از روی دفتر اوس کی تصدیق ہو۔ بہر حال فکر میں ہوں۔" (۱)

قاطع برہان کا چھاپا ۲۰ رمضان سنہ ۱۲۷۸ھ (۲۲ مارچ ۱۸۶۲ء) کو تمام ہوا ہے۔ (۲)

(۱) اردوی: ۱۷ (۲) قاطع برہان: ۹۳

پس یہ رقم اس تاریخ سے قبل عطا ہوئی ہوگی کسی مثل میں اس کا حوالہ نہیں ملتا، اس بنا پر صحیح تاریخ کا تعین دشوار ہے۔

ہر قصیدے پر انعام

میرزا صاحب نے نواب خلد آشیاں کو لکھا ہے کہ نواب فردوس مکاں کی خدمت میں جب میں مدحیہ قصیدہ بھیجتا، تو وہ ۲۵۰ روپے کی ہنڈوی بھیجا کرتے تھے[۱]، میرزا صاحب نے فردوس مکاں کی مدح میں ۴ قصیدے لکھے تھے۔ پہلے قصیدے کا مطلع ہے:

ہانا اگر گوھرِ جان فرستم بہ نواب یوسف علی خاں فرستم

یہ قصیدہ ۱۱ فروری سنہ ۱۸۵۷ء کو بھیجا گیا تھا[۲]۔ دوسرے قصیدے کا مطلع ہے:

چون نیست مرا شربتِ آبی ز تو حاصل دانم کہ تو دریائی و من سبزۂ ساحل

یہ قصیدہ سنہ ۱۸۵۸ء کے کسی مہینے میں لکھا گیا تھا[۳]۔ تیسرے قصیدے کا مطلع ہے:

تعظیمِ غسلِ صحتِ نواب کم نگیر زان عید کان مضاف بود جانبِ خدیو

یہ ۲۷ نومبر سنہ ۱۸۶۴ء کو روانا کیا گیا تھا[۴]۔ چوتھے قصیدے کا مطلع ہے:

مرحبا سال فرخی آئیں عید شوال و ماہِ فروردین

یہ قصیدہ ۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء اور ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء کے درمیان کہا گیا تھا[۵]۔

عطیات غیر مستقل کی فہرست دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۵۷ء اور سنہ ۵۸ء میں ڈھائی ڈھائی سو روپے کی رقمیں چار بار عطا ہوئی ہیں۔ ان میں سے ۲۳ مارچ سنہ ۵۷ء کی رقم پہلے قصیدے کا انعام ہو سکتی ہے۔ لیکن فردوس مکاں نے بتقریبِ تبریدِ نوشی بھیجنا تحریر کیا ہے۔ سنہ ۵۸ء کی دونوں رقموں میں سے کوئی ایک دوسرے قصیدے کا صلہ ہوگی، مگر فردوس مکاں نے ان کو انعامی رقم کے بجائے امدادی عطیہ ظاہر کیا ہے۔

تیسرا قصیدہ، جو غسلِ صحت کی تہنیت میں لکھا گیا تھا، فردوس مکاں کے حضور میں بکلِ قطعہ پیش کیا گیا تھا، اس لیے اُس کے انعام کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ چوتھے قصیدے پر شاید کوئی انعام نہیں ملا، اس لیے کہ باوجود انتہائی تلاش کے اس سنہ میں کسی عطیے کا پتا نہیں چلتا۔

(۱) مکاتیب: ۲۵ (۲) ایضاً: ۵ (۳) ایضاً: ۱۸ (۴) ایضاً ۲۹ (۵) ایضاً: ۳۳ و ۱۲

اصلاحِ غالب

فروری سنہ ۵۷ء سے اپریل سنہ ۶۵ء تک میرزا صاحب "مصدرِ خدمت" بھی تھے، اور "شریکِ دولت" بھی۔ اپریل سنہ ۶۵ء میں نواب فردوس مکاں کا انتقال ہوا، تو صرف شرکتِ دولت باقی رہ گئی، جس کا سلسلہ میرزا صاحب کے انتقال تک جاری رہا۔

یہ خدمت نواب فردوس مکاں کے کلام پر اصلاح تھی۔ میرزا صاحب کی دستگیری میں نواب فردوس مکاں سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں ہوا۔ وہ ان سے مساویانہ ملتے تھے، اور شاگردانہ وظیفہ مرحمت فرماتے تھے۔ میرزا صاحب نے بھی ان تعلقات کو نعمتِ غیر مترقبہ سمجھا، اور تا بمقدور بڑی تندہی سے سرکار کی خدمت بجا لاتے رہے۔

مروت و تواضع

یہ سرکار تو عالمِ ضعیفی میں اُن کی ملجا و ماویٰ تھی۔ وہ طبعًا اتنے بامروت تھے کہ عام اہلِ سخن کے کلام پر اصلاح سے بھی کبھی دریغ نہ کی، اور یہ مشغلہ اُس وقت بھی ترک نہ ہو سکا، جب کہ اُنھیں کافور و کفن کی پڑی ہوئی تھی۔

شاگردوں سے سلوک بھی تواضع و انکسار پر مبنی تھا، کبھی لکھتے کہ "آپ اپنی طرف سے اس کو استصلاح سمجھتے ہیں، اور میں اس کو اپنی جانب سے استفادہ جانتا ہوں"[۱]، کبھی تحریر کرتے کہ "آپ کا واسطے اصلاحِ کلام کے رجوع کرنا میری طرف موجبِ نازش کا ہے"[۲]۔ شاکر کو لکھا ہے:

"اشعار بعد حکّ و اصلاح کے پہنچے ہیں۔ یہ رتبہ میری ارزش کے فوق ہے کہ میں آپ کے کلام میں دخل و تصرف کروں"[۳]

باتکلف شاگرد کی غلطی پر تنبیہ بھی بڑے لطف اور تہذیب کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ نواب انور الدولہ بہادر شفق سے ایک فاحش غلطی سرزد ہوئی۔ اُس کی طرف ان لفظوں سے متوجہ کیا ہے:

(۱) عود: ۱۵۸ (۲) اردوی: وعود: ۱۵۵ (۳) عود: ۱۵۶، اردوی: ۲۱۴۔

"ہاں، ایک جگہ آپ تحریر میں سہو کر گئے ہیں۔ ای مطربِ جادو فن، بازم رہِ ہوشم زن، دو میسم آپڑے ہیں۔ ایک میم محض بیکار ہے۔ دیگر کی جگہ آپ بازم لکھ گئے ہیں۔ ای مطربِ جادو فن، دیگر رہِ ہوشم زن۔" (۱)

نواب فردوس منزل کو "بے دیے" کی جگہ "بن دیے" کی سفارش میں لکھتے ہیں کہ "میں اپنی طرف سے اس لفظ کی سفارش کرتا ہوں۔ مگر آپ کی اطاعت منظور ہے۔ ایکبا عرض کر کے پھر نہ کہوں گا۔"

شاکر کے اس مطلع کے متعلق فرماتے ہیں:

"کوئی آتا نہیں آگے ترے ہمتا ہو کر آئنہ جب نظر آتا ہے، تو اندھا ہو کر

یہ مطلع دلنشین ہے، مگر اتنا تامل ہے کہ آئینہ کو اندھا کہا چاہیے یا نہیں"۔

طریقِ اصلاح

میرزا صاحب عموماً بین السطور میں اصلاح دیتے تھے۔ اس لیے اسے پسند کرتے تھے کہ شاگرد مسودے میں سطروں کے درمیان گنجائش رکھے۔ (۲) اگر کبھی کسی شاگرد کے پاس سے گنجان لکھے ہوئے اشعار آجاتے، تو انھیں واپس کر دیتے تھے۔ ایک صاحب کو تو صاف لکھ دیا ہے کہ "میرا کام اصلاحِ عبارت ہے، نہ کتابت۔" (۳) دوسرے خط میں گنجان مسودے کو "اوراقِ طلسمی" سے تعبیر کیا ہے۔ (۴)

بنتاب رامپوری کے نام کے ایک خط میں میرزا صاحب نے اپنے طریقِ اصلاح کی وضاحت فرمادی ہے۔ اس دستاویز کی مدد سے ہم اُن کے اُستادانہ طریقِ کار اور اصلاح کی غرض و غایت تک بآسانی پہنچ سکتے ہیں:

"قبلہ، جس شعر پر صاد ہے، وہ بہت خوب ہے۔ اور جس کو کاٹ دیا ہے، وہ معیوب ہے، اور جس پر صاد نہیں، وہ بے عیب اور ہموار، اور جس کے معنے میں مجھے تامل ہے، اوپر نظر، علامت اوس کی نظر۔ باقی جا بجا سنتاب اصلاح اور حقیقت الفاظ لکھدی ہے۔"

ان اصول کی ترتیب حسبِ ذیل ہے:

(۱) معیوب شعر کو قلمزد کر دینا۔

(۱) اردوی: ۳۱۳، عود: ۵۴ (۲) خطوط غالب: ۱/۱۸ (۳) ادبی خطوط: ۲۰۰ (۴) خطوط غالب: ۱/۲۰۱

(۲) جس شعر کے معنی میں تامل ہو، اُس کو نظری قرار دینا۔
(۳) بے عیب اور ہموار شعر کو سادہ چھوڑ دینا۔
(۴) اچھے شعر پر صاد کر دینا۔
(۵) قابلِ تغیر لفظ کو بدل کر منشاءِ اصلاح اور حقیقتِ الفاظ بتا دینا۔

اس سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ میرزا صاحب کا اندازِ اصلاح کتنا دل پسند اور شاگرد کے حق میں کس درجہ مفید تھا۔ وہ شعر میں ایسا دخل و تصرف بہت کم کرتے تھے، جس سے شاعر کے بنیادی خیال میں تغیر ہو جائے۔ اسی لیے ایسے شعروں کو یا تو یکسر قلمزد کر دیتے تھے، یا نظری قرار دے کر چھوڑ دیتے تھے، تاکہ شاعر خود اُس میں مناسب ترمیم کر لے۔ بیتاب کے مسودۂ دیوان میں متعدد شعر قلمزد کر دیے گئے ہیں۔ اسی طرح اُن کے یہاں اور شاکر کی غزلوں کی اصلاح میں کچھ شعر نظری بھی قرار دیے گئے ہیں۔

ہموار شعر کو سادہ چھوڑ کر اچھے شعروں پر میرزا صاحب صاد ضرور بناتے تھے۔ مسودوں میں بعض اشعار پر ایک، بعض پر دو، اور بعض پر تین صاد بھی کیے ہیں۔ صاد کی تعداد بھی زیادتی شعروں کے حسن اور اُستاد کی پسندیدگی کے مختلف درجوں کو ظاہر کرتی تھی۔ وہ صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ اچھے شعر یا غزل کی جی کھول کر داد بھی دیتے تھے۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں:

"ہائے کیا غزل لکھی ہے! قبلہ، آپ فارسی کیوں نہیں کہا کرتے؟ کیا پاکیزہ زبان ہے اور کیا طرزِ بیان! کیا میں سخن ناشناس اور ناانصاف ہوں، کہ ایسے کلام کی حک و اصلاح پر جرأت کروں؟" (۱)

نواب فردوس مکاں اور بیتاب کے مسودوں میں اس قسم کے اکثر جملے ملتے ہیں۔

منشاءِ اصلاح اور حقیقتِ الفاظ بتانا ماہر اُستاد کے لیے لازم ہے، تاکہ اصلاح کی غرض و غایت شاگرد کے ذہن نشین ہو جائے۔ میرزا صاحب صرف کانٹ چھانٹ، اصلاحوں کے منشا کو ظاہر کرتے، جنھیں اُن کے خیال میں شاگرد از خود نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ورنہ صرف الفاظ یا فقرے بدل دیتے تھے۔ یہ عبارتیں ہمیشہ اوراق کے حاشیوں پر درج

(۱) اردو ی: ۳۱۳، عود: ۵۴

کی جاتی تھیں، اور بدلے ہوئے لفظ اکثر بین السطور میں اور کبھی کبھی حاشیے پر لکھے جاتے تھے۔

میرزا صاحب کی اصلاحوں کا سب سے اہم افادی پہلو یہ ہے کہ وہ ایک دو لفظ یا فقرے سے زیادہ تغیر و تبدل نہیں کرتے تھے۔ اُن کی جس قدر اصلاحیں ہمارے سامنے ہیں، اُن میں خود اُن کے کہے ہوئے مصرعے یا شعر شاذ و نادر کا حکم رکھتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اُن کے شاگردوں کے کلام میں اُستاد کے رنگ کی جھلک کم اور اپنی اُفتادِ طبع اور ذوقِ شعری کا اثر زیادہ ہے۔ نیر، شیفتہ، مجروح، بیتاب اور ناظم کے کلام کا مقابلہ کرنے سے یہ حقیقت بخوبی بے نقاب ہو جاتی ہے۔

ناظم کے کلام پر اصلاح

نواب فردوس مکاں ناظم اپنے عہد کے ممتاز عالم اور ادیب تھے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے فلسفی اُن کی فلسفیانہ لیاقت و استعداد کے مداح ہیں۔ ظاہر ہے کہ سرسری اصلاح سے اُن کو ٹالا دینا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ پس یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ میرزا صاحب نے عام شاگردوں کے مقابلے میں اُن کے کلام پر زیادہ گہری نظر ڈالی ہوگی۔

خوش قسمتی سے ناظم کی غزلوں کے چند اصلاحی مسودے دستیاب ہو گئے ہیں۔ اگرچہ غائر مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ مسودے ترتیبِ دیوان کے وقت نظرِ ثانی کے ہیں، اور اس بنا پر ان میں کہیں کہیں معمولی تغیر و تبدل نظر آتا ہے، تاہم انھیں سے یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ میرزا صاحب نے ناظم کی غزلوں کی اصلاح میں کتنی توجہ اور دیدہ ریزی سے کام لیا ہے۔

چونکہ یہ اصلاحیں بھی متفرقاتِ روزگار میں سے ہیں، اس لیے اُن کا نقل کر دینا مناسب ہوگا۔

لو صاحب، آفتاب کہاں اور ہم کہاں	عاقل نہیں (احمق ہیں) ہم اس کو نہ سمجھیں اگر غلط
اوس رخ کا جلوہ مجھکو مضر ہے دلِ فگار	سب چاندنی سے کرتے ہیں گھبا (بنفشہ) کی احتیاط
بے دیدے لے اوڑا کبوتر خط	یوں پہنچتا ہے اوپر اوپر خط

اگر "بن دیے" رکھنا منظور نہیں تو "بے دیے" رہنے دیجے۔ لیکن میرے نزدیک "بن دیے" فیصح ہے۔

چنانچہ میرا شعر ہے:

میں بلاتا تو ہوں اوس کو، مگر اے جذبۂ دل — اوس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

اس سے قطع نظر، یہ جو مثل مشہور زبان زد جمہور ہے کہ "بن آئے کوئی نہیں مرتا"، اس کو کوئی کیا کرے گا۔ غرض کہ میں اپنی طرف سے اس لفظ کی سفارش کرتا ہوں۔ مگر آپ کی اطاعت منظور ہے۔ ایک بار عرض کر کے پھر نہ کہوں گا۔ غالب ۱۲

پڑھ تو لیں گے وہ نامہ میرا بھی — آتے رہتے ہیں اوس کے اکثر خط

"اوس" کا منادالیہ رقیب ہے۔ پس پھر جمع کا صیغہ کیوں لکھا جائے۔ غالب

یوں تو ہو جاتا ہے ہر ایک عیش و عشرت کا شریک — دوست کہتے ہیں اوسے جو ہو مصیبت کا شریک

جہاں "ہر ایک" اچھی طرح نہ آئے، وہاں "ہر یک" لکھیے۔ "ہر ایک" کیوں لکھیے؟ غالب

مبداءِ فیاض سے دونوں ہیں ناظم، بہرہ یاب
میں بھی ہوں اُستاد کے حسنِ طبیعت کا شریک

بلکہ شریک۔ غالب۔

پیری میں بھی بے ولولۂ شوق نہیں ہم — رکھتے ہیں ابھی اک دلِ ہنگامہ گزیں ہم

یہاں "ایک" کی جگہ "اک" بے یائے تحتانی درست ہے۔ مگر "ہر" کے ساتھ "ہر یک" ہو نہ "ہر اک"۔ غالب

سیاحِ جہاں گرد ہیں، آ نکلے یہاں بھی — کچھ تیرے پجاری تو نہیں، اے بتِ جیں، ہم

"آ نکلے ہیں یہاں بھی"۔ "یہاں" بروزن وہاں فصیح نہیں۔ بے ضرورت نہ چاہیے۔ "یہاں" بہ یائے مختلط التلفظ افصح ہے۔ غالب

جو دیدہ بینا ہو تو ہے آپ سے اپنا پردہ کریں — تو بندِ قبا کس طرح وا کریں

وفا شعاری، ناظم یقیں نہیں، نہ سہی — یہ کون شخص ہے، اس کا بھی کچھ خیال نہیں

سبحان اللہ! کیا امیرانہ مضمون ہے۔ غالب

قاصدوں کے کہیں انعام میں بٹ جائے نہ ملک — جلد جلد اب مرے نامے کے جواب آتے ہیں

یہ مضمون سوائے آپ کے کون باندھ سکتا ہے۔ غالب

غلطی غیر کی گفتار کی دیکھی ناظم — وہاں میں جاتا ہوں، تو کہتا ہے: "تو اب آتے ہیں"

ہائے، کیا نیا مضمون ہے! غالب

رونے کی یہ شدت ہے کہ گھبرا گئیں آنکھیں
اشکوں کی "کمی" (۱) یہ کثرت ہے کہ تنگ آ گئیں آنکھیں

ہے یہی گریۂ خونیں، تو کسی دن، ناظم — یوں ہی رہ جائیں گی آپس میں چپک کر پلکیں

"چھپکنا" اور ہے۔ یہاں "چپکنا" منظور ہے۔ غالب

وہ بھرا چاہتے ہیں دوزخ بھی — یہاں "تہی" خواہش کہ ہم کو جنت ہو
ہوئے ہو ایک بتِ دلفریب پر عاشق ق — زلیں کہ آپ کو ناکردہ کار سمجھے ہو
صلاح و مشورہ رکھتے ہو مجھ سے اور مجھے — فنونِ عشق کا آموزگار سمجھے ہو
شریکِ دولتِ ناز و نیاز رکھتے ہو — انیسِ خلوتِ شبہای تار سمجھے ہو
اگرچہ خوش ہوں، پر آتا ہے رحم بھی تیر — کہ مجھ سے غمزدہ کو غمگسار سمجھے ہو

ہای، کیا قطعہ ہے! غالب

نالے کے مجھے طور بہت یاد ہیں لیکن — طاقت کا گماں بھی "نہ" دلِ غمزدہ پر کچھ
تم آؤ جاؤ صومعہ میں ایک دن کہ "یاں" — "اپنے کو آپ کہیں" مردمِ دیندار کھینچتے
لگاوٹ غیر سے دیکھو اسی جلکر خاک ہو جاتے — بجھے گر نہ ہم دل میں کہ وہ بھبھر کس کا ہے
ہو رات "بھر" جیتے رہیں امیدِ سحر پر — یہ روزِ سیہ ہے، شبِ دیجور نہیں ہے
خستۂ پیکانِ غم ہر "ایک" جوان و پیر ہے — اور پھر دیکھو تو ترکش ہی میں پنہاں تیر ہے
ملا کر منہ سے منہ بوسہ دقن کا دیکھ کہتے ہیں — "پیا سے پاس کیا آنا کنوئیں کا امرِ مشکل ہے!" (۲)

اگر "پیا سے" کے لفظ میں یای تحتانی کا اعلان نہ منظور ہو تو آغازِ مصرع میں کاف لکھ دیجو۔ غالب

دیکھے دل مل گئی دلبر کی طبیعت مجھ سے — سیکھتے آتا ہے آئینِ محبت مجھ سے

سبحان اللہ! اس غزل میں معشوق کے عاشق ہونے کا بیان کیا خوب ہے! اگرچہ

(۱) بظاہر یہ کتابت کی غلطی تھی۔ عرشی

(۲) یعنی مصرع اس طرح بنا لیا جائے: "کہ پیا سے پاس کیا آنا کنوئیں کا امرِ مشکل ہے"۔ عرشی

معشوق کے معشوق کو مخاطب نہیں کیا، مگر معشوق کو کس کس لطف سے سمجھایا ہے! غالب

تنگ ہوں جینے سے، اب مرنا کہاں! ~~سچ ہے آزرد ہونے سے بچتا ہے~~ (ضبط ہو جانے سے بچتی)

مانا ہے محبو قیسِ بیاباں نورد نے گر پوچھتی (۱) ہے لیلیٰ محمل نشیں تجھے

یہاں "پوچھنا" بمعنیٔ پرستش ہے، "پوچھنا" بمعنیٔ پرسش نہیں۔ غالب ؒ

لکھ کے دو بحروں میں، ناظم، یہ غزل ناز شِ حسنِ طبیعت ہے مجھے

دو بحریں ایک تو یہ "فعلاتن فعلاتن فعلن"۔ دوسری یہ "فاعلاتن فاعلاتن فاعلن"

کیا اچھی صنعت ذو بحرین کی، اور پھر باوجود رعایتِ صنعت، اشعار کیا خوب! غالب

میرزا صاحب کی اصلاح کا دائرہ انشا اور املا دونوں کی غلطیوں کو محیط تھا۔ چونکہ املا کے معاملے میں وہ چند مخصوص نظریے رکھتے تھے، اس لیے اُن اصلاحوں سے "املای غالب" میں بحث کی جائے گی۔

(۱) یہ بھی کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

انشای غالب

میرزا صاحب کے عہد تک ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ فارسی زبان میں اظہارِ خیالات پسند کرتا، اور دلی زبان کا پایہ اپنے مرتبے سے فروتر جانتا تھا۔ عرصۂ دراز تک میرزا صاحب بھی اسی روشِ عام کے دلدادہ رہے؛ لیکن رفتہ رفتہ اُن کی فارسی خط کتابت کی جگہ اردو نے حاصل کرنی شروع کردی، جو آخرِ عمر تک پہنچکر اُن کے اظہارِ خیالات کا واحد ذریعہ ہوگئی۔

اردو انشا کا آغاز اور خواجہ حالی کی رائے

اردو مراسلت کی ابتدا کے متعلق خود میرزا صاحب کا کوئی تصریحی بیان موجود نہیں ہے۔ البتہ خواجہ حالی مرحوم فرماتے ہیں:

"معلوم ہوتا ہے کہ میرزا سنہ ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط کتابت کرتے تھے۔ مگر سنہ مذکور میں جبکہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے، اور ہمہ تن مہر نیمروز کے لکھنے میں مصروف ہوگئے، اُس وقت بضرورت اُن کو اردو میں خط کتابت کرنی پڑی ہوگی وہ فارسی نثریں اور اکثر فارسی خطوط، جن میں قوت متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے، نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب اُن کی ہمت مہر نیمروز کی ترتیب و انشا میں مصروف تھی، ضرور ہے کہ اُس وقت اُن کو فارسی زبان میں خط کتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرز خاص میں شاق معلوم ہوئی ہوگی۔ اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ اُنھوں نے غالباً سنہ ۵۰ء کے بعد سے اردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں"۔

مولانا مہر کا اختلاف

مولانا غلام رسول مہر کو خواجہ صاحب کی رائے سے اختلاف ہے:

"اس لیے کہ اول تو ہر نیرنگ" کوئی بڑی کتاب نہیں، جس کی ترتیب میں غالب کے اوقات کا بیشتر حصہ صرف ہوتا ہوگا۔ یہ کتاب اُنھوں نے کم از کم دو برس میں مرتب کی۔ موجودہ مطبوعہ صورت میں اُس کے کل ۱۱۸ صفحے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ باعتبارِ اوسط وہ سال بھر میں زیادہ سے زیادہ پچپن ساٹھ صفحات لکھتے رہے، اور یہ غالب جیسے قادرالکلام اور مشاق نثر نگار کے لیے کوئی بہت بڑا کام نہیں، جس کی تکمیل کے سلسلے میں اُنھیں فارسی خط و کتابت ترک کرنی پڑی ہو۔

پھر خط و کتابت میں اُن کا عام انداز اُلجھا ہوا نہ تھا۔ بلکہ جو کچھ لکھتے تھے، عموماً بلا تکلف لکھتے تھے۔ ... اردو خطوط کی طرح فارسی خطوط میں بھی تکلفات سے آزادگی ہر مقام پر ظاہر ہے۔

سب سے آخر میں یہ کہ فارسی مکاتیب میں ایک خط منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام ہے، جس میں سرکے لیے لنگی کی فرمائش کی ہے۔ اس خط پر مطبوعہ "پنج آہنگ" میں یکم دسمبر سنہ ۱۸۴۸ء کی تاریخ ثبت ہے۔ اردوئے معلی کے ایک خط میں بھی منشی جواہر سنگھ سے لنگی کا تقاضا موجود ہے یہ دونوں خط لازماً ایک دوسرے سے قریب کے زمانے میں لکھے گئے ہوں گے۔ میرا خیال یہی ہے کہ غالب ۱۸۵۰ء سے قبل اردو خط و کتابت شروع کر چکے تھے۔ لیکن چونکہ اُس زمانے میں اردو نثر کو اہلِ علم چنداں وقیع نہیں سمجھتے تھے، اس لیے وہ خط محفوظ نہ رہ سکے۔ بعد میں جیسے جیسے اردو کا رواج بڑھتا گیا، اور فارسی کا تداول کم ہوتا گیا، غالب فارسی کے بجائے زیادہ تر اردو میں خط لکھتے رہے۔" (۱)

قاضی صاحب کی رائے

قاضی عبدالودود صاحب (پٹنہ) اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

(۱) غالب: ۲۰۰، طبع ثانی۔ حقیر موشی نے مکاتیب غالب کی پہلی اشاعت میں مولانا مہر کے دلائل سے اختلاف کرتے ہوئے جو کچھ لکھا تھا، اُس کے ملاحظے کے بعد مولانا نے اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں مناسب ترمیم فرمادی ہے اس لیے مکاتیب کے اس ایڈیشن میں بھی تغیر و تبدل کیا گیا ہے۔

"غالب کا کوئی بیان ایسا موجود نہیں، جس سے یہ معلوم ہو کہ ۱۸۵۰ء تک غالب نے کسی کو اردو میں خط لکھا ہی نہیں۔ حالی کا مطلب "ہمیشہ" سے بیشتر ہے۔ ابتدا میں غالب کا یہ حال تھا کہ وہ خطوط بڑی محنت سے لکھتے تھے، اور اس کو اظہار کمال کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس لیے اُن کے خط زیادہ تر فارسی میں ہوا کرتے تھے، جو اُن کے نزدیک اردو کے مقابلے میں اس کے لیے زیادہ موزوں تھی۔ بعد کو جب وہ محنت سے گھبرانے لگے، تو اردو میں زیادہ اور فارسی میں کم خط لکھنے لگے۔ ۱۸۵۰ء کے بعد کے بھی اُن کے فارسی خط موجود ہیں۔ قطعی طور پر فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ صورت حال کب بدلی، لیکن اس کا زمانہ یقیناً سنہ ۱۸۵۰ء سے پہلے ہے۔"(۱)

میری ناقص رائے میں اس کا امکان تو ہے کہ سنہ ۱۸۵۰ء سے بیشتر بھی میرزا صاحب نے اردو میں مراسلت کی ہو، مگر جہاں تک تاریخی تحقیق کا تعلق ہے اُن کا کوئی ایک اردو خط بھی ایسا موجود نہیں ہے، جسے یقینی طور پر سنہ مذکورہ سے قبل کا کہا جا سکے۔

مہر صاحب فرماتے ہیں کہ جوہر کے نام میرزا صاحب کا وہ اردو خط جس میں لنگی کا تقاضا ہے سنہ ۱۸۴۸ء کے قریب کا ہے اس لیے کہ لنگی کی فرمایش پر مشتمل فارسی خط پہلی دسمبر سنہ مذکور کو لکھا گیا تھا۔

پنج آہنگ اور اردوی معلی میں چھ خط جوہر کے نام پائے جاتے ہیں۔ ان کی تاریخی ترتیب حسب ذیل ہے:

۱) مکتوب فارسی: مورخہ یکم دسمبر سنہ ۱۸۴۸ء (لنگی کی فرمایش)
۲) مکتوب اردو: غیر مورخہ (لنگی کا تقاضا)
۳) مکتوب فارسی: مورخہ ۱۱ جون سنہ ۱۸۵۲ء (مہر نیمروز کے مسودے کی رسید کا تقاضا)
۴) ایضاً: مورخہ ۱۰ اگست سنہ ۱۸۵۲ء (قصیدۂ تہنیت عید کی سرگذشت)
۵) مکتوب اردو: مورخہ ۹ اپریل سنہ ۱۸۵۳ء (غزل کی اصلاح)

(۱) رسالۂ سہ مردینہ: ج ۵ نمبر ۱ ص: ۳

۶) ایضاً: مورخہ ۲ فروری سنہ ۱۸۶۴ء (جوہر کے تبادلے پر اظہارِ مسرت)

ان میں سے پہلے اور تیسرے خط میں ساڑھے تین سال، چوتھے اور پانچویں میں آٹھ مہینے، اور پانچویں اور چھٹے میں دس سال سے زیادہ کا فرق ہے۔ کمترِ مدت تیسرے اور چوتھے مکتوب کے درمیان ہے، جو ۳ ماہ ہوتی ہے۔

اب محولۂ بالا مکتوب نمبر ۲ کی اصل عبارت ملاحظہ ہو۔ میرزا صاحب فرماتے ہیں:

"کیوں صاحب، وہ ہماری لنگی اب تک کیوں نہیں آئی؟ بہت دن ہوے، جب تم نے لکھا تھا کہ اسی ہفتے میں بھیجوں گا۔" (۱)

اس عبارت کا جملہ "بہت دن ہوے" غور طلب ہے۔ چونکہ میرزا صاحب کے فارسی خطوط نمبری ۳ اور ۴ میں یہ شکایت کی گئی ہے کہ بہت دنوں سے تمہارا خط نہیں آیا، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جوہر خطوں کے جواب میں بیحد سست تھے۔ اور اُن کے نام کے خطوط کے درمیانی وقفے ہمیں معلوم ہیں، لہٰذا کچھ بعید نہیں ہے کہ انھوں نے لنگی بھیجنے میں ڈیڑھ دو برس گزار دیے ہوں۔

یہاں ایک اور امر قابلِ بیان ہے۔ جہاں تک میں نے جستجو کی ہے، باستثنائے نواب فردوس مکاں، ایسا کوئی مکتوب الیہ نہیں ہے، جس کو میرزا صاحب فارسی میں خط لکھتے ہوں اور پھر فارسی مراسلت کے درمیان میں کوئی اردو خط اُسے لکھا ہو۔ جب وہ کسی سے اردو میں مراسلت شروع کر دیتے ہیں تو اس کے بعد اُس کو فارسی خط نہیں لکھتے۔ جوہر کے نام سنہ ۴۸ء میں ایک اور اس کے بعد سنہ ۵۲ء میں دو فارسی خط لکھے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ درمیان میں اردو کا خط کیوں تحریر کیا گیا؟

اس خط میں میرزا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ ہیرا سنگھ نے بڑی کوشش سے بادشاہ کے ہاتھ کے قطعے مہیا کر لیے ہیں، اب ولیعہد کے دستخطی قطعات کی فکر میں ہے۔ میں بھی اُس کی مدد کر رہا ہوں۔ میرے نزدیک ولیعہد سے مراد میرزا فخرو ہیں، جو ۱۸۴۹ء میں دارالبخت کے انتقال کے بعد ولیعہد اور سنہ ۱۸۵۴ء میں میرزا صاحب کے

(۱) خطوط: ۱، ۱۰۵

شاگرد ہوئے تھے، اسی لیے ان کے دستخطی قطعوں کی تحصیل میں میرزا صاحب نے مدد دی ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر میں تنگی کے تقاضے والے اردو خط کو فارسی کے خط مورخہ اگست سنہ ۵۲ء کے بعد کا مانتا ہوں، اور ایک دو اور تقاضائی خطوں کو گم شدہ تصور کرتا ہوں۔

قاضی عبدالودود صاحب تفتہ کے نام کے دو خطوں کو سنہ ۵۰ء سے قبل کا قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک جو "خطوطِ غالب" کے مرتب کی مانے میں اگست سنہ ۱۸۵۰ء کا نوشتہ ہے یقیناً ۴ جولائی سنہ ۵۰ء کے بعد لکھا گیا تھا۔ اس لیے کہ اس میں میرزا صاحب نے تفتہ کے ایک تاریخی مصرع کی تعریف و توصیف کر کے لکھا ہے کہ "اب آپ اس سات بیت کے قطعے کو اپنے دیوان میں داخل اور شامل کر دیجے، یعنی قطعوں میں لکھ دیجے جب تمہارا دیوان چھاپا جاوے گا، یہ قطعہ بھی چھپ جاوے گا۔" (۱)

قاضی صاحب اس آخری جملے سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ ابھی تفتہ کا دیوان چھپنا شروع نہیں ہوا تھا، کہ انھوں نے یہ قطعہ کہا۔ اور آغازِ طباعت دیوان اوائلِ سنہ ۱۲۶۵ھ کا واقعہ ہے، لہٰذا اس قطعے کو اس سے پہلے کا ہونا چاہیے، اور اسی زمانے میں میرزا صاحب کا یہ خط لکھا جانا چاہیے۔ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ تفتہ نے اس مصرعِ تاریخ میں لفظ "فر" لکھ کر کچھ تردد ظاہر کیا تھا۔ میرزا صاحب نے اس خط میں انھیں یقین دلایا ہے کہ یہ لفظ مکمل باہر نہیں ہے۔ دیوانِ تفتہ (ص ۶۲۳) میں ایک سات بیت کا قطعۂ تاریخ پایا جاتا ہے، جس میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا عنوان ہے:

"تاریخ عطای خلعت و خطاب بہ میرزا محمد اسد اللہ خان بہادر غالب تخلص از پیشگاہ شاہی"

میرزا صاحب کو خلعت و خطاب ۲۳ شعبان سنہ ۱۲۶۶ھ (۴ جولائی سنہ ۱۸۵۰ء) کو پیشگاہِ شاہِ دہلی سے عطا ہوا تھا۔ لہٰذا یہ قطعہ بالیقین اس تاریخ کے بعد لکھا گیا، اور میرزا صاحب نے اپنے جس خط میں اس کا ذکر کیا ہے، وہ بھی حتماً اس کے بعد ہی کا مکتوب ہے، جو ممکن ہے کہ اگست میں یا اس کے بھی بعد میرزا صاحب نے ارسال کیا ہو۔ چونکہ تفتہ کا دیوان اواخر سنہ ۱۲۶۰ھ میں شروع اور اوائلِ سنہ ۱۲۶۷ھ میں چھپکر

(۱) خطوط: ۱/ ۲۰۔

تمام ہوا ہے، اس لیے کوئی معترض یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ پھر اُس دیوان میں اسے شامل کس طرح کیا گیا۔

اب وہ خط رہا، جو مرتبِ "خطوطِ غالب" کی رائے میں اگست سنہ ۱۸۴۹ء کا اور قاضی صاحب کے خیال میں سنہ ۱۸۴۷ء کا مکتوبہ ہے۔ اس خط میں غالب نے دیوانِ نسخہ کی تقریظ کے کچھ لفظوں میں تغیر و تبدل کر دینے کی اطلاع دی ہے۔

قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ دیوانِ نسخہ کا اشتہار اسعد الاخبار (اکبر آباد) کی ۱۸ دسمبر سنہ ۱۸۴۸ء (۲۱ محرم سنہ ۱۲۶۵ھ) کی اشاعت میں ان لفظوں سے دیا گیا تھا: (۱)

"ان دنوں دیوانِ نسخہ سکندر آبادی اس مطبع میں چھپنا شروع ہوا ہے۔ اور یہ وہی دیوان ہے جس کا اشتہار اخبارِ ہذا میں اواخر سنہ ۱۸۴۷ء میں دیا گیا تھا۔ بسبب عدیم الفرصتی کے اب تک ملتوی رہا۔ اب اس کی تدبیر کی گئی ہے"

اس کے بعد ۳۰ اگست سنہ ۱۸۴۹ء (۲۹ رمضان سنہ ۱۲۶۵ھ) کو اخبار مذکور میں یہ اطلاع شائع ہوئی:

"دیوان نسخہ، جو اس مطبع میں چھپتا ہے، ربع سے زیادہ چھپ چکا۔ وہ بھی اس موسم سرما میں انشاء اللہ تعالیٰ تمام ہوگا"

دیوان نسخہ اوائلِ سنہ ۱۲۶۵ھ (اواخرِ سنہ ۱۸۴۸ء) میں چھپنا شروع ہوا، اور اوائلِ سنہ ۱۲۶۶ھ (اواخرِ سنہ ۱۸۵۰ء) میں چھپ کر تمام ہوا۔ میرزا صاحب کی تقریظ دیوانِ نسخہ کے شروع میں چھپی ہے، اور اس کے آخر میں حقیر کا قطعۂ تاریخ آغاز (سنہ ۱۲۶۵ھ) مندرج ہے۔ ان حقائق کو سامنے رکھ کر قاضی صاحب یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ میرزا صاحب کی تقریظ اواخرِ سنہ ۱۸۴۷ء میں، جب کہ پہلی بار دیوانِ نسخہ کی طباعت کا اشتہار دیا گیا تھا، مطبع میں پہنچ چکی تھی، اور اواخرِ سنہ ۱۸۴۸ء (اوائلِ سنہ ۱۲۶۵ھ) میں اس کی طباعت ہو چکی تھی۔ اور یہ تسلیم کر لینے کے بعد یہ امر از خود ثابت ہو جاتا ہے کہ تقریظ کا سالِ تصنیف کم از کم سنہ ۱۸۴۷ء ہے، اسی سال اس میں تغیر و تبدل ہوا، اور اسی سال

(۱) عمادر (پٹنہ) ج ۴ نمبر ۶ ص ۴۹

میرزا صاحب نے وہ خط لکھا جس میں تفتہ کو اس تغیر کی اطلاع دی گئی ہے۔
میری عرض یہ ہے کہ قاضی صاحب کا یہ ارشاد قابلِ تسلیم نہیں کہ چونکہ تقریظ دیوان کے آغاز میں طبع ہوئی ہے، اس لیے اس کا چھاپا بھی اوائلِ سنہ ۱۲۶۵ھ میں تمام ہو چکا ہوگا۔ اس لیے کہ یہ سرورق کے دوسرے رُخ سے شروع ہوتی ہے، اور سرورق پر مہتمم مطبع نے لکھا ہے:

"این نسخۂ عجیبہ و مجموعۂ لطیفہ، المسمی بہ دیوان تفتہ، در مطبع اسعد الاخبار اکبر آباد، باواخر سنہ ۱۲۶۵ھ شروع گردیدہ باوصف انواع موانع و عوائق در اوائل سنہ ۱۲۶۷ھ باختتام رسید۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ تقریظ سنہ ۱۲۶۵ھ کے بجائے، ختمِ اصلِ دیوان کے بعد اوائلِ سنہ ۱۲۶۷ھ میں چھاپی گئی تھی، ورنہ سرورق پر خاتمے کا سنہ نہیں لکھا جا سکتا تھا۔
اور نہ اُن کا یہ دعویٰ قطعی ہے کہ اواخرِ سنہ ۱۸۴۷ء سے قبل یہ تقریظ مالکِ مطبع کے پاس پہنچ چکی تھی، اس لیے کہ اسعد الاخبار کی اشاعتِ مورخہ ۲۰ اگست سنہ ۱۸۴۹ء (۲۹ رمضان سنہ ۱۲۶۵ھ) میں پہلی بار میرزا صاحب کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا ہے:

"اکثر اشخاص اس کے طبع ہونے کی خبر سن کر بہت خوش ہوئے ہیں، خصوصاً اسد اللہ خاں غالب دہلوی تو اس کے بہت ثنا خواں ہیں؟"

بظاہر یہ ثنا خوانی تقریظ ہی میں کی گئی تھی، اس لیے سنہ ۱۸۴۷ء میں مالکِ مطبع کے پاس تقریظ جا چکی تھی، تو اُس نے پہلے اور دوسرے اشتہار میں اُس کا ذکر کیوں نہیں کیا جب اواسطِ سنہ ۱۸۴۹ء میں میرزا صاحب کی پسندیدگی کا پہلی بار ذکر کیا گیا ہے، تو لازماً اُسی زمانے میں اس کا اظہار بھی کیا گیا ہوگا۔ میری رائے یہ ہے کہ میرزا صاحب نے ۱۰ فروری سنہ ۱۸۴۹ء اور ۲۰ اگست سنہ مذکورہ کی درمیانی مدت میں یہ تقریظ لکھی ہے۔ اس کی بنا یہ ہے کہ اس تاریخ کو میرزا صاحب نے تفتہ کو ایک فارسی خط لکھا ہے۔ اُس میں فرماتے ہیں:

"دیروز کہ آدینہ ۱۵ ماہ ربیع الاول و ۹ فروری بود، نامۂ شما رسید، و پدید آمد کہ حالیا از اکبر آباد بسفر اودھ متعرا مکبول رسیدہ اید۔ ازاں دو ہزار بیت کہ نوشتہ اند کہ در

اکبرآباد گفتہ ام، ماہم دراوراق اخبار اکبرآباد غزلی مشاہدہ کردہ ایم. خوش گفتہ آمد
وبراہی کہ ما می خواستیم، رفتہ اند۔" (۱)

چونکہ ۱۰ فروری سنہ ۱۸۴۹ء تک میرزا صاحب نے تفتہ کے تازہ کہے ہوئے ۲ ہزار شعر نہیں دیکھے تھے، اس لیے یہ قیاس کرنا بجا ہے کہ تفتہ نے پہلے ان شعروں کو میرزا صاحب کی خدمت میں اصلاح کے لیے پیش کیا، اور اس کے بعد دیوان کی طباعت شروع کرائی ہوگی، اور چونکہ میرزا صاحب اظہارِ رائے میں بڑے محتاط تھے، اس لیے تفتہ کو ان سے دیباچے کی درخواست تازہ کلام دکھا دینے کے بعد کرنا چاہیے۔ ۲۰ ماہ اگست سنہ ۱۸۴۹ء کے اشتہار میں اس کا ذکر آنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس تاریخ سے قبل میرزا صاحب نے اسے لکھ کر بھیجا تھا، اور اواخر سنہ ۱۸۵۰ء میں چھاپے جانے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ طباعت شروع ہو جانے کے بعد میرزا صاحب نے اسے ارسال کیا تھا۔

اب صرف یہ مسئلہ باقی رہتا ہے کہ اس میں ترمیم کب ہوئی؟ میری رائے یہ ہے کہ یہ ترمیم اواخرِ سنہ ۱۸۵۰ء میں تقریظ کے چھاپے جانے سے کچھ قبل کا واقعہ ہے، اور چونکہ اُس زمانے میں میرزا صاحب زیادہ تر اردو میں خط لکھنے لگے تھے، اسی لیے انھوں نے ترمیم کی اطلاع اردو مکتوب کے ذریعے دی ہے۔

اردو پر انحصار

"پنج آہنگ" کے خاتمے میں فارسی مراسلت بالکل ترک کر کے صرف اردو میں خط کتابت کرنے کی تاریخ خود میرزا صاحب نے بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں:

"یزدان داند، و مدعیان دانش را توفیق دانستن دہد تا دانند کہ خامۂ غالب سیہ نامہ مسلک دشوار گزار پارسی آمیختہ بتازی را بکدام دلاویز رفتار پیمودہ است۔ درین شصت و ہشت سالہ زندگی کہ چیزہ دریا مدی دکل در سخن طرازی گزشت و بسا گزین روشہا در نثر نظر فروز آمد از دو سال در بند آن بودم کہ ... دیگر ورخامہ فرسائی انداز خود نمائی فرو ہلم ... پنجاہ سال فی پی برگ را بہ ہنجار اردو سرایان پارس بہ نواداشتہ ام۔ اکنون

(۱) پنج آہنگ: ۴۰۶، طبع دہلی سنہ ۱۸۵۳ء

آن روش فرو گذاشته ام۔ پس مانی الضمیر را کہ یاران نزدیک و دور عرضہ باید داد، در زبان اردو دی و آن ہم سرسری و از تکلف بری رقم فرا ہم کرد، تا زندگی آسان گردد۔"(۱)

یہ خاتمہ سنہ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) میں لکھا گیا تھا، جبکہ میرزا صاحب کی عمر ۶۶ سال کی تھی۔ اُنھوں نے اس ۶۸ سالہ زندگی میں سے ۱۷ سال کھیل کود میں گزار کر ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) سے ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا، اور تقریباً ۵۰ سال فارسی نظم و نثر لکھتے رہے تھے۔ لیکن سنہ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) سے دو سال قبل سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں یہ عزم کیا تھا کہ اب فارسی آمیختہ و ناآمیختہ بتازی کو ترک کر کے سادہ اردو میں اظہارِ مطالب کرینگے، کیونکہ فارسی کے لیے جس فراغِ خاطر و قوتِ دماغ کی ضرورت تھی، غلبۂ پیری کے سبب سے میرزا صاحب اُس سے محروم ہو چکے تھے۔ اردوی معلی اور عود کے مختلف خطوط سے اس کی تصدیق بھی ہوتی ہے، کہ میرزا صاحب نے سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) سے قبل ہی فارسی نگاری سے احتراز کرنا شروع کر دیا تھا۔ بخشی تیہ ۵ ستمبر سنہ ۱۸۵۹ء (صفر سنہ ۱۲۷۶ھ) کو جنون بریلوی کو لکھتے ہیں:

"فارسی کیا لکھوں؟ یہاں ترکی تمام ہے۔ اخوان و احباب یا مقتول یا مفقود الخبر، ہزار آدمی کا ماتم دار ہوں۔ آپ غمزدہ اور آپ غمگسار ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ تباہ اور خراب ہوں، مرنا سر پر کھڑا ہے۔ پا برکاب ہوں۔"(۲)

رفعت بھوپالی کو ۴ ربیع الاول سالِ مہ رستاخیز" (۸ ۱۲۷۸ھ ۱۸۶۱ء) کو تحریر کرتے ہیں:

"از دیر باز بہ نظم و نثر نمی گرایم۔ نظم، خواہی پارسی و خواہی اردو، خوابی ست فراموش۔ نامہ در پارسی نوشتن نیز آئین نماندہ۔ ہر چہ نوشتہ می شود یک دست دارد دست۔ اینک... مولانا عباس... از بھوپال فرمان فرستاد کہ غالب نامہ در پارسی زبان نویسد۔ یارب! فرمان چون بجا آورم؟ دو رنامہ چہ نویسم؟ باری نہ از توانائی بنان بلکہ از فرمانروائی آن فرمان جنبش خامہ لغزشی چند کہ بخواندن نیرزد، بر روی ورق نہادم۔"(۳)

(۱) کلیات نثر فارسی: ۲۵۴ (۲) عود: ۱۶۵ و خطوط: ۱، ۱۱۷

(۳) انشای دورچین: ۵۱، و کلیات نثر فارسی: ۲۷۵۔ لیکن عبارت میں قدرے تغیر و تبدل ہے۔

ان دونوں خطوں میں میرزا صاحب نے ترکِ فارسی نگاری کا سبب غلبۂ رنج و غم اور ضعفِ پیری کو قرار دیا ہے۔ یہی سبب شاکر کے نام کے مکتوب میں بھی ذکر کر چکے ہیں۔ اب اگر ہم تمام دلائل کو سامنے رکھ کر نتیجہ نکالنے کی کوشش کریں، تو وہ یہ ہوگا کہ میرزا صاحب ایک ایسے دشوار گزار مسلکِ فارسی نگاری کے موجد تھے، جو اطمینانِ خاطر و توانائیٔ دماغ و قلب کا متقضی تھا۔ سنہ ۱۸۵۰ء (۱۲۶۶ھ) تک یہ دونوں اسباب میسر رہے، اس لیے میرزا صاحب تقریباً اسی زبان میں عامہ فرسائی کرتے رہے۔ لیکن سنۂ مذکورہ میں بادشاہِ ظفر نے تاریخ نگاری کی خدمت سپرد کی اور فراغِ خاطر میں کمی ہو گئی، تو میرزا صاحب نے فارسی کے ساتھ اردو نثر کو بھی نوازنا شروع کیا۔ سنہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء) میں ذوق کا انتقال ہوا تو اصلاحِ کلام بھی میرزا صاحب کے سپرد کی گئی، اور یہ فرصت سے بالکل محروم ہو گئے، جس کے سبب مسلکِ فارسی کی گامزنی کے لیے اور کم وقت میسر آنے لگا اور اردو کو مزید غلبہ حاصل کرنے کا موقع ملا۔ سنہ ۵۷ء کے بعد ہجومِ مصائب و آلام نے اطمینانِ خاطر کا قطعی خاتمہ کر دیا۔ نیز افکار کی زیادتی اور معاشی پریشانی کے سبب رفتہ رفتہ امراض مستولی ہوتے گئے۔ اب اردو نہایت سرعت کے ساتھ اُن کی انشا پر چھانے لگی، تا آنکہ سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں میرزا صاحب کو عزم کرنا پڑا کہ آیندہ فارسی میں نظم و نثر کچھ نہ لکھیں گے۔ لیکن اس عہد کی عملی تکمیل سنہ ۱۸۶۵ء میں ہوئی چنانچہ آج ہمارے پاس سنۂ مذکورہ کے بعد کی فارسی تحریریں کالمعدوم ہیں۔

اردو کی فرمایش

میرزا صاحب اپنے عہد کے ممتاز فارسی ادیب تھے، اور اکثر اربابِ علم و فضل کی طرح اسی کو سرمایۂ نازش و افتخار خیال کرتے تھے۔ جب بعض معاصرین نے اپنی اردو

(۱) میرزا صاحب نے سنہ ۵۰ء سے پہلے قدر بلگرامی کو اپنی غیر مطبوعہ فہرست کا حال لکھا ہے، فرماتے ہیں: "رہا جواب کا لکھنا۔ کاش آپ یہاں ہوتے اور میرا حال دیکھتے۔ ہر روز صبح کو قلعہ جاتا اور دوپہر کو آتا۔ بعد کھانا کھانے کے حضرت کے مسودوں کا درست کرنا۔ احباب کے خط لکھنے کی فرصت بہت کم ہاتھ آتی ہے۔ (اردوی معلی، لاہور ایڈیشن، صفحۂ سرتوش)۔ یہ اردو خطوط کے جواب کے متعلق عذر ہے۔ ایسی حالت میں فارسی نگاری کی مہلت ملنے کی امید رکھنا کس طرح قرینِ صواب ہو سکتا ہے؟

شاعری کے بل بوتے پر اُن کی ہمسری کا دعویٰ کیا، تو اُنھیں اپنے کلام اردو کی تمام خوبیوں سے قطع نظر کر کے میدانِ سخن کے ان یکّہ تازوں سے کہہ دینا پڑا:

فارسی بیں، تا ببینی نقشہای رنگ رنگ — بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ منست
راست میگویم من و از راست سر نتوان کشید — ہر چہ در گفتار فخر است آن ننگِ منست (۱)

میرزا صاحب کا یہ خیال نظمِ اردو ہی تک محدود نہ تھا۔ وہ نثرِ اردو کو بھی اپنے پایۂ کمال سے فروتر جانتے تھے۔ چنانچہ منشی شیو نرائن کے توسط سے ہنری اسٹارٹ ریڈ صاحب نے نثرِ اردو کی فرمائش کی، تو میرزا صاحب نے ۱۱ دسمبر سنہ ۱۸۵۸ء کو منشی صاحب کو لکھا:

"مگر بھائی غور کرو، اردو میں میں اپنے قلم کا زور کیا صرف کروں گا؟ اور اوس عبارت میں معانیٔ نازک کیونکر بھروں گا؟" (۲)

۱۸ دسمبر کو دوبارہ لکھا ہے:

"جناب ریڈ صاحب صاحبی کرتے ہیں۔ میں اردو میں اپنا کمال کیا ظاہر کر سکتا ہوں۔ اوس میں گنجایشِ عبارت آرائی کی کہاں ہے؟ بہت ہوگا تو یہ ہوگا کہ میرا اردو بہ نسبت اوروں کے اردو کے فصیح ہوگا۔" (۳)

۴ جنوری سنہ ۵۹ء کو لکھا ہے:

"میاں! اردو کیا لکھوں؟ میرا یہ منصب ہے کہ مجھ پر اردو کی فرمائش ہو؟" (۴)

نظم و نثر سہل ممتنع ہے

اس کے باوجود میرزا صاحب یہ ضرور جانتے تھے کہ اُن کا کلام نظم ہو یا نثر، حسن و خوبی کے اُس درجے پر پہنچ چکا ہے، جسے علمای بلاغت "سہل ممتنع" کہتے ہیں۔ چنانچہ تیجر کے ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

"پیر و مرشد!.... سہل ممتنع اوس نظم و نثر کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اوسکا جواب نہ ہو سکے۔ بالجملہ سہل ممتنع کمال حسنِ کلام ہے، اور بلاغت کی نہایت۔"

(۱) کلیاتِ نظمِ فارسی: ۱۳
(۲) اردوی: ۳۰۳ و خطوط: ۱: ۳۸۹
(۳) ایضاً: ۳۰۶
(۴) ایضاً: ۳۰۶

ممتنع درحقیقت ممتنع النظیر ہے۔ شیخ سعدی کے بیشتر فقرے اس صفت پر مشتمل ہیں، اور رشید وطواط وغیرہ شعرای سلف نظم میں اس شیوہ کی رعایت منظور رکھتے ہیں۔ خود ستائی ہوتی ہے۔ سخن فہم اگر غور کرے گا، تو فقیر کی نظم ونثر میں سہل ممتنع اکثر پائے گا۔" (۱) [illegible]

جہانتک میرزا صاحب کی نثر اردو کا تعلق ہے واقعہ یہ ہے کہ وہ شیخ سعدی کی "گلستان" کی طرح بظاہر اس قدر سہل معلوم ہوتی ہے کہ انسان سمجھتا ہے میں بھی ایسی نثر لکھ سکتا ہوں؛ مگر جب لکھنے بیٹھتا ہے، تو ایک جملہ بھی نہیں لکھ سکتا۔ اور یہی کلام کی خوبی کی آخری حد ہے، جس تک رسائی کے لیے زور دماغ سے زیادہ بخشش معنوی کی ضرورت ہے۔

برتری کا پہلا سبب: استعداد فارسی

میرزا صاحب کی اردو نثر کی برتری و دلچسپی کے متعدد اسباب ہیں، جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ میرزا صاحب ادب فارسی کے بے بدل ماہر تھے۔ انھوں نے زبان فارسی کے وہ تمام محاسن، جو کئی ہزار نادرہ کار دماغوں کی گیارہ سو برس کی سعی وجانفشانی سے بہم پہنچے تھے، اردو جیسی کم عمر و تہی مایہ زبان کے دامن میں بھر دیے۔ اگر وہ فارسی کے بلند پایہ ادیب نہ ہوتے، تو اپنے کلام اردو میں اس قدر جدت، شیرینی اور تناسب پیدا کر سکتے اور نہ یہ ممکن تھا کہ اس زمانے میں، جبکہ تسکین ذوق ادب کے لیے روزانہ نیا سیدان تلاش کیا جا رہا ہے، اور تقریباً ہر سال اردو انشا کا طرز ادا بیرونی ادبیات سے نئے اثرات قبول کرتا جاتا ہے، میرزا صاحب کا کلام زبان اردو میں پائیدار حیثیت حاصل کر سکتا۔ یہ دراصل زبان فارسی کی دولت بے پایاں تھی، جو میرزا صاحب کی انشا کو میسر آگئی ہے اسی کے سہارے میرزا صاحب کی حیات ادبی کی بقا ہے، جو اس وقت تک ممات سے مبدل نہیں ہو سکتی، جبتک اردو زبان بھی فارسی کے برابر قدیم اور ترقی یافتہ نہ ہو جائے۔

دوسرا سبب: خطوط کے تفریحی

میرزا صاحب کی کامیابی کا دوسرا سبب یہ ہے کہ اردو مکاتیب اُن کے تفریحی

(۱) عود ہند ۱۴۰

مشغلوں کا جزو بنگئی تھی۔ وہ جو کچھ لکھتے تھے اپنا اور مکتوب الیہ کا دل بہلانے کی خاطر لکھا کرتے تھے۔ قدرت نے ظریف طبیعت عطا کی تھی، اس لیے خطوط سے خود لطف اُٹھانے اور دوسروں کے لیے سامانِ انبساط مہیا کرنے میں انھیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ غدر سنہ ۵۷ء کے بعد تمام مشاغل میں سے صرف اسی ایک مشغلے پر انحصار کرنا پڑا۔ یہ دور اہل ہند کے لیے عموماً اور اہلِ دہلی کے لیے خصوصاً سخت ابتلا و مصائب کا دور تھا، جس نے اعزا و احباب کی بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اُتار کر بقیہ اصحاب کو شہر بدر کر دیا تھا۔ اور میرزا صاحب ہندوستان کے برِ اعظم میں اپنے آپ کو یکہ و تنہا محسوس کرنے لگے تھے۔ اس عہدِ افسردگی کو فرحت و انبساط کے ساتھ گزارنے کی یہی ایک ترکیب باقی تھی کہ جو دو چار دوست آشنا رہ گئے تھے، اُن سے خط کتابت کا سلسلہ جاری رکھا جائے، تاکہ اپنا غم اُنھیں سنانے اور اُن کا فسانہ خود سننے سے کچھ غم غلط ہو جایا کرے۔ مجروح، تفتہ، بینجبر اور چند دوسرے اصحاب سے میرزا صاحب کی کثرتِ مراسلت کا باعث یہی تھا۔ ان میں سے جس کا خط آتا اُس کو جواب، اور جس کا نہ آتا اُس کو شکوہ و عتاب لکھتے رہتے۔ اس زمانے میں ایک بار تفتہ نے کوتاہ قلمی سے کام لیا، اور ایک ماہ تک کوئی نیاز نامہ نہ بھیجا، تو میرزا صاحب نے ۱۹ جون سنہ ۵۸ء کو پر حسرت انداز میں لکھا:

"کیوں صاحب! مجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج مہینا بھر ہو گیا ہوگا، یا بعد دو چار دن کے ہو جائیگا، کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو، کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بالمکند داس کا بیٹا، یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ اس سے گزر کر لکھنؤ اور کالپی اور فرخ آباد اور کس کس ضلع سے خطوط آتے رہتے تھے۔ اون دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں۔ وہ آمد خطوط کی موقوف۔ صرف تم تین صاحبوں کے خط کے آنے کی توقع۔ اوس میں وہ دونوں صاحب گاہ گاہ، ہاں، ایک تم کہ ہر مہینے میں ایک دو بار مہربانی کرتے ہو۔ سو صاحب اپنے پر لازم کرو ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھنا۔ اگر کچھ کام آپڑا دو خط تین خط،

ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایکبار بھیجدی۔" (۱)

اس کے بعد پھر تفتہ سے تاخیر ہوئی، تو میرزا صاحب نے ۱۲ نومبر سنہ ۵۸ء کو مزاحاً تحریر کیا:

"کیوں صاحب! کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ بھلا اگر یہ حکم ہوا ہوتا، تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زنہار! کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جاوے۔" (۲)

لیکن تفتہ نے اس کے بعد بھی تساہل سے کام لیا، تو میرزا صاحب نے ۲ دسمبر سنہ ۵۸ء کو بجا حجت سے لکھا:

"کیوں صاحب، روٹھے ہی رہو گے یا کبھی مانو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے، تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا، میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا، جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں۔ بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے، ایک دو صبح کو اور ایک دو شام کو۔

——— میری دل لگی ہو جاتی ہے ———

دن اٹھ کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب؟ دس دس بارہ بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا، یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو، صاحب۔ نہ لکھنے کی وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو ہرکارہ بھیجو۔" (۳)

بہانے بنا کر دل بہلانے

اُس زمانے میں میرزا صاحب غم غلط کرنے کے اس قدر درپے تھے کہ جب خط کتابت کے بعد بھی وقت بچ رہتا، تو آیندہ مراسلت کے لیے بہانے بنانے لگتے۔ منشی بنی بخش کے مکتوب، مورخہ ۲۲ ستمبر سنہ ۵۸ء، میں لکھتے ہیں:

(۱) اردو ی: ۷۳ (۲) ایضاً: ۵۴ (۳) ایضاً: ۸۱

"اللہ! اللہ! یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ خط سے خط لکھے گئے ہیں! مجکو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا، تو لفافے بناؤں گا۔"(۱)

منشی شیونرائن کو یہ لفافے دیکھ کر خیال پیدا ہوا کہ میرزا صاحب تنگدستی کی وجہ سے سادہ لفافے بازار سے نہیں خرید سکتے۔ یہ سوچکر اُنھوں نے کچھ لفافے بھیجے، اور بذریعۂ تحریر ارسال کی اطلاع دی۔ اس کے جواب میں میرزا صاحب نے لکھا:

"لفافوں کی خبر پہنچی۔ آپ نے کیوں تکلیف کی؟ لفافے بنانا دل کا بہلانا ہے۔ بیکار آدمی کیا کرے۔ بہرحال جب لفافے پہنچ جائیں گے، ہم آپ کا شکر بجا لائیں گے۔ ہرچہ از دوست میرسد نیکوست۔"(۲)

تیسرا سبب: خط نہیں، باتیں

تیسرا سبب یہ ہے کہ میرزا صاحب نے تحریر کو تقریر کا پیرایہ دیدیا تھا۔ وہ جب کسی دوست کو خط لکھتے، تخاطب میں وہی انداز اختیار کرتے جو مکتوب الیہ سے ملاقات کے وقت زیبا ہوتا۔ اور چونکہ ہر شخص گفتگو میں سادگی، برجستگی اور ظرافت پسند کرتا ہے، اور یہ سب خوبیاں اُن کی تقریر میں موجود تھیں، اس لیے اُن کی تحریر میں بھی وہی دلچسپی نظر آتی تھی، جو تقریر کا طرۂ امتیاز تھی۔ دراصل میرزا صاحب اس قسم کی مراسلت اختیار کرنے پر مجبور بھی تھے۔ اُنھیں دور افتادہ دوستوں کو اپنی پریشانیاں سنانی تھیں۔ اگر یہ پریشانیاں قدیم اندازِ تحریر کے لباس میں جلوہ گر ہوتیں، تو مکتوب الیہ بہت جلد اُکتا جاتے، اور میرزا صاحب کو مراسلت کا زیادہ موقع نہ ملتا۔ لہذا اُنھوں نے اپنے تمام خطوط کو مکالمہ بنا کر اُس میں طبعی ظرافت کی تخم ریزی کی، جس کے سبب سے احباب اُن کے خطوں کے انتظار میں رہا کرتے، اور اجنبی اصحاب طرح طرح سے سلسلۂ مراسلت شروع کرنے کی کوشش کرتے۔

چونکہ میرزا صاحب نے یہ طریقہ جان بوجھ کر اختیار کیا تھا، اس لیے جب اُنھیں اسکی کامیابی کا یقین آگیا، تو اس کی ایجاد کو فخراً اپنی ذات کی طرف منسوب بھی کیا ہے۔ مہر کے

(۱) اردوی: ۲۷۳ (۲) ایضاً: ۳۴۹

نام کے ایک خط میں فرماتے ہیں:

"مرزا صاحب! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بزبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔" (۱)

تفتہ کو لکھا ہے:

"بھائی! مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے، مکالمہ ہے۔" (۲)

منشی نبی بخش کو تحریر کیا ہے:

"بھائی! مجکو اس مصیبت میں کیا ہنسی آتی ہے، کہ یہ ہم تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت گویا مکالمت ہوگئی ہے۔ روز باتیں کرتے ہیں۔ اللہ اللہ! یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ خط سے خط لکھے گئے ہیں۔ ... غنیمت ہے کہ معمول آدھ آنہ ہے۔ ورنہ باتیں کرنیکا مزا معلوم ہوتا۔" (۳)

حکیم غلام نجف خاں کے خط کے آخر میں لکھا ہے:

"اس وقت جی تم سے باتیں کرنے کو چاہا۔ جو کچھ دل میں تھا وہ تم سے کہا۔" (۴)

شفق کی خدمت میں بھی اسی طرح عرض کیا ہے:

"پیر و مرشد! یہ خط لکھنا نہیں ہے۔ باتیں کرنی ہیں۔" (۵)

اُنھیں کو ایک خط کے آخر میں لکھتے ہیں:

"اب میں حضرت سے باتیں کر چکا۔ خط کو سرنامہ کر کے کہار کو دیتا ہوں۔" (۶)

بیخبر کو لکھا ہے:

"اسی افسردگی میں جی چاہا کہ حضرت سے باتیں کروں۔ بآنکہ خط جواب طلب نہ تھا، جواب لکھنے لگا۔" (۷)

میرزا صاحب احباب سے بھی اسی طرح کی مراسلت کے امیدوار تھے؛ اس لیے کوئی اُن کے تتبع میں مراسلت کو مکالمے کا رنگ دیدیتا، تو تعریف کیا کرتے۔ بکبار

(۱) اردو: ۲۵۸ (۲) ایضاً: ۵۸ (۳) ایضاً: ۲۷۲ (۴) ایضاً: ۲۲۶ (۵) ایضاً: ۳۱۲ (۶) ایضاً: ۲۹۷ (۷) ایضاً: ۲۷۶ -

تفتہ کا پیرایۂ بیان بیحد پسند آیا، تو اظہارِ خوشنودی کے لیے اُنھیں لکھا:

"جیتے رہو اور خوش رہو۔۔۔ زیادہ خوشی کا سبب یہ کہ تم نے تحریر کو تقریر کا پرداز دیدیا تھا۔" (۱)

مراسلت کا محمد شاہی طرز

میرزا صاحب کے وقت تک اردو فارسی دونوں زبانوں کی خط کتابت کا انداز یہ تھا کہ شروع میں بھاری بھرکم القاب و آداب لکھے جاتے، زاں بعد متعلقین کی خیریت کی اطلاع اور استفسار ہوتا اور اُس کے بعد استعاروں، تشبیہوں اور کنایوں کے پردے میں دو چار مطالب لکھ کر عربی یا فارسی دعائیہ جملے پر خط ختم کر دیا جاتا۔ میرزا صاحب ابتدا سے اس روش کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مکتوب الیہ کے مناسبِ حال دو چار لفظ کا القاب لکھ کر سیدھے سادے جملوں میں اظہارِ مطالب کر دیا جائے۔ "پنج آہنگ" کے دیباچے میں اس روش سے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بیگانگی این روش از شیوۂ غالب مستمند نہ چند است کہ بگفتن نیاز داشتہ باشد۔ دادا شناس داند کہ منجار من در نگارش این است کہ چون کلک دورق بجف گیرم مکتوب الیہ را بلفظ کہ فراخورِ حالت اوست در سرآغاز صفحہ آوازہ دہم، و زمزمہ سنج مدعا گردم القاب و آداب و خیریت گوئی و عافیت جوئی حشو زائد است۔ و پختگان حشو را دفع نمند۔" (۲)

میرزا صاحب نے مراسلت کی اُس روش کا نام، جس میں بڑے بڑے القاب و آداب اور حشو و زوائد سے پُر خیریت گوئی و عافیت جوئی کے جملے ہوتے، "محمد شاہی روش" رکھا تھا، اور اس سے اسقدر بیزار تھے کہ مجروح کے نام کے ایک خط میں اس کا مضحکہ بنایا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسودہ کو اصلاح دیکر بھیجدیا۔ اب اور کیا لکھوں۔ تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافہ کو کریدا کرو۔ مسودہ کو بار بار دیکھا کرو۔ پاؤ گے کیا؟ یعنی نمکدہ

(۱) اردوی: ۱۰۴ (۲) کلیات نثر غالب: ۵

محمد شاہی روشیں پسند ہیں — یہاں خیریت ہے۔ وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔
خط تمہارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔
برخوردار میر سرفراز حسین کو دینا، اور دعا کہنا۔ او۔ ہاں حکیم میر اشرف علی اور میر افضل
علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمۂ سعادتمندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو۔ کیوں
بیچ کہیو، اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی؛ ہائے، کیا اچھا شیوہ ہے! جب تک
یوں نہ لکھو وہ خط ہی نہیں ہے۔ چاہ بے آب ہے، ابر بے باراں ہے، نخل بے
میوہ ہے، خانۂ بے چراغ ہے، چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں، تم زندہ ہو۔ تم
جانتے ہو کہ ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری کو لکھ لیا۔ زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا۔
اور اگر مضامین محشوری اسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے، تو بھائی ساڑھے تین
سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں۔ کیا نماز قضا نہیں پڑھتے؟ اور وہ مقبول ہوگی؟"(۱)

شفق کے خط میں القاب و آداب سے آغاز کرنے کے بجائے انتہائی پاکیزہ انداز سے ہی متعارف طرز کی سبکی اور عدم احتیاج کا اظہار کرتے ہیں۔ ارشاد ہے:

"کیونکر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں؟ ہاں اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں۔
واہ کیا ہوشمندی ہے، کہ قبلۂ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں، نہ القاب، نہ آداب،
نہ بندگی، نہ تسلیم؟ سن غالب! ہم تجھ سے کہتے ہیں، بہت مصاحب نہ بن۔ ای ایوانا
حد خود بشناس۔ اناکہ تو نے کئی برس کے بعد ذوبیت کی غزل لکھی ہے اور آپ اپنے
کلام پر وجد کر رہا ہے۔ مگر یہ تحریر کی کیا روش ہے؟ پہلے القاب لکھ، پھر بندگی
عرض کر، پھر ہاتھ جوڑ کر مزاج کی خبر پوچھ، پھر عنایت نامہ کے آنے کا شکر ادا کر"(۲)

میرزا صاحب کی روش

میرزا صاحب کے عہد میں جو روش پسند کی جاتی تھی۔ اُس کے سمجھ لینے کے بعد ضروری ہے کہ خود میرزا صاحب کا انداز مراسلت و مکاتیب دریافت کیا جائے۔
پنج آہنگ کے دیباچے میں اُنھوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ کاتب کو کن امور کا

(۱) اردو (ک): ۱۸۶ (۲) ایضاً: ۱۸۷

لحاظ رکھنا چاہیئے۔ فرماتے ہیں:

"نامۂ نگار را آں باید کہ

(۱) نبشتن را رنگِ گفتن دہد۔

(۲) و مطلب را بیان روش گزارد کہ دریافتن آں دشوار نبود، و اگر مطلبی چند داشتہ باشد، در تقدیم و تاخیر ژرف نگہی بکار برد، و ازاں پرہیزد کہ سخن گرہ در گرہ گردد و اجزای مدعا بہم گرفروخورد۔

(۳) زنہار استعارہ ہای دقیق، و لغات منکلۂ نامانوس در عبارت درج نکند۔

(۴) و در ہر نوشتہ رعایت رتبۂ مکتوب الیہ در نظر دارد۔

(۵) تا تواند، سخن را درازی ندہد۔

(۶) و از تکرار الفاظ محترز باشد۔

(۷) و بیشتر بمذاق اہلِ روزگار حرف زند۔ و از احاطۂ قواعد و قوانینی کہ قرار دادۂ این مردم است، بدر نرود و اندازہ خوبیٔ زبان نگاہ دارد۔

(۸) و این پارسیٔ آمختہ تازی را در کشاکش تصرفات ہندی زبانانِ پارسی نویس ضائع نگزارد و لغاتِ عربی جز بقدرِ بایست صرف نہ نماید و پیوستہ در ایں کوشد کہ سادگی و لغزی شعارِ او گردد۔

(۹) و در اقسام مکاتیب، خاصہ در خطوط و عرایضی کہ بحکام نویسد و مشتمل بر معاملات باشد، از اغلاق و اغراق احتراز واجب داند و سخن باستعارہ و اشارہ نگزارد، و نرم گوید و سنجیدہ گوید و آسان گوید۔" (۱)

در اصل ان تمام ہدایتوں کی روح یہ ہے کہ "نبشتن را رنگ گفتن دہد"۔ اسی کو میرزا صاحب نے ایک خط میں اس طرح تعبیر کیا ہے کہ "میں نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے"۔ جب ہم کسی سے بات چیت کرتے ہیں، تو کوشش کرتے ہیں کہ مخاطب کو سہولت کے ساتھ اپنا مطلب سمجھا دیں؛ چند باتیں کہنا ہوتی ہیں، تو جو پہلے کہنے کی ہیں، پہلے اور جو بعد میں کہی

(۱) کلیات نثر غالب: ۵۰

جاسکتی ہیں، بعد میں کہتے ہیں؛ پیچیدہ اور گرہ در گرہ باتیں کرنے سے بچتے ہیں: مشکل اور نامانوس لفظوں اور ترکیبوں سے گریز کرتے ہیں؛ مخاطب کے رتبے کے لائق لفظ زبان سے نکالتے ہیں؛ حتی الامکان گفتگو کو لمبا نہیں کرتے؛ ایک بات یا ایک لفظ کو بار بار زبان سے نہیں نکالتے؛ وہی باتیں باہم کرتے ہیں، جو زمانے کی روش اور پسندیدگی کے مطابق ہوں؛ اپنے زمانے کے اصولِ زبان کا لحاظ رکھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ قواعد و ضوابطِ زبان کی پابندی کے ساتھ دوسرے محاسنِ کلام بھی گفتگو میں برتے جائیں؛ اہلِ زبان کی طرح بولنے اور دوسری زبان کے الفاظ کو بقدرِ ضرورت استعمال کرنے کی سعی کرتے ہیں، اور سب سے آخر میں اس کا لحاظ رکھتے ہیں، کہ بات چیت میں سادگی اور حسن پیدا ہو جائے۔ اشاروں اور کنایوں سے کام نہیں لیتے، اور نرمی و سنجیدگی برتتے رہیں، بالخصوص جب کسی معاملے پر برابر والے یا حاکم سے عرض حال کرتا ہو، تو ان آخر کی باتوں کا اور زیادہ خیال کرتے ہیں۔

میرزا صاحب چاہتے تھے کہ خطوں میں بھی ان اصولوں کو برتا جائے۔ خود انھوں نے اپنی انشا میں ان پر پختگی کے ساتھ عمل کیا ہے، اسی لیے اُن کے مکاتیب میں وہی سادگی، حسن اور لطافت ہے، جو اُن کی گفتگو میں بتائی جاتی ہے۔ ان اصولوں کے پیشِ نظر آئندہ صفحات میں ان کی مخصوص روش سے بحث کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

القاب و آداب

سب سے پہلے القاب و آداب کو لیجیے۔ میرزا صاحب کے یہاں یہ اجزا اس قدر مختصر، مکتوب الیہ کے رتبے کے مطابق اور متعارف روش سے جدا ہیں کہ انھوں نے ان کے ترک کر دینے کا دعوی کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"پیر و مرشد! یہ خط لکھنا نہیں ہے، باتیں کرنی ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا۔" (۱)

دراصل انھوں نے القاب و آداب کا پرانا فرسودہ طریقہ ترک کیا تھا۔ یہ نہ تھا کہ

(۱) اردوی: ۳۱۲

کہ مکتوب الیہ کے مرتبے کا لحاظ کیے بغیر ہر خط کو بغیر القاب و آداب کے شروع کر دیتے ہوں۔ اُنھوں نے بزرگ یا بلند مرتبہ اصحاب کو جس قدر خط لکھے ہیں، اُن سب میں الفاظ اور پرداز کے تنوع کے ساتھ یہ دونوں جزو موجود ہیں۔ مثلاً نواب فردوس مکاں اور خلد آشیاں (طاب ثراہما) کی خدمت میں جس قدر عرضیاں ارسال کی ہیں، اُن سب میں بجز دو ایک کے "حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت۔ بعدِ تسلیم معروض ہے" ہوتا ہے، اور بمشکل چار پانچ عرضیوں میں لفظِ (حضرت) ساقط ہوا ہے۔

بے تکلف احباب یا شاگردوں کے نام کے مکاتیب میں تنوع زیادہ ہے۔ کبھی تو سرے سے القاب ہوتا ہی نہیں، اور اگر ہے تو "میاں، برخوردار، بھائی صاحب، سید صاحب، مرزا، میری جان، کیوں صاحب، منشی صاحب، بندہ پرور، یا اور کوئی مختصر اور بے تکلف لفظ یا فقرہ کبھی کبھی مزاحاً چھوٹوں کو بھی "قبلہ و کعبہ، مولانا، یا پیر و مرشدہ" لکھ دیا ہے۔ بعض خطوط ایسے بھی نظر آتے ہیں، جن میں پورا القاب نحرّر کیا گیا ہے، مگر اُس میں بھی سادگی و بے تکلفی مفقود نہیں ہوئی ہے۔ مثلاً میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں:

"نورِ چشم راحتِ جان، میر سرفراز حسین جیتے رہو اور خوش رہو!"

یا اُنھیں کو لکھا ہے:

"میری جان کے چین، میر سرفراز حسین"

قفتہ کو تحریر کیا ہے:

"میرے مہربان، میری جان، مرزا قفتہ سخندان"

یا:

"نورِ نظر، لختِ جگر، مرزا تفتہ"

علائی کو لکھتے ہیں:

"سعادت و اقبال نشان، مرزا علاء الدین خاں بہادر کو فقیر غالب کی دعا پہنچے"

یہی حال آداب و تسلیمات کا ہے۔ نواب میر غلام بابا خاں بہادر کو لکھا ہے:

"سلام مسنون الاسلام دعای دوام دولت واقبال کے بعد عرض کیا جاتا ہے"
بعض اصحاب کو لکھدیا ہے: "... فقیر غالب کا سلام" یا "سلام علیکم" یا "بعد دعا کے معلوم ہو" یا صرف "آداب" یا زیادہ مزاحیہ انداز میں "اگر خفا نہ ہوں تو دعا اور اگر آزردہ ہوں تو بندگی"، وغیرہ۔

خیریت گوئی و عافیت جوئی

خیریت گوئی سے میرزا صاحب سخت متنفر تھے۔ وہ اس حصے کو حشو شمار کرتے تھے، اس لیے کسی ایک خط میں بھی "یہاں خیریت ہے اور آپ کی خیریت نیک مطلوب" نہیں پایا جاتا۔ ہاں، مطالب کے ساتھ ساتھ اپنی خیریت کا ذکر اور مکتوب الیہ کی عافیت کا استفسار کر لیتے، اور اس روش کو "کارِ نیکاں" شمار کرتے ہیں۔[1]

اظہارِ مطالب[1]

میرزا صاحب کا ادائے مطالب کا طریقہ بالکل ایسا ہے جیسے دو آدمی بالمشافہ بات چیت یا سوال و جواب کرتے ہیں۔ مثلاً اُن کو یہ لکھنا تھا کہ۔ محمد علی بیگ میرے کوٹھے کے نیچے سے گزرا۔ میں نے پوچھا کہ تو ہارد کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟ اُس نے کہا ابھی نہیں ہوئیں۔ میں نے پوچھا کیا آج جائیں گی؟ اُس نے کہا آج ضرور جائینگی۔ تیاری ہو رہی ہے۔ اس مطلب کو اُنھوں نے اس طرح ادا کیا ہے:

"محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔ یعنی محمد علی بیگ! تو ہارد کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟ حضرت ابھی نہیں۔ کیا آج نہ جائینگی؟ آج ضرور جائیں گی۔ تیاری ہو رہی ہے"

میر مہدی مجروح کو خط لکھا ہے۔ اُس میں لکھنا یہ ہے کہ میر نصاحب آئے اور اُن سے یہ یہ باتیں ہوئیں۔ مگر وہ اس طرح نہیں لکھتے، بلکہ اُس کو اس طرح شروع کرتے ہیں:

"اے میر نصاحب! السلام علیکم! حضرت آداب۔ کہو صاحب، آج اجازت ہے میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی؟ حضور، میں کیا منع کرتا ہوں؟ مگر میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھدیتا ہوں۔ پھر آپ کیوں تکلیف کریں؟ نہیں میر نصاحب، اوس کے

(۱) اس عنوان کے ماتحت جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ یادگار غالب (ص ۱۷۶-۱۹۱) کا بلفظہٖ خلاصہ ہے۔

خط کو آتے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں۔ وہ خفا ہوا ہوگا۔ جواب لکھنا ضرور ہے۔ حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں۔ آپ سے خفا کیا ہوں گے۔ بھائی، آخر کوئی وجہ تو بتلاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو؟ سبحان اللہ! اے لو، حضرت آپ تو خط نہیں لکھتے، اور مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔ اچھا تم باز نہیں رکھتے مگر یہ کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں؟ کیا عرض کروں؟ سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور خط اوٹھاتا۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں، تو نہیں چاہتا کہ آپ کا خط جاوے۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں۔ میری روانگی کے تین دن بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا۔ میاں میٹھو۔ ہوش کی خبر لو۔ تمہارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ؟ میں بوڑھا آدمی، تمھاری باتوں میں آگیا، اور آج تک اسے خط نہیں لکھا۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ "

اس کے بعد میر مہدی سے مخاطب ہو کر اصل مطلب لکھتے ہیں۔

بعضی جگہ مکتوب الیہ کو خطاب کرتے کرتے غائب فرض کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ جو لوگ میرزا صاحب کے اندازِ بیان سے واقف نہیں، وہ اس کو مکتوب الیہ کا غیر سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً میر مہدی کو لکھتے ہیں:

"میر مہدی، جیتے رہو! آفرین! صد ہزار آفرین! اردو لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے، کہ مجھ کو رشک آنے لگا ہے۔ سنو، دلی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں گئی ہے۔ یہ طرز عبارت خاص میری دولت تھی۔ سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اسکو بجل کیا۔ اللہ برکت دے!"

مغربی طریقے پر جو قصے لکھے جاتے ہیں، اُن میں اکثر اس قسم کے سوال و جواب ہوتے ہیں، جیسے کہ میرزا صاحب کی تحریروں میں ہم اوپر دکھا چکے ہیں۔ مگر وہاں ہر سوال و جواب کے سرے پر سائل اور مجیب کا نام یا اُن کے ناموں کی کوئی علامت لکھ دیجاتی ہے، ورنہ یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ سوال کہاں ختم ہوا اور جواب کہاں سے

شروع ہوا؟ میرزا صاحب ایسے موقع پر سائل و مجیب کا نام نہیں لیتے، اور نہ اُن کے نام کی علامت لکھتے ہیں۔ مگر سوال یا جواب کے ضمن میں ایک ایسا لفظ لے آتے ہیں، جس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ سوال کیا ہے اور جواب کیا۔

میرزا صاحب کی طرزِ تحریر کی جو خصوصیتیں اوپر مذکور ہوئیں، یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اور لوگ اُس کی پیروی نہ کر سکیں۔ مگر وہ چیز جس نے اُن کے مکاتبات کو ناول یا ڈرامے سے زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے، وہ شوخیٔ تحریر ہے، جو اکتساب یا مشق و مہارت یا پیروی و تقلید سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ ... معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب خط لکھتے وقت ہمیشہ اس بات کو نصب العین رکھتے تھے کہ خط میں کوئی ایسی بات لکھی جائے کہ مکتوب الیہ اُس کو پڑھ کر محظوظ اور خوش ہو۔ پھر جس رتبے کا مکتوب الیہ ہوتا تھا، اُس کی سمجھ اور مذاق کے موافق خط میں شوخیاں کرتے تھے مثلاً اپنے ایک دوست کو خط لکھا ہے۔ اُس میں اُن کی لڑکی کو، جو بچپن میں میرزا صاحب کے سامنے آتی تھی، اور اب جوان ہو گئی ہے، بعد دعا کے لکھتے ہیں:

"کیوں بھئی! اب اگر ہم کول آئے بھی، تو تم کو کیونکر دیکھیں گے؟ کیا تمہارے ملک میں بھتیجیاں چچا سے پردہ کرتی ہیں؟"

یا مثلاً نواب امیر الدین احمد خاں رئیسِ لوہارو، کو اُن کے بچپن کے زمانے میں اُن کے رقعے کا جواب، جس میں میرزا کو دادا صاحب لکھا تھا، اس طرح لکھتے ہیں:

"اے مردم چشم جہاں بین غالب! بطے القاب کے معنے سمجھ لو۔ یعنی "چشم جہاں بین غالب کی پتلی۔" "چشم جہاں بین" تمہارا باپ مرزا علاء الدین احمد خاں بہادر، اور پتلی تم۔ میاں، تمہارے دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں۔ میں تو صرف تمہارا دلدادہ ہوں۔"

ایک دوست کو دسمبر سنہ ۵۸ء کی اخیر تاریخوں میں خط لکھا ہے۔ اُنھوں نے اُس کا جواب جنوری سنہ ۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا۔ اُس کے جواب میں اُن کو اس طرح لکھتے ہیں:

"دیکھو صاحب، یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ سنہ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب سنہ ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو، اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا، تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔"

الغرض میرزا صاحب کے خطوط و رقعات میں ایسے خطوط بہت کم نکلیں گے، جن میں اس قسم کی ظرافت اور ہنسی کی باتیں مندرج نہوں۔ یہانتک کہ رنج و افسردگی کا بیان بھی اس قسم کی چھیڑ سے خالی نہیں ہوتا۔ منشی نبی بخش کو لکھتے ہیں:

"بھائی صاحب ہیں بھی تمہارا ہمدرد ہوگیا۔ یعنی سنگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو تمام کے وقت میری وہ بھیجی کہ میں نے بچپن سے آج تک اوس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجکو بیٹا سمجھتی تھی، مرگئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے۔ تین پھپھیاں اور تین چچا اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا یعنی: اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں، اور اوس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مرگئے۔"

میرزا صاحب نے بعض اردو خطوں میں ۔۔۔ مُسَجَّع عبارت لکھنے کا التزام کیا ہے۔ عربی اور سنسکرت زبان کے سوا اور زبانوں کی مُسَجَّع نثروں میں عموماً یہ عیب ہوتا ہے کہ دوسرے فقرے میں جو پہلے فقرے کی غایت سے خواہ نخواہ قافیہ تلاش کرنا پڑتا ہے تو اُس میں تصنع اور آورد کا رنگ پیدا ہوجاتا ہے، اور اس لیے پہلے فقرے کے مقابلے میں دوسرا فقرہ لیئب لُزُومِ مَالَا یَلْزَمْ کے کم وزن ہوجاتا ہے مگر میرزا صاحب کی مُسَجَّع نثر میں یہ بات بہت کم دیکھی جاتی ہے۔ دوسرے فقرے میں تقریباً ویسی ہی بے تکلفی پائی جاتی ہے، جیسی پہلے فقرے میں۔ اور یہ بات اُسی شخص سے بن پڑتی ہے، جو باوجود خوش سلیقگی اور لطفِ طبیعت کے شاعری میں غایت درجے کا کمال رکھتا ہو، اور وزن و قافیے کی جانچ اور تول میں ایک عمر بسر کرچکا ہو۔ مگر یہ معلوم رہے کہ متقفّٰی عبارت میرزا صاحب نا سمجھ اُن خطوں میں لکھتے تھے، جن سے ہنسی یا ظرافت اور مخاطب کا خوش کرنا مقصود ہوتا تھا۔

عرائض کا طرزِ ادا

اگرچہ میرزا صاحب کے عرائض کا اندازِ بیان اُن خطوں کے مقابلے میں، جو "اردوئے معلی" اور "عودِ ہندی" میں شائع ہو چکے ہیں، بے تکلف ہے اور یہاں وہ رنگا رنگی نہیں پائی جاتی، جو مذکورہ مجموعوں کے خطوط کی جان ہے، تاہم یہ عرائض بھی اُسی نادرہ کاری کی پیداوار ہیں، جو ادبِ اردو کے دامنِ کوتاہ کو سدا بہار پھولوں سے بھر چکا ہے۔ اس لیے ان سرکاری درخواستوں میں بھی وہ سادگی، شوخی اور ظرافت موجود ہے، جس کے سبب ادائے مطلب میں میرزا صاحب کی انشاد گیر انشا پردازوں کی تحریروں سے گوئی سبقت لیگئی ہے۔

لیکن یہ محاسن اُن خطوط میں زیادہ نمایاں ہیں، جن میں حسنِ طلب ہے۔ چونکہ سرکارِ رامپور، میرزا صاحب کی مالی دستگیری کی واحد کفیل تھی، اس لیے وہ ہر ضرورت کے موقع پر سوال کر بیٹھتے تھے، اور یہ سوچکر کہ ابھی سابق امداد کو زیادہ زمانہ نہیں ہوا ہے، ہمیشہ ایسے انداز سے سوال کرتے تھے کہ انکار کی گنجایش باقی نہ رہے۔ مثلاً نواب فردوس مکاں نے سید حیدر علی خاں بہادر کی شادی کے موقع پر میرزا صاحب کو تورے اور خلعت کے نام سے ۱۲۵ روپے نقد ارسال کیے ہیں۔ میرزا صاحب اس روپے کو خرچ کرنے کے بعد آیندہ کے لیے سبیل نکالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "یہ تحریر نہیں مکالمہ ہے۔ گستاخی معاف کروا کے اور آپ سے اجازت لے کر بطریقِ انبساط عرض کرتا ہوں کہ یہ سوا سو روپئے، جو تورہ و خلعت کے نام سے مرحمت ہوتے ہیں، میں کال کا مارا اگر یہ سب روپیہ کھا جاؤں گا، اور اس میں لباس نہ بناؤں گا، تو میرا خلعت حضور پر باقی رہے گا یا نہیں؟" (۱)

نواب فردوس مکاں کی وفات کے بعد نواب خلد آشیاں کی خدمت میں قصیدۂ تہنیت ارسال کیا ہے۔ یہاں سے صلے میں تاخیر ہوئی ہے۔ میرزا صاحب کو روپے کی ضرورت ہے، اس لیے نامۂ تقاضائی لکھتے ہیں:

(۱) مکاتیب: ۲۱

"پیر و مرشد! حضرت فردوس مکاں کا دستور تھا کہ جب میں قصیدہ بھیجتا، اوس کی رسید میں خط تحسین و آفرین کا، شرم آتی ہے کہتے ہوئے مگر کہے بغیر بنتی نہیں، ماہ ۵ کی کی ہنڈوی اوس خط میں ملفوف عطا ہوا کرتی تھی۔ یہ رسم بری نہیں ہے۔ اگر جاری رہے تو بہتر ہے۔" (۱)

ایک سال دلی میں بارش کم اور رامپور میں کافی ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگرچہ یہاں مینھ اسی قدر برسا ہے کہ جس کھپانی سے زمیندار حاصل فصل ربیع سے ہاتھ دھولیں، مگر چونکہ بفرمان ازلی میرے رزق کی برات آپ پر ہے، اور آپ کے ملک میں بارش خوب ہوئی ہے، ابر رحمت کے شکریہ میں ایک قطعہ ملفوف اس عرضی کے بھیجتا ہوں۔ بنظر اصلاح نظم و اصلاح حال ملاحظہ ہو۔" (۲)

نواب خلد آشیاں نے جشن تخت نشینی میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ اس کا شکریہ ادا کرکے لکھتے ہیں:

"حضرت کی خدمت میں نہ آؤں گا تو اور کہاں جاؤں گا۔ وہ آگ برس رہی ہے کہ طیور کے پر جل رہے ہیں۔ بعد آگ کے پانی برسے گا۔ سفر خصوصاً بوڑھے رنجور آدمی کو دونوں صورت میں متعذر۔ آفتاب میزان میں آیا، اور ہنگامۂ آتش و آب فرو ہوا، اور میں نے احرام بیت المعمور رام پور باندھا۔" (۳)

ایک مرتبہ نواب خلد آشیاں نے اپنی ایک فارسی نثر اصلاح کو بھیجی ہے۔ میرزا صاحب بعض محاوروں کی تغلیط کرتے ہیں۔ اہل دربار بہار عجم اور فرہنگ جہانگیری وغیرہ لغات کے حوالے سے اس اصلاح کو غلط ٹھہراتے ہیں۔ نواب صاحب یہ حوالے نقل کرکے میرزا صاحب سے اصلاح پر نظر ثانی کی درخواست کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں میرزا صاحب نے تحریر کیا ہے:

"مجھے اس امر خاص میں نفس مطمئنہ حاصل ہے۔ مگر دعوئ اجتہاد نہیں ہے۔ بحث کا طریقہ یاد نہیں۔ میاں انجو جامع فرہنگ جہانگیری، شیخ رشید راقم فرہنگ رشیدی

(۱) مکاتیب: ۳۷ (۲) ایضاً: ۴۰ (۳) ایضاً: ۳۸ -

عظمای عجم میں سے نہیں۔ ہندان کا مولد، ماخذان کا اشعار قدما، ہادی ان کا ان کا قیاس، ٹیک چند اور سیالکوٹی مل ان کے پیرو۔ سبحان اللہ! ہندی بھی اور ہندو بھی! نُورٌ عَلیٰ نور!!" (۱)

باغ بے نظیر کی نمائش کا حال اخبار میں پڑھا ہے، اور چاہتے ہیں کہ نواب صاحب کو اس جشنِ بے نظیر کی مبارکباد دیں۔ اس مضمون کو اس طرح ادا فرماتے ہیں:

حوالہ "نمائشگاہ سراسر سورِ رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں، اور خون جگر کھاتا ہوں کہ ہائے! میں وہاں نہیں۔ بالاخانے پر رہتا ہوں، اتر نہیں سکتا۔ ناناکہ آدمیوں نے گود میں لے کر اتارا، اور پالکی میں بٹھا دیا۔ کہار چلے۔ راہ میں نہ مرا اور رامپور پہنچ گیا۔ کہاروں نے جاکر بے نظیر میں میری پالکی رکھ دی۔ پالکی قفس، اور میں طائرِ اسیر، وہ بھی بے پر و بال۔ نہ چل سکوں، نہ پھر سکوں۔ جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں، یہ سب بطریقِ فرض محال ہے۔ ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے۔" (۲)

نواب سکندر زمانی بیگم صاحبہ کی تعزیت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"چاہتا ہوں کہ کچھ لکھوں، مگر نہیں جانتا کہ کیا لکھوں۔ لازم تھا کہ تعزیت نامہ زبانِ فارسی و عبارتِ بلیغ لکھوں۔ آپ کے قدموں کی قسم! دل نے قبول نکیا۔ آرائشِ گفتار، نظماً اونثراً، واسطے تہنیت کے ہے، کہ دل کثرتِ نشاط سے گل کی طرح کھل رہا ہے، طبیعت راہ دیتی ہے، الفاظ ڈھونڈھے جاتے ہیں، معنی پیدا کئے جاتے ہیں۔ اب میں نیم مردہ، دل پژمردہ، خاطر افسردہ جس باب میں لفظ و معنی فراہم کیا چاہوں وہ سراسر طبع کے خلاف۔ جس بات کا تصور ناگوار ہو، اوس کے تذکرے سے جی کیوں نہ بیقرار ہو؟" (۳)

نواب زین العابدین خاں بہادر سے خواہش کرتے ہیں کہ اپنے نام کا خط سرکار کو دکھا دینا، مگر ساتھ ہی فرماتے ہیں:

"لیکن تم سے یہ توقع کیونکر پڑے؟ کو واسطے کہ تم سے اردو دیوان کے پہنچنے نہ پہنچنے کا

(۱) مکاتیب: ۶۰ (۲) ایضاً: ۶۹ (۳) ایضاً: ۴۶ —

حال جناب عالی سے دریافت کرکر کب لکھا ہے، جو اس بات کا جواب لکھو گے۔" (۱)

خاتمہ

میرزا صاحب خط کے آخر میں بالعموم ایک دو دعائیہ لفظ لکھا کرتے تھے۔ اردوی معلی و عودِ ہندی میں بعض مقامات پر یہ جزو متروک ہوگیا ہے، یا اپنی خیریت یا دنیا کی بے ثباتی سے متعلق کسی جملہ سے بدل گیا ہے۔ لیکن عرائض میں کبھی نظر انداز نہیں ہوا۔ ان میں اکثر:

"زیادہ عدادب۔ تم سلامت رہو ہزار برس ؎ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار"

یا

"تم سلامت رہو قیامت تک ؎ دولت و عز و جاہ روز افزوں"

تحریر کیا کرتے ہیں۔ دو چار خطوں میں پہلے شعر کا مصرع اول اور دوسرے کا مصرع ثانی ملا کر بھی لکھ دیا ہے۔ چونکہ اس خرد میں کوئی ادبی خوبی میرزا صاحب کے یہاں بھی نہیں پائی جاتی، اس لیے تمثیل و استشہاد بیکار ہے۔

کاتب کا نام

میرزا صاحب کاتب کی شخصیت کا تعین بھی نئے نئے اسلوب سے کرتے تھے عام انشا پردازوں کی طرح آخر میں نام لکھنے کا طریقہ اُن کے ہاں صرف پُر تکلف مراسلات کے ساتھ مخصوص تھا۔ مسادیانہ یا بزرگانہ خط کتابت میں کبھی خط کے شروع یا درمیان میں اس طرح نام لکھتے ہیں کہ مکتوب الیہ کو خیال تک نہیں ہوسکتا کہ یہاں نام لکھنے سے مقصود کاتب کا تعارف ہے۔ مثلاً بخبر کو لکھا ہے:

"قبلہ! کبھی آپ کو یہ بھی خیال آتا ہے، کہ کوئی ہمارا دوست، جو غالب کہلاتا ہے وہ کیا کھاتا پیتا ہے اور کیونکر جیتا ہے؟" (۲)

یا مثلاً شفق کو تحریر کیا ہے:

"کیونکر کہوں کہ میں دیوانہ نہیں ہوں؟ ہاں اتنے ہوش باقی ہیں کہ اپنے کو دیوانہ سمجھتا ہوں

(۱) مکاتیب: ۸۷ (۲) اردوی: ۲۷۴۔

واہ! کیا ہوشمندی ہے کہ قبلۂ ارباب ہوش کو خط لکھتا ہوں، نہ القاب، نہ آداب، نہ بندگی، نہ تسلیم؛ مومن غالب! ہم تجھ سے کہتے ہیں "بہت معاصب نہ بن" (۱)

اور کبھی آخر میں نام لکھتے ہیں، جو بیشتر تو اُن کا تخلص "غالب" ہوتا ہے، اور تنہا یا کسی ہمقافیہ فقرے کے ساتھ آتا ہے۔ مثلاً:

"بندۂ علی ابن ابی طالب، آرزومند مرگ غالب، نجات کا طالب غالب۔ عفو جرم کا طالب غالب، داد کا طالب غالب، اس خط کی رسید کا طالب غالب، ترحم کا مستحق اور تفقد کا طالب غالب، وغیرہ"

لیکن بعض خطوط میں اصلی نام "اسداللہ خاں" یا "اسداللہ" یا صرف "اسد" یا "اسداللہ خاں غالب" یا "اسداللہ غالب" بھی لکھا ہے، "اسداللہ" کے ساتھ بھی میرزا صاحب ہمقافیہ فقرہ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً:

"عرضداشت ہوا خواہ، اسداللہ" (۲)

متعدد خطوط میں میرزا صاحب نے یہ جزو ترک بھی کر دیا ہے۔ اُن میں چند ایسے ہیں جن میں کنایۃً نام آگیا ہے۔ مثلاً علائی کو لکھتے ہیں:

"نام اپنا بدلکر مغلوب رکھ لیا ہے" (۳)

اُنھیں کو دوسرے خط میں لکھا ہے:

"کاتب کا نام غالب ہے کہ دستخط سے پہچان جاؤ" (۴)

ایک اور خط میں تحریر کیا ہے:

کاتب کا نام غالب ہے کہ تم جانتے ہو گے" (۵)

سرور کو بالکل نئے انداز سے لکھا ہے:

"کاتب وہی ہے جو لفافۂ ملفوفہ کا مکتوب الیہ ہو" (۶)

میرزا صاحب کے جس قدر سرکاری اور نجی خطوط میری نظر سے گزرے ہیں، اُن میں سے

(۱) اردوی: ۳۱۴ (۲) مکاتیب: ۳ (۳) اردوی: ۳۹۵ (۴) ایضاً: ۴۳۴ -
(۵) ایضاً: ۴۴۲ (۶) ایضاً: ۱۳۳-

ایک دو کے سوا نام یا مہر سے کوئی خالی نہیں ہے؛ اس لیے جن خطوں میں نام موجود نہیں ہے، اُن کے متعلق یہ سمجھنا چاہیے کہ یا تو ناقلوں نے نقل کرتے وقت نام چھوڑ دیا اور یا آخر میں نام کے بجائے "غالب" نقش کی مہر ثبت تھی، جو نقل کرنے سے رہ گئی۔

تاریخ کتابت خطوط

میرزا صاحب خط کی تاریخ بھی ہمیشہ ایک انداز سے نہیں لکھا کرتے تھے۔ اُن کی تنوع پسند طبیعت اس خشک خرد مکتوب میں بھی نئے نئے شگوفے کھلاتی، اور وہ کبھی آغاز میں، کبھی درمیان میں اور کبھی آخر میں تاریخ ثبت کرتے۔ تاریخ کے ساتھ ساتھ بعض وقت دن گھڑی اور سال بھی تحریر کرتے تھے۔ انگریزی اور ہجری تاریخوں میں سے اُن کے یہاں بسا اوقات صرف انگریزی یا صرف ہجری اور کبھی کبھی دونوں پائی جاتی ہیں مگر سنیں لکھنے کا التزام کم اور علامتِ ہجری و عیسوی کا التزام کمتر ہے۔

آغاز کی تاریخ

میرزا صاحب موجودہ یورپی طرز کے مطابق القاب و آداب سے قبل تاریخ بہت کم لکھتے تھے۔ اُن کے یہاں القاب کے بعد آغازِ مطلب میں تاریخ زیادہ ہوتی ہے۔ مجروح کو لکھتے ہیں:

"میاں، آج یکشنبہ کا دن ساتویں فروری کی اور شاید بائیسویں جمادی الثانی کی ہے۔ دوپہر کے وقت شیخ مشرف علی، رہنے والے استاماؤ کے کو چہ کے، میرے پاس آئے اور انھوں نے تمھارا خط، لکھا ہوا ۱۵ جمادی الثانی کا دیا۔" (۱)

یوسف میرزا کو لکھا ہے:

"آؤ، صاحب، میرے پاس بیٹھ جاؤ، آج یکشنبہ کا دن ہے، ساتویں تاریخ رمضان کی اور اوسنیویں اپریل کی۔" (۲)

تفتہ کو تحریر کرتے ہیں:

"آج منگل کے دن پانچویں اپریل کو تین گھڑی دن رہے ڈاک کا ہرکارہ آیا۔" (۳)

(۱) اردو ی: ۱۵۶ (۲) ایضاً: ۳۳۰ (۳) ایضاً: ۴۵۔

علائی کو لکھا ہے :

"چارشنبہ ۱۸ مئی ... بقول عوام باسی عید کا دن صبح کا وقت ہے" (۱)

شفق کو لکھتے ہیں :

"خداوند نعمت! آج دوشنبہ ۶ رمضان کی اور ۱۵ فروری کی ہے۔ اس وقت کہ بارہ پر تین بجے ہیں، عطوفت نامہ پہنچا" (۲)

نیّر کو تحریر کیا ہے :

"جناب عالی! آج دوشنبہ ۳ جنوری سنہ ۱۸۵۹ء کی ہے۔ پہر دن چڑھا ہوگا کہ ابر گھر رہا ہے۔ ترشح ہو رہا ہے۔ ہوا سرد چل رہی ہے۔ پینے کو کچھ میسر نہیں، ناچار روٹی کھائی ہے۔" (۳)

وسط کی تاریخ

کبھی مطالب کے ضمن میں میرزا صاحب اس طرح تاریخ لکھتے کہ بظاہر پڑھنے والے کو تاریخ کا خیال تک نہیں گزرتا، بلکہ تاریخ بھی منجملۂ مطالب معلوم ہوتی تھی۔ مثلاً علائی کو لکھا ہے :

"تمہارے پاس جو قاطع برہان پہنچی ہے، اگر چھاپے کی ہے تو صحیح ہے۔ جہاں تردد ہو غلطنامۂ طمقہ میں دیکھ لو۔ زیادہ انکشاف منظور ہو، مجھ سے پوچھ لو۔ اور اگر قلمی ہے، تو درجۂ اعتبار سے ساقط ہے، اوس کو میری تالیف نہ سمجھو۔ بلکہ مجھکو مول لے لو اور اوس کو پھاڑ ڈالو۔ آج یوم الخمس ۱۹ جون المبارک بارہ پر تین بجے تمہارا خط آیا۔ ادھر پڑھا، ادھر جواب لکھنے بیٹھا۔ یہانتک لکھ چکا تھا کہ شیخ شہاب الدین سہروردی آئے۔ تمہارا خط اونکو دیا۔ وہ پڑھ رہے ہیں، ہم لکھ رہے ہیں۔ ابر آیا ہوا ہے، ہوا سرد چل رہی ہے۔" (۴)

شاہ عالم مارہروی کو تحریر کیا ہے :

"یا ستائی لکھ چکا تھا کہ ایک چپراسی آیا، اور اوس نے خط تمہارے نام کا ٹکٹ

(۱) اردوی: ۴۴۶ (۲) ایضاً: ۲۹۵ (۳) ایضاً: ۲۷۵ (۴) ایضاً: ۳۱۲۔

لکھا ہوا دیا اور کہا کہ ڈپٹی صاحب نے سلام کہا ہے اور یہ خط دیا ہے۔ اب میں یہ خط اپنا
اور ان کے خط کے ڈاک گھر میں بھیجتا ہوں۔ صبح کا وقت یکشنبہ کا دن ۸ سفر اور ۲۵
اگست کی ہے۔ ڈپٹی صاحب چاندنی چوک حافظ قطب الدین سوداگر کی حویلی میں
رہتے ہیں۔" (۱)

مجروح کو لکھتے ہیں:

"تمہاری خکایت ہای ہجا کا جواب یہ ہے کہ تم نے جو خط مجکو پانی پت سے بھیجا تھا،
اور کرنال کی روانگی کی اطلاع دی تھی، میں نے تجویز کر لیا تھا کہ جب کرنال سے خط
آئے گا، تو میں جواب لکھوں گا۔ آج شنبہ ۱۵ اکتوبر صبح کا وقت، ابھی کھانا پکا بھی
نہیں، تبرید پی کر بیٹھا تھا کہ تمہارا خط آیا اور پڑھا اور یہ جواب لکھا۔" (۲)

خاتمے کی تاریخ

خاتمے کی تاریخ میں بھی میرزا صاحب موجودہ رسم تحریر کی مخالفت کرتے نظر آتے ہیں۔
اُن کے یہاں آخری تاریخ کا ذکر بھی ضمنِ مطالب میں ہوتا ہے۔ البتہ عرائض میں دو
چار مقامات کے علاوہ ہر جگہ خط ختم کرنے کے بعد نام سے قبل یا بعد تاریخ ثبت کی ہے۔
مثلاً مہر کو لکھا ہے:

"دوشنبہ کا دن ۲۰ دسمبر کی صبح کا وقت ہے۔ انگیٹھی رکھی ہوئی ہے۔ آگ تاپ
رہا ہوں، اور خط لکھ رہا ہوں۔ یہ اشعار یاد آ گئے۔ تم کو لکھ بھیجے۔ والسلام۔" (۳)

ذکا کو تحریر کیا ہے:

"جواب خط کا طالب غالب۔ سہ شنبہ از روی جنتری ۲۶ اور از روی رویت ۵ رجب
سنہ ۱۲۸۳ھ اور ۴ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ء بھائی، یہ خط از راہِ احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں۔" (۴)

علائی کو لکھتے ہیں:

"۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۶۵ء کی بدھ کا دن صبح کے آٹھ بجا چاہتے ہیں۔ کاتب کا نام غالب ہو
کہ تم جانتے ہو گے۔" (۵)

(۱) اردو: ۲۰۷ (۲) ایضاً: ۱۸۰ (۳) ایضاً: ۲۶۷ (۴) ایضاً: ۴۳ (۵) ایضاً: ۴۴۲۔

اُنھیں کو لکھتے ہیں:

"... مرقومۂ شنبہ یکم جون وقت صبح چھ بجے سات کے عمل میں" (۱)

خاتمے میں اعادۂ تاریخ

کبھی کبھی میرزا صاحب آغاز میں تاریخ لکھ دینے کے بعد خاتمے میں اُس کا دوبارہ اجمالی ذکر کرتے ہیں علائی کو لکھا ہے:

"دن تاریخ اپنا نام آغاز کتابت میں لکھ آیا ہوں۔ اب ارسال جواب کی تاکید کے سوا اور کیا لکھوں" (۲)

اُنھیں کو ایک اور خط میں لکھتے ہیں:

"دن تاریخ صدر میں لکھ آیا ہوں۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ دستخط سے پہچان جاؤ" (۳)

سہ بارہ تحریر کیا ہے:

"تاریخ اوپر لکھ آیا۔ نام اپنا بہ لکر مغلوب رکھ لیا ہے" (۴)

وقت کتابت کا ماحول

بعض اوقات میرزا صاحب تاریخ کے علاوہ خط لکھتے وقت کی حالت کا نقشہ بھی مکتوب الیہ کی نگاہوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتے، تاکہ مکتوب الیہ یہ محسوس کرسکے کہ خود میرزا صاحب کے پاس بیٹھا ہوا اُن کی زبان سے مکتوبہ واقعات سن رہا ہے، مطالبِ خط سے زیادہ لطف اندوز ہو۔ مثلاً گرمی کا موسم ہے، رامپور کے پہلے سفر سے واپس دلی پہنچے ہیں، اور مجروح کی فرمایش پر روداد سفر لکھی ہے۔ اُس کے آخر میں فرماتے ہیں:

"کوٹھری میں بیٹھا ہوں، ٹٹی لگی ہوئی ہے، ہوا آرہی ہے، پانی کا جھجر دھرا ہوا ہے، حقہ پی رہا ہوں، یہ خط لکھ رہا ہوں۔ تم سے باتیں کرنے کو جی چاہا، یہ باتیں کرلیں" (۵)

برسات کے موسم میں نیّر کو تحریر کرتے ہیں:

"پہر دن چڑھا ہوگا کہ ابر گھر آیا ہے، ترشح ہو رہا ہے، ہوا سرد چل رہی ہے پینے کو

(۱) اردوی: ۴۰۸ (۲) ایضاً: ۴۰۸، ۴۰۹ (۳) ایضاً: ۴۰۴ (۴) ایضاً: ۳۹۵ (۵) ایضاً: ۱۶۲

کچھ میسر نہیں، ناچار روٹی کھائی ہے۔

افتا پر از ابر بہمن ہی سفالینہ جام سن ازمی تہی

غمزدہ و دردمند بیٹھا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ تمہارا خط لایا۔" (۱)

شفق کو لکھتے ہیں:

"پیر و مرشد! شب رفتہ کو مینہ خوب برسا۔ ہوا میں فرط برودت سے گزند پیدا ہو گیا اب صبح کا وقت ہے، ہوا ٹھنڈی بے گزند چل رہی ہے، ابر تنک محیط ہے، آفتاب نکلا ہے، پر نظر نہیں آتا ہے۔" (۲)

اُنھیں کو ایک اور خط میں لکھا ہے:

"پیر و مرشد! ۱۲ بجے تھے، میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خ دیا۔ میں نے کھولا، پڑھا۔ بھلے کو انگرکھا یا کرتا گلے میں نہ تھا۔ اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا؟ میرا نقصان ہوتا۔" (۳)

میرزا صاحب کا خط

میرزا صاحب کا خط نہایت پختہ شفیعا آمیز نستعلیق تھا۔ چونکہ وہ ایرانی اداؤں کے دلدادہ تھے، اس لیے خط سے ولایتی شان زیادہ نمایاں ہے۔ آخر عمر میں رعشہ پیدا ہو جانے سے دائروں اور گشتوں میں پہلی سی خوش نمائی باقی نہیں رہی تھی، چنانچہ ان خطوں کے دیکھنے سے پہلی نظر میں ہاتھ کی تھرتھراہٹ کا احساس ہوتا ہے۔

سامانِ کتابت و کاغذ

میرزا صاحب کے خطوط میں سامانِ کتابت کا بھی ذکر آیا ہے، اس لیے اُس پر اجمالی نظر مناسب ہو گی۔

میرزا صاحب بالعموم باریک ولایتی کاغذ استعمال کرتے تھے، جو نیلگوں یا سفید یا گلابی ہوتا۔ دربارِ رامپور میں اُن کی جس قدر عرضیاں پیش ہوئی ہیں، وہ بجز ایک دو کے تمام اسی قسم کے گراں قیمت کاغذ پر لکھی ہوئی ہیں۔ سنہری سلیمپور اور خلیفہ احمد علی صاحب کے

(۱) اردوی: ۲۷۵ (۲) ایضاً: ۳۰۰ (۳) ایضاً: ۳۰۳

نام کے خطوط گھٹیا کاغذ پر ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ میرزا صاحب کاغذ کے انتخاب کے وقت مکتوب الیہ کے رتبے کا لحاظ رکھتے تھے۔

بعض اوقات تنگدستی کی وجہ سے میرزا صاحب کے پاس کاغذ کا ذخیرہ ختم ہو جاتا، تو جواب دینے کے لیے روپے کا انتظار کرنے کے عوض کتاب میں سے سادہ ورق پھاڑ لیتے تھے۔ ۸ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء کو مجروح کو خط لکھتے وقت یہی صورت اختیار کرنی پڑی تھی۔ اُسی خط میں فرماتے ہیں:

"بھائی! نہ کاغذ ہے، نہ ٹکٹ ہے۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں، اور بیرنگ لفافہ میں لپیٹ کر بھیجتا ہوں۔ خفگین نہ ہونا۔ کل شام کو کچھ فتوح کہیں سے پہنچ گئی ہے۔ آج کاغذ و ٹکٹ منگا لوں گا۔" (۱)

قلم

میرزا صاحب کے زمانے تک لوہے کے قلم کا رواج عام نہ ہوا تھا، اس لیے وہ نیزے کا قلم استعمال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ قلم بناتے میں چاقو سے انگوٹھا زخمی ہو گیا، اور اس بنا پر منشی شیو نرائن کے خط کے جواب میں تاخیر ہوئی، تو میرزا صاحب نے تحریر کیا تھا:

"لو صاحب! تم خط کے جواب نہ بھیجنے سے گھبرا رہے ہو گے۔ حال یہ ہے کہ قلم بناتے میں میرا ہاتھ انگوٹھے کے پاس سے زخمی ہو گیا اور ورم کر آیا۔ چار دن روٹی بھی مشکل سے کھائی گئی ہے۔ بہرحال اب اچھا ہوں۔" (۲)

یہ سنہ ۱۸۵۸ء کا واقعہ ہے۔ آخرِ عمر میں رعشے کے سبب سے خود قلم بنانے کے قابل نہ رہے تھے، لڑکوں سے بنوا لیتے تھے۔ ۱۳ مارچ سنہ ۱۸۶۷ء کو نواب خلد آشیاں کو لکھتے ہیں:

"دو ران سر اور رعشہ اور ضعفِ بصر تین بیماریاں نئی پیدا ہوئی ہیں۔ قلم نہیں بنا سکتا،

(۱) اردوی: ۱۵۵ (۲) ایضاً: ۳۶۲

لڑکوں سے بنوا لیتا ہوں۔" (۱)

لفافے

شروع میں میرزا صاحب چھپے ہوئے لفافے ناپسند کرتے، اور اپنے ہاتھ سے لفافے بنا کر ادھر اُدھر بھیجتے تھے۔ ایک بار منشی شیو نرائن نے خود ساختہ لفافوں کے استعمال سے خیال کیا کہ تنگدستی کے سبب سے میرزا صاحب ایسا کرتے ہیں اور یہ سوچکر میرزا صاحب کو لفافوں کا ایک بنڈل روانہ کیا۔ میرزا صاحب نے اس سے مطلع ہو کر لکھا:

"لفافوں کی خبر بھیجی۔ آپ نے کیوں تکلیف کی۔ لفافے بنانا دل کا بہلانا ہے۔ بیکار آدمی کیا کرے۔ بہرحال جب لفافے پہنچ جائیں گے، ہم آپ کا شکر بجا لائیں گے۔

ہر چہ از دوست می رسد نیکوست۔" (۲)

لیکن اس کرمفرما نے لفافوں کے اوپر "از مقام، در مقام، تاریخ و ماہ" طبع کرا کے ارسال بھیجا۔ میرزا صاحب ان باتوں کو ناپسند کرتے تھے۔ اُنھوں نے یہ ہدیہ دوستوں میں تقسیم کر دیا، اور جب منشی صاحب نے ۱۸ دسمبر سنہ ۱۸۵۸ء کو دوبارہ اُسی قسم کے لفافے ارسال کیے، تو لکھا:

"برخوردار، آج اس وقت تمہارا خط مع لفافوں کے لفافے کے آیا۔ دل خوش ہوا۔ بھائی، میں اپنے مزاج سے ناچار ہوں۔ یہ لفافے "از مقام و در مقام و تاریخ و ماہ" مجھکو پسند نہیں، آگے جو تم نے مجھے بھیجے تھے، وہ بھی میں نے دوستوں کو بانٹ دیے۔ اب یہ لفافوں کا لفافہ اس مراد سے بھیجتا ہوں کہ ان کے عوض یہ لفافے جو "در مقام و از مقام" سے خالی ہیں، جن میں تم اپنے خط بھیجا کرتے ہو، مجھکو بھیجدو، اور یہ لفافے اوس کے عوض مجھ سے لیلو، اور اگر اوس طرح کے لفافے نہوں تو ان کی کچھ ضرورت نہیں۔" (۳)

اس کے بعد منشی صاحب نے جو کیا، اُس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ لیکن منشی نبی بخش کے نام کے مکتوب مورخہ ۲۲ ستمبر سنہ ۵۸ء سے اتنا پتا چلتا ہے کہ سنہ ۵۸ء میں لفافہ

(۱) مکاتیب: ۶۸ (۲) اردوی: ۳۴۹ (۳) ایضاً: ۳۶۵

سازی کا خاصا مشغلہ رہا تھا۔ فرماتے ہیں:

"اللہ! اللہ! یہ دن بھی یاد رہیں گے۔ خط سے خط لکھے گئے ہیں۔ مجکو اکثر اوقات لفافے بنانے میں گزرتے ہیں۔ اگر خط نہ لکھوں گا، تو لفافے بناؤں گا۔" (۱)

رامپور بھیجے ہوئے بیشتر لفافے محفوظ ہیں۔ ان میں سے نواب فردوس مکاں کی خدمت میں بھیجے ہوئے کل اور نواب خلد آشیاں کے نام کے ۱۸ نومبر سنہ ۱۸۶۶ء سے پہلے تک کے تمام لفافے دستی بنے ہوئے ہیں۔ لیکن منشی بیلچند کو ۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ء سے حاشیوں پر بیل چھپے ہوئے لفافے بھیجے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ با تکلف مکتوب الیہ کی خدمت میں بیل دار حاشیوں کے لفافے لکھنا میرزا صاحب کے نزدیک نامناسب تھا۔ جب ضعف نے مجبور کر دیا، تو ناچار چھپے لفافے لکھنا شروع کیے تھے۔

میرزا صاحب کے اپنے ہاتھ کے تیار کیے ہوئے لفافوں میں ایک کا رنگ پیلا اور دو چار کا گلابی ہے، باقی ہلکے آسمانی یا سفید رنگ کے ہیں۔ یہ لفافے بالعموم اُسی کاغذ سے بنائے گئے ہیں، جس پر خط لکھا ہے، اور تمام مستطیل شکل کے ہیں۔ البتہ دستی بنے ہوئے لفافے حسبِ اقتضائے وقت چھوٹے بڑے ہو گئے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا ۸ انچ لمبا اور ۳½ انچ چوڑا، اور سب سے چھوٹا ۵ انچ لمبا اور ۲¼ انچ چوڑا ہے۔ مطبوعہ کا ناپ ۶½ × ۳ اور ۵¼ × ۲¼ ہے۔

میرزا صاحب کے لفافے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سرنامے میں وہ سادگی نہیں برتی ہے، جو خطوط میں نظر آتی ہے۔ اُن کے ابتدائی چند لفافوں پر یہ عبارت مندرج ہے:

ا

یارب این نیایشنامہ بشہر رامپور بنظر انور جناب مستطاب نواب الالقاب عالی شان قلزم فیض محیط احسان حضرت نواب یوسف علی خان بہادر دام اقبالہ بگزرد از غالب من مقام دہلی مرسلہ چہارشنبہ ۲۸ جنوری ۱۸۵۷ء پوست پڈ

(۱) اردوئی: ۲۷۳۔

۲

رام پور

یارب این نیایشِ بحضور نواب صاحب ـــــ (۱) ـــــ عمان احسان جناب مستطاب نواب ـــــ مقبول و بایخ ارزانی باد

از غالب کلکتہ

چار شنبہ یازدہم فروری ۱۸۵۸ء

۳

بحضور پر نور جناب مستطاب ـــــ محیط احسان حضرت نواب محمد ـــــ بعز قبول مقرون باد

بدوست پیوستہ

۷

بنظر انور جناب نواب صاحب ـــــ محیط احسان نواب ـــــ عز نصرہ دام اقبالہ بگزرد

از غالب

بدوست پیوستہ

تیرھویں لفافے پر "در رام پور موصول و بخدمت فیض موہبت نواب صاحب الخ" اور چودھویں پر "رام پور سراسر سرور بمحفل فیض منزل نواب صاحب" لکھا ہے۔ بعد ازاں عام طور پر سرنامے کی یہ صورت طے کر لی ہے:

رام پور سراسر سرور ـــــ جمعہ ۱۳ جولائی سنہ ۶۰ ـــــ ۱ شامپ پیڈ

بحضور نواب صاحب والا مناقب ـــــ مقبول باد

ٹکٹ

نواب خلد آشیاں کے لیے صرف "امیر المسلمین" بڑھا دیا ہے۔ انھیں کے نام کے ایک لفافے پر تاریخ کی جگہ لکھا ہے: "سہ شنبہ ماہ اکتوبر دن کو بارہ بجے ڈاک میں بھیجا" بعض لفافوں پر ایسی باتیں بھی لکھدی ہیں، جو آجکل کوئی نہیں لکھتا۔ مثلاً نواب زین العابدین خان بہادر کے

(۱) اس فکیر کا مقصد یہ ہے کہ سابق سرنامے کی اتنی عبارت اس سرنامے میں بھی پائی جاتی ہے۔

لفافے پر تحریر فرماتے ہیں:

> در شہر رام پور بدست نواب صاحب مشفق و مکرم مظہر لطف و کرم نواب زین العابدین خان صاحب عرف کلن میاں سلمہ اللہ تعالیٰ مقبول باد از غالب بیرنگ مرسلہ ۲۵ مارچ ۱۸۵۸ء فروری جواب طلب شتاب طلب ۱۲
> چون عجلت در ارسال مکتوب می بایست ہم بروز چہارشنبہ آخر روز ۲۴ مارچ فرستادہ شد ۱۲

میرزا صاحب کے جس قدر لفافے نظر سے گزرے ہیں، اُن میں سے صرف دو پر پتہ وغیرہ اردو میں لکھا گیا ہے۔ باقی سب کی زبان فارسی ہے۔ اردو والوں میں سے ایک مولوی محمد حسن خاں مالکِ مطبعِ حسنی رام پور کے نام ہے جس کا سرنامہ حسبِ ذیل ہے:

> ٹکٹ
> رام پور آزاد خاں کا بنگلہ دبدبۂ سکندری کا مطبع
> محمد حسین خاں مالک مطبع پیڈ ضروری
> ۲۵ فروری ۱۸۶۶ء

دوسرا خون بریلوی کو تحریر کیا گیا ہے۔ اس کا عکس خطوطِ غالب میں صفحہ ۱۱۳ کے مقابل شائع ہو چکا ہے۔ اس کے سرنامے کی عبارت یہ ہے:

> بریلی جامع مسجد کے پاس حضرت قاضی عبدالجلیل صاحب کی خدمت میں پہنچے
> اسد بیرنگ ۱۶ ماہ اکتوبر سنہ ۶۶ء

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آخر عمر میں میرزا صاحب بے تکلف احباب اور شاگردوں کو اردو ہی میں پتا لکھنے لگے تھے۔

ٹکٹ

میرزا صاحب بغیر پوسٹ پیڈ خط بھیجتے، اور اوپر کے بائیں گوشے میں "پیڈ، پوسٹ پیڈ"

اسٹامپ پیڈ پیڈ ضروری، ڈبل پیڈ ضروری، پیڈ ضروری واجب العرض، اسٹامپ پیڈ ضروری، اسٹامپ اسٹامپ ضروری، یا پیڈ واجب العرض ضروری" لکھدیتے تھے۔

لفافے پر ٹکٹ لگانے کا مقام بھی کوئی خاص تھا۔ کبھی لفافے کے اوپر اور کبھی پشت پر، اور رویں بھی کبھی دائیں اوپر یا نیچے کے گوشے میں، کبھی وسط میں نیچے کی طرف، اور کبھی بائیں اوپر یا نیچے کے گوشے میں چسپاں کرتے تھے۔ ایک بات کا انھوں نے بڑا لحاظ رکھا ہے اور وہ یہ ہے کہ ایک دو کو چھوڑ کر باقی ہر ٹکٹ پر اپنا تخلص "اسدؔ" یا "غالبؔ" اور اگر دو ٹکٹ ہوئے، تو پہلے پر "اسدؔ" اور دوسرے پر "غالبؔ" ضرور لکھا ہے۔ ایک دو پر "اسد اللہ" بھی ہے۔ اس سے مقصود یہ ہوگا کہ دوسرا شخص اس ٹکٹ کو استعمال نہ کر سکے۔

ان ٹکٹوں پر ڈاک خانے کی جو مہر لگائی گئی ہے، اس پر ۵ نومبر سنہ ۵۹ء تک انگریزی میں "۶۴" اور ۱۳ جولائی سنہ ۶۰ء سے "۶۰" لکھا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مہر اور مثبت ہے جس پر انگریزی میں "ڈلہائی" (DELHIE) منقوش ہے۔ ۱۰ اپریل ۱۸۶۱ء کے لفافے سے ڈاک خانے والوں نے سرخ روشنائی سے انگریزی میں رامپور (RAMPURE) بھی لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اس لفافے سے دہلی کی مہر کے ساتھ ایک مہر میرٹھ کی بھی شروع ہوئی ہے۔ اس میں اوپر میرٹھ، درمیان میں تاریخ اور نیچے سورٹڈ (SORTED) منقوش ہوتا ہے۔ ۱۵ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء سے مراد آباد کی مہر بھی چسپاں نظر آتی ہے۔

روشنائی

میرزا صاحب ہمیشہ سیاہ روشنائی استعمال کرتے تھے، جو عموماً بہت روشن اور پختہ ہوتی۔ آخری ایام کے خطوط میں پھیکی روشنائی بھی نظر آتی ہے، جس کی وجہ خود میرزا صاحب کی "قلدانِ انشا" سے بے توجہی ہوگی۔ ضرورت کے وقت لڑکوں سے قلم اور انھیں کی روشنائی سے لکھا کرتے ہوں گے، اور خود "لوح و قلم" کی درستی اور اہتمام سے اس لیے بے پروا ہو گئے ہوں گے، کہ اب انھیں ان دونوں کی شہادت کی ضرورت نہ تھی۔ علم ادب اُن کا لوہا مان چکا تھا۔

قواعد ڈاک کی پابندی

میرزا صاحب ڈاک کے قاعدوں کے سخت پابند تھے۔ وہ خود بھی خلاف ورزیٔ قانون سے احتراز کرتے، اور احباب کو بھی اسی امر کی ہدایت کرتے رہتے تھے۔ ایکبار ذکا کو لکھا ہے:

"خط میں خط لفوف کرنا جانب حکام سے ممنوع ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو میں اون کے نام کا خط تمھارے خط میں لفوف کر کے بھیجتا۔" (۱)

منشی غلام بسم اللہ نے اپنی غزل کے ساتھ کسی منصف صاحب کی غزل بھی ارسال کردی تھی۔ اُن کی اس سہل انگاری پر سرزنش کرتے ہوے لکھتے ہیں:

"سنیے، حضرت، خط میں خط (کا) تداخل برا ہے۔ اگر جہاں کی ڈاک میں کبھی خط کھل گیا، تو مجھ سے پچاس روپیہ لیے جائیں گے، یا قید کا حکم ہوگا۔ آیندہ آپ خط جداگانہ بھیجا کیجیے۔ اس باب میں تاکید جانیے۔ کوئی حیلہ جواز کا آپ کی طرف سے مسموع نہ ہوگا۔" (۲)

سرور نے پارسل میں کچھ خط رکھدیے تھے۔ اُن کو تحریر کرتے ہیں:

"پارسل میں خطوط بھیجنے محل اندیشہ ہے۔ خدا نے بچایا۔ چونکہ اب وہ خط آپ کے کچھ کام کے نہ سمجھا، از راہِ احتیاط پارسل میں سے نکال لیے۔" (۳)

ایکبار تفتہ کے نام ایک پارسل حسبِ قاعدہ ایک آنے کا ٹکٹ چسپاں کر کے ڈاک خانے بھیجا۔ جو شخص پارسل لے کر گیا تھا، اُس نے غلطی سے خطوں کے لکس میں پارسل ڈال دیا۔ میرزا صاحب نے واقعے سے مطلع ہو کر تفتہ کو لکھا:

"صاحب، کل پارسل اشعار کا ایک آنہ کا ٹکٹ لگا کر اور اوپر یہ لکھ کر کہ یہ پارسل خط نہیں ہے، ڈاک میں بھیجدیا۔ ڈاک منشی نے کہا کہ خطوں کے صندوق میں ڈالدو۔ خدمتگار ناخواندہ آدمی۔ اوس کا حکم بجا لایا، اور اوس کو خطوں کے صندوق میں ڈال آیا۔ وہ لفظ کہ "یہ خط نہیں ہے، پارسل ہے" دست آویز معقول ہے۔ اگر وہاں کے

(۱) اردوی: ۳۹ (۲) عود: ۱۸۶ (۳) اردوی: ۱۳۷

ڈاکیے تم سے خط کا محصول مانگیں، تو تم اوس جلد کے ذریعہ سے گفتگو کر لینا۔" (۱)

دراصل میرزا صاحب کی احتیاط کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک بار تفتہ کی غلطی کا خمیازہ بھگت چکے تھے، اور غالباً پارسل کو خطوں کے بکس میں ڈالدینے کی وجہ سے اُن کو پوسٹ پیڈ پارسل کا مزید محصول ادا کرنا پڑا تھا۔ ۲۸ جولائی سنہ ۱۸۵۸ء کو یہ واقعہ خود تفتہ کو لکھا ہے:

"میرزا تفتہ! کل قریب دوپہر کے ڈاک کا ہرکارہ، وہ جو خط بانٹا کرتا ہے، آیا، اور اوس نے پارسل موم جامے میں لپٹا ہوا دیا۔ پہلے تو حیران رہا کہ پاکٹ خطوں کی ڈاک میں کیوں آیا؟ پارسل جب اوس کی تحریر دیکھی، تو تمہارے ہات کا بم فلٹ لکھا ہوا اور دو ٹکٹ لگے ہوئے۔ مگر اوس کے آگے کالی مہر اور کچھ انگریزی لکھا ہوا۔ ہرکارہ نے کہا کہ ایک روپیہ دس آنے دلوائیے۔ دلوا دیے، اور پارسل لے لیا۔ مگر حیران کہ یہ کیا پیچ پڑا؟ قیاس ایسا چاہتا ہے کہ تمہارا آدمی جو ڈاک گھر گیا اس کو خطوں کے بکس میں ڈال آیا۔ ڈاک کے کارپردازوں نے غور نہ کی، اور اوس کو بیرنگ خطوں کی ڈاک میں بھیجدیا۔" (۲)

ڈاکیے کا لطیفہ

ایک بار ڈاکیے کی غفلت سے ایک دلچسپ لطیفہ پیدا ہوگیا تھا۔ واقعہ یہ ہوا کہ میرزا صاحب کے نام ایک خط آیا۔ اُس کے پتے میں مکتوب الیہ کے نام کے ساتھ جو تعظیمی الفاظ استعمال ہوئے تھے، اُن میں ایک لفظ "کیشاں" بھی تھا۔ ڈاکیے نے اُسے "کپتان" پڑھا، اور میرزا صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کی۔ میرزا صاحب نے شفق کو یہ واقعہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ایک لطیفۂ نشاط انگیز سنیے۔ ڈاک کا ہرکارہ، جو بلیماروں کے خط پہنچاتا ہے، اندرون میں ایک بنیا پڑھا لکھا حرف شناس کوئی فلاں ناتھ ڈھمک داس ہے۔ میں بالاخانہ پر رہتا ہوں۔ حویلی میں آکر اوس نے داروغہ کو خط دیا۔ اور اوس نے خط دے کر مجھ سے کہا کہ ڈاک کا ہرکارہ بندگی عرض کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ مبارک ہو!

(۱) اردوئے معلی: ۱۰۹ (۲) ایضاً: ۵۸

آپ کو، جیسا کہ دلی کے بادشاہ نے زابی کا خطاب دیا تھا، اب کالپی سے خطاب کپتانی کا ملا۔ حیران کہ یہ کیا کہنا ہے؛ سرنامہ کو غور سے دیکھا۔ کہیں قبل از اسم مخدوم نیاز "کپتان" لکھا تھا۔ اوس قرم ساق نے اور الفاظ سے قطع نظر کرکے "کپتان" کو کپتان پڑھا۔" (۱)

بیرنگ خطوط

بیرنگ خطوط ارسال کرنے کو میرزا صاحب قانونِ محبت و اخلاق کے خلاف جانتے، اور اس لیے بغیر کسی معقول وجہ کے کبھی بیرنگ خط نہیں لکھتے تھے۔ سید احمد محمد مودودی کو ایک بیرنگ خط لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میرا شیوہ نہیں ہے خط بیرنگ بھیجنا۔" (۲)

میرزا صاحب اپنے ہر بیرنگ خط میں بیرنگی کی وجہ بھی لکھ دیا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ

۱) یا تو اُس وقت بیرنگ خط لکھا کرتے جب اُن کے پاس ٹکٹ موجود نہ ہوتا، خواہ اس لیے کہ جیب اس کی اجازت نہ دیتی، یا بروقت ڈاک خانے سے ٹکٹ کا حصول دشوار ہوتا؛ مگر اس عذر کے لیے بے تکلف احباب اور شاگرد مخصوص تھے۔ مجروح کو ایک بیرنگ خط میں لکھا ہے:

"بھائی! نہ کاغذ ہے، نہ ٹکٹ ہے۔ اگلے لفافوں میں سے ایک بیرنگ لفافہ پڑا ہے۔ کتاب میں سے یہ کاغذ پھاڑ کر تم کو خط لکھتا ہوں، اور بیرنگ لفافہ میں لپیٹ کر بھیجتا ہوں۔ نگلین نہ ہونا۔ کل شام کو کچھ فتوح کہیں سے پہنچ گئی ہے۔ آج کاغذ و ٹکٹ منگاؤں گا۔" (۳)

اسی طرح علائی کو لکھتے ہیں:

"بھائی! سچ تو یوں ہے کہ اندنوں میں میرے پاس ٹکٹ نہیں۔ اگر بیرنگ بھیجوں تو کہار مانگے اور ٹھہر نہیں سکتا۔ ڈاک گھر تک جائے کون؟" (۴)

ثاقب کو زیادہ مضمحکانہ انداز میں تحریر کیا ہے:

(۱) اردو: ۳۰۰ (۲) ایضاً: ۳۴۴ (۳) ایضاً: ۱۵۵ (۴) ایضاً: ۴۲۵۔

"آج میرے پاس ٹکٹ ہو نہ دام۔ معاف رکھنا۔ والسلام" (۱)

۲) یا اُس وقت بیرنگ خط ارسال کرتے کہ اُس کے تلف ہو جانے کا خطرہ ہوتا چونکہ تلف ہو جانے کا خطرہ اہم مکاتیب کے سلسلے میں زیادہ ناپسندیدہ معلوم ہوتا ہے، اور اہم مکاتیب بے تکلف اور باتکلف دونوں قسم کے مکتوب الیہ کو لکھے جاتے ہیں، بنا بریں اس عذر کے ماتحت میرزا صاحب نے والیانِ ریاست اور اُمرا تک کو بیرنگ خطوط لکھے ہیں۔ نواب فردوس مکاں کو دوسرا عریضہ مشتمل بر قصیدۂ مدحیہ بیرنگ بھیجا تھا۔ ایک بار شفق نے خط نہ لکھنے کی شکایت کی، تو اس کے جواب میں میرزا صاحب نے لکھا:

"سوچتا ہوں کہ دونوں خط بیرنگ گئے تھے۔ تلف ہونا کسی طرح متصور نہیں" (۲)

دراصل میرزا صاحب یہ سمجھتے تھے کہ ڈاکیا بیرنگ خط ضائع نہیں کرتا؛ بلکہ کوشش کر کے مکتوب الیہ تک خط پہنچاتا ہے، تاکہ اُس سے محصولِ ڈاک وصول کر سکے۔ یہ خیال سید احمد حسن مودودی کے خط میں ظاہر بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"یہ خط عمداً بیرنگ بھیجتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ پیڈ کے تلف ہونے کا احتمال ہے، اور بیرنگ کا نہیں" (۳)

سیاح کو لکھتے ہیں:

"پیڈ خط گاہ گاہ تلف بھی ہو جاتا ہے۔ نظر اس بات پر یہ خط تم کو بیرنگ بھیجتا ہوں تاکہ ضائع ہونے کا احتمال قوی رہے" (۴)

سرور کو ضروری خطوط کے بیرنگ ارسال کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایک قاعدہ آپ کو بتاتا ہوں۔ اگر اوس کو منظور کیجیے گا تو خطوط کے نہ پہنچنے کا احتمال اوٹھ جائے گا، اور رجسٹری کا دردِ سر جاتا رہے گا۔ آدھ آنہ سہی، ایک آنہ سہی آپ بھی خط بیرنگ بھیجا کیجیے، اور میں بھی بیرنگ بھیجا کروں۔ اسٹامپ پیڈ خطوط تلف بھی ہوتے ہیں۔ اس قاعدہ کا جیسا کہ میں واضع ہوا ہوں، بادی بھی ہوا، اور یہ خط بیرنگ بھیجا" (۵)

(۱) اردوی: ۲۹۱ (۲) ایضاً: ۳۰۴ (۳) ایضاً: ۲۴۴ (۴) ایضاً: ۴، (۵) عود ہندی: ۳۳ -

مولوی عزیز الدین نے، جنون بریلوی کے خط ارسال کرنے کی اطلاع اور اُس کا جواب نہ لکھنے کی شکایت کی، تو اس کے جواب میں میرزا صاحب نے لکھا:

"خط از روی احتیاط بیرنگ بھیجا ہے۔ پوسٹ پڑ خط اکثر تلف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قاضی عبدالجلیل صاحب کا خط، جس کا آپ نے ذکر لکھا ہے، آنکھیں پھوٹ جائیں، اگر میں نے دیکھا ہو! آپ اون سے میرا سلام نیاز کہیے، اور خط کے نہ پہنچنے کی اونکو خبر پہنچا دیجے۔" (۱)

والئ بھرتپور کا انتقال ہوا اور یہ خبر دلی پہنچی، تو میرزا صاحب کو فکر ہوئی کہ کہیں جانی جی، جو میرزا تفتہ کے مربی تھے، معزول تو نہیں کر دیے گئے۔ اس خبر کے استفسار کیلیے تفتہ کو خط لکھا اور اُس میں ہدایت کی کہ

"واسطے خدا کے! نہ مختصر نہ سرسری، بلکہ مفصل اور منقح جو کچھ واقع ہوا ہوا، اور جو صورت ہو، مجھکو لکھو، اور جلد لکھو، کہ مجھپر خواب و خور حرام ہے۔ کل شام کو میں نے سنا۔ آج صبح قلعہ نہیں گیا، اور یہ خط لکھ کر از راہ احتیاط بیرنگ روانہ کیا ہے۔ تم بھی اس کا جواب بیرنگ روانہ کرنا۔ آدھ آنا ایسی بڑی چیز نہیں۔ ڈاک کے لوگ بیرنگ خط کو ضروری سمجھ کر جلد پہنچاتے ہیں، اور پوسٹ پڑ پڑا رہتا ہے جب اوس محلہ میں جانا ہوتا ہے، تو اوس کو بھی لیجاتے ہیں۔" (۲)

"دستنبو" کی طباعت کے متعلق ضروری ہدایتیں بیرنگ خط میں لکھ کر فرماتے ہیں:

"واسطے تاکید کے بیرنگ بھیجا گیا۔" (۳)

اسی طرح ذکا کو ایک ضروری خط بیرنگ لکھ کر از راہ معذرت فرماتے ہیں:

"بھائی! یہ خط از راہ احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں۔" (۴)

نواب فردوس مکاں کی خدمت میں ایک عریضہ، جو اُن کی والدۂ ماجدہ کی تعزیتِ وفات کے متعلق تھا، ارسال کیا ہے، اور اُس کا جواب نہ پاکر دوسرا عریضہ بیرنگ ارسال کرتے ہوے آخر میں از راہِ معذرت لکھتے ہیں:

(۱) اردو ے معلی: ۲۱۶ (۲) ایضاً: ۶۱ (۳) ایضاً: ۵۰ (۴) ایضاً: ۴۳۔

"پرسوں ایک قطعہ جناب بیگم صاحبہ وقبلہ کی تاریخ وفات کا بھیجا ہے۔ یقین ہے کہ پہنچے گا۔ ازراہ احتیاط یہ خط بیرنگ روانا کرتا ہوں۔" (۱)

میرزا صاحب پوسٹ پیڈ خط کے ضائع ہوجانے کے اس درجہ قائل تھے کہ جب اُنھیں کوئی خط نہ ملتا تو وہ اسے ڈاک خانے کی سہل انگاری پر محمول کرکے یہ لکھا کرتے تھے کہ ڈاک میں ضائع ہوگیا ہوگا، اور اگر کسی دوست سے جوابِ خط میں تاخیر ہوتی، یا اُن کے مرسلہ خط کا حوالہ نہ ہوتا تو باور کرلیتے کہ خط ڈاک میں تلف ہوگیا۔ ممکن ہے اُس وقت ڈاک کا محکمہ زیادہ منظم نہ ہوا ہو؛ ورنہ اس زمانے میں پوسٹ پیڈ خطوط ضائع ہوا کریں، تو کاروبارِ عالم مختل ہوجائے، اور بالخصوص تجارت پیشہ حضرات گورنمنٹ کے اس مفید ترین محکمے کے خلاف قانونی چارہ جوئیاں کرنے لگیں۔

میرزا صاحب کا پتا

اگرچہ باعتبارِ حسب ونسب میرزا صاحب دلی کے مشاہیر میں شمار کیے جاتے تھے۔ لیکن اُن کی وسیع ومسلسل مراسلت نے اس شہرت میں چار چاند لگادیے تھے۔ اُن کے پاس روزانہ ہندوستان اور بیرونِ ہند سے اردو، فارسی اور انگریزی خطوط آتے رہتے، جن میں سرکاری اور نجی ہر قسم کی تحریریں ہوتی تھیں۔ چونکہ اُن کو شہر میں ہر شخص جانتا تھا، اس لیے اُن کا خط دلی کے ڈاک خانے میں پہنچکر کبھی ضائع نہ ہوتا۔ اُن کی ڈاک خانے کی معروفیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پورے شہر دہلی میں وہ اپنے نام کے اعتبار سے یکہ وتنہا تھے، اور ڈاکیا "اسداللہ خاں غالب" کا سمی ایک ہی ذات کو جانتا تھا۔

میرزا صاحب کو اپنی اس شہرت ونامور کی کا اس درجے پاس تھا، کہ کوئی دوست یا شاگرد اُن کے مکان کا پتا دریافت کرتا، یا اُن کے نام کے خط پر لانیا چوڑا پتا لکھ دیتا، تو وہ اس کو اپنی توہین خیال کرتے۔ ایک بار علائی نے مکان کا پتا دریافت کیا۔ میرزا صاحب نے برہم ہوکر لکھا:

(۱) مکاتیب: ۱۴

"سنو صاحب! حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے کہ وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے، لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمھاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اوس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے، اور تم صاحب بھی جانتے ہو۔ مگر جب تک اوس سے قطع نظر نہ کرو، اور اوس منحرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلی میں رہتا ہوں۔ ہزار ہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی اور انگریزی، یہانتک کہ ولایت کے آتے ہوئے، صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو، اور اون خطوں کو تم دیکھ چکے ہو۔ اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمھارے نزدیک امیر نہیں تو سہی۔ اہلِ حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں، کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے، ہرکارہ میرا پتا نہ پائے۔ آپ صرف دہلی لکھ کر میرا نام لکھدیا کیجے۔ خط کے پہنچنے کا میں ضامن۔ (۱)

جنون بریلوی نے پتا معلوم نہ ہونے کی وجہ سے خط لکھنے میں تردد کا اظہار کیا۔ اُن کو لکھتے ہیں:

"قبلہ آپ کو خط کے بھیجنے میں تردد کیوں ہوتا ہے؟ ہر روز دو چار خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں، گاہ گاہ انگریزی بھی۔ اور ڈاک کے ہرکارے بھی میرا گھر جانتے ہیں۔ پوسٹ ماسٹر میرا آشنا ہے۔ مجکو جو دوست خط بھیجتا ہے، وہ صرف شہر کا نام اور میرا نام لکھتا ہے۔ محلہ بھی ضرور نہیں۔ آپ ہی انصاف کریں کہ آپ لال کنواں لکھتے رہے، اور مجکو بلی ماروں میں خط پہنچتا رہا۔ خلاصہ یہ کہ خط آپ کا کوئی تلف نہیں ہوا۔" (۲)

ذکا نے یکے بعد دیگرے دو نیاز نامے بھیجے، مگر میرزا صاحب کی طرف سے جواب نہ ملا۔ اُنھوں نے اس کو دلی کے ڈاک خانے کی غفلت پر محمول کر کے آخری خط بذریعہ

(۱) اردوی: ۴۱۸ (۲) ایضاً: ۲۰۷

رجسٹری ارسال کیا، اور اُس میں جواب نہ دینے کی شکایت لکھی۔ اس کے جواب میں میرزا صاحب الفاظ و مطالب کے گل کھلاتے ہیں:

"میرے مشفق! میرے شفیق مجھ سے ہیچ و پوچ کے ماننے والے! مجھ سے برے کو اچھا جاننے والے! میرے محب! میرے محبوب! تم کو میری خبر بھی ہے؟ آگے تا تو ہ تھا، اب نیم جان ہوں۔ آگے ہرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رامپور کے سفر کا رہ آورد ہے رعشہ و ضعف بصر۔ جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں حرف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکھتر برس جیا۔ بہت جیا۔ اب زندگی برسوں کی نہیں مہینوں کی اور دنوں کی ہے۔ پہلا خط تمہارا پہنچا۔ ... دوسرا خط مع غزل آیا... غزل بعد مشاہدہ تم کو بھیجی گئی، اور لکھا گیا کہ نوید حصول صحت جلد بھیجو۔ کل ایک خط رجسٹری دار آیا۔ گویا ستارۂ دنبالہ دار آیا۔ حیران کہ ماجرا کیا ہے؟ بارے کھولا اور دیکھا۔ خط نوید رفع مرض و حصول صحت سے خالی اور شکوہ ہائے بیجا سے لبریز۔

صاحب! میرے نام کا خط جہاں سے روانہ ہو وہیں رہ جائے تو رہ جائے ورنہ دلی کے ڈاک خانہ میں پہنچکر کیا مجال ہے جو مجھ تک نہ پہنچے؟ اسی طرح میرا خط یہاں کے ڈاک خانے سے نہ روانہ ہو کیا معنے؟ جہاں پہنچے، وہاں کے ڈاک کے کارپردازوں کو اختیار ہے، مکتوب الیہ کو دیں یا نہ دیں۔" (۱)

مرزا الفتہ کو ایک خط میں صاف طور پر لکھدیا ہے کہ نامور آدمی کے واسطے محلے کا پتا ضرور نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:

"بات یہ ہے کہ نامور آدمی کے واسطے محلہ کا پتا ضرور نہیں۔ میں غریب آدمی ہوں، مگر فارسی انگریزی جو خط میرے نام کے آتے ہیں، تلف نہیں ہوتے۔ بعض فارسی خط پر پتا محلہ کا نہیں ہوتا، اور انگریزی خط پر تو مطلق پتا ہوتا ہی نہیں، شہر کا نام ہوتا ہے۔ تین چار خط انگریزی ولایت سے مجھکو آئے۔ جانے اون کی بلا کہ بلیماروں کا محلہ کیا چیز ہے۔" (۲)

(۱) اردوی: ۳۷ (۲) ایضاً: ۸۷

تہر کو تحریر کیا ہے:

"اور یہ بھی آپ کو معلوم رہے، کہ میرے خط کے سرنامے پر محلہ کا نام لکھنا ضرور نہیں۔ شہر کا نام اور میرا نام۔ قصہ تمام۔" (۱)

ایک بار میرزا صاحب نے مکان تبدیل کیا۔ میرزا تفتہ کو تردد ہوا کہ یہ مکان کس محلے میں واقع ہے۔ اُن کے اس تردد کے رفع کرنے کے لیے ارشاد ہوا ہے:

"یہ مکان بہ نسبت اُس مکان کے بہشت ہے، اور یہ خوبی کہ محلہ وہی بلیماروں کا۔ اگرچہ ہے یوں کہ میں اگر اور محلہ میں بھی جا رہتا، تو قاصدان ڈاک وہیں پہنچتے یعنی اب اکثر خطوط لال کنوے کے پتے سے آتے ہیں، اور بے تکلف نہیں پہنچتے ہیں۔ بہرحال تم وہی "دلی، بلیماروں کا محلہ" لکھ کر خط بھیجا کرو۔" (۲)

تفتہ ہی کو دوبارہ لکھا تھا:

"میرے نام کا کوئی لفافہ ضائع نہیں جاتا۔ خدا جانے اوس پر کیا بجوگ پڑا؟" (۳)

سید احمد حسن مودودی کی شکایت پر تحریر کیا ہے:

"میرے نام کا لفافہ جس شہر سے چلے اوسی شہر کے ڈاک گھر میں رہ جائے تو رہ جائے، ورنہ دلی کے ڈاک میں پہنچکر کیا امکان ہے کہ تلف ہو؟" (۴)

ایک بار میرزا صاحب نے مجروح کے نام خط لکھا۔ ڈاکیے نے غلطی سے کسی دوسرے میر مہدی کو جا دیا۔ اُنھوں نے میرزا صاحب کو اس کی اطلاع دی۔ اس اطلاع پر ارشاد ہوتا ہے:

"وہ جو تم نے لکھا تھا کہ تیرا خط میرے نام کا میرے ہمنام کے ہاتھ جا پڑا۔ صاحب قصہ تمہارا ہے۔ کیوں ایسے شہر میں رہتے ہو، جہاں دوسرا میر مہدی بھی ہو۔ مجھ کو دیکھو کہ میں کب سے دلی میں رہتا ہوں۔ نہ کوئی اپنا ہمنام ہونے دیا، نہ کوئی اپنا (ہم) عرف بننے دیا، نہ اپنا ہم تخلص ہم پہنچایا۔" (۵)

ابتدائی مراسلت میں نواب فردوس مکاں کے قرابین جامع مسجد کے پتے سے جاتے تھے،

(۱) اردو: ۲۵۱ (۲) ایضاً: ۵۷ (۳) ایضاً: ۶۸ (۴) ایضاً: ۲۴۵ (۵) ایضاً: ۱۸۵۔

حالانکہ میرزا صاحب سات آٹھ برس سے بلیماروں کے محلے میں چلے آتے تھے۔ اس کے باوجود یہ فرامین میرزا صاحب کو ملتے رہے۔ جب خود انھیں نے سرکار کو لکھا کہ آیندہ اہلِ دفتر کو صحیح پتا لکھنے کی ہدایت کر دیجاے، تب دوسرا پتا لکھا گیا۔ میرزا صاحب فرماتے ہیں:

"دبیرانِ خاص پر عنوان نامہ ہای پیشین نشان کلبۂ این دروبش در ارش عقب مسجد جامع نبشتہ اند و من از ہفت ہشت سال در محلۂ بلیماری مانم۔ پس نشان این محلہ نگاشتہ شود؟ (۱)

(۱) مکاتیب: ۱۰

متعلقاتِ انشا

اس بحث کے آخر میں بعض ایسے حالات کا تذکرہ بھی ضروری ہے، جو بظاہر میرزا صاحب کے عادات و خصائل کی ایک کڑی معلوم ہوتے ہیں، لیکن اُن کی انشا کی کیفیت و کمیت کے اندازہ کے لیے اُن کا مطالعہ افادیت سے خالی نہیں، اور اس لیے اُنھیں متعلقاتِ انشا کے عنوان سے ذکر کیا جا سکتا ہے۔

جواب میں جلدی

خطوط کا جواب دینے میں میرزا صاحب بہت باضابطہ تھے۔ وہ یوں تو ہر خط کا جواب فوراً لکھتے، اور غیر اختیاری عذر کے علاوہ کسی اور عذر کے پیش کرنے کا کبھی موقع نہ آنے دیتے؛ لیکن ضروری اور جواب طلب خط کے جواب میں بجد جلد بازی سے کام لیتے تھے بسا اوقات ایسا ہوتا کہ یہ جانتے ہوئے کہ اب ڈاک کا وقت گزر چکا ہے جواب لکھ لیتے اور مکتوب الیہ کو بتا دیتے کہ اس مجبوری کے سبب آج خط سپردِ ڈاک نہ ہو سکا۔ مثلاً بیخبر کو تحریر کیا ہے:

"جناب عالی! آج دوشنبہ ۳ جنوری سنہ ۱۸۵۹ کی ہے۔ پہر دن چڑھا ہوگا.... غرہ دورد سند بیٹھا تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ تمہارا خط لایا... باآنکہ خط جواب طلب نہ تھا جواب لکھنے لگا۔" (۱)

شفق کو لکھا ہے:

"خداوندِ نعمت! آج دوشنبہ ۶ رمضان کی اور ۱۵ فروری کی ہے۔ اس وقت کہ بارہ پر تین بجے ہیں، عطوفت نامہ پہنچا۔ ادھر پڑھا ادھر جواب لکھا۔ ڈاک کا وقت نہ رہا خط کو معنون کر رکھتا ہوں۔ کل شنبہ ۱۶ فروری کو ڈاک میں بھجوا دوں گا۔" (۲)

(۱) اردوی: ۲۷۵ (۲) ایضاً: ۲۹۵

علائی کو لکھتے ہیں:

"آج یوم الخمیس ۱۹ جون المبارک بارہ پر تین بجے تمہارا خط آیا۔ ادھر پڑھا ادھر جواب لکھنے بیٹھا۔" (۱)

ایکبار مجروح کا خط صبح کی ڈاک سے موصول ہوا۔ میرزا صاحب نے اُس کا فوراً جواب لکھا اور اُس میں تحریر کیا:

"آج شنبہ ۱۵ اکتوبر صبح کا وقت، ابھی کھانا پکا بھی نہیں، تبریہ پکر بیٹھا تھا، کہ تمہارا خط آیا اور پڑھا اور یہ جواب لکھا۔" (۲)

اُنھیں کو لکھتے ہیں:

"اس وقت تمہارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔ مجھکو باتیں کرنے کا مزا ملا، تو دونوں کا جواب ابھی لکھ کر روانا کیا۔ اب میں روٹی کھانے جاتا ہوں۔" (۳)

میرزا تفتہ کو تحریر کیا ہے:

"آج سنیچر بار کو دوپہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا، اور تمہارا خط لایا۔ میں نے پڑھا، اور جواب لکھا، اور کلیان کو دیا۔ وہ ڈاک کو لے گیا۔ خدا چاہے تو کل پہنچ جائے۔" (۴)

معلوم ہوتا ہے کہ دسمبر سنہ ۱۸۵۰ء تک ڈاک کا ہرکارہ تقسیم وجمع خطوط دونوں کام کیا کرتا تھا کیونکہ ایکبار تفتہ کا خط آیا۔ میرزا صاحب نے اُس کا جواب لکھ کر اُسی وقت ہرکارے کو دیا اور آخر میں لکھا:

"اس وقت تمہارا خط پہنچا، اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارہ کو دیا۔" (۵)

عذر تاخیر

چونکہ میرزا صاحب خطوط کا جواب باقاعدگی سے دیا کرتے تھے، اس لیے اگر اُن کا کوئی دوست اپنے نیاز نامے کا جواب نہ پانے کی شکایت لکھتا، اور فی الحقیقت کسی وجہ سے جواب میں تاخیر ہو جاتی، تو میرزا صاحب فوراً عذرِ تاخیر لکھ دیتے۔ لیکن اگر شکایت بے وجہ ہوتی، تو اپنے اوپر کبھی ذمہ داری نہ لیتے اور صاف انکار کر دیتے۔ ایک بار

(۱) اردو ئے: ۴۱۲ (۲) ایضاً: ۱۸۰ (۳) ایضاً: ۱۹۳ (۴) ایضاً: ۸۰ (۵) ایضاً: ۸۰

میر احمد حسن مودودی نے شکایت کی کہ آپ نے میرے کئی خطوں کا جواب نہیں بھیجا۔ اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

"آپ کے کسی خط کا جواب میرے ذمہ باقی نہیں ہے۔ دو یا تین جس خط کا جواب نہیں پہنچا اوس کو یہ سمجھیے کہ وہ خط راہ میں تلف ہوے، اور میرے پاس نہیں پہنچے"(۱)

ایک بار اپنی عادت کے خلاف مہر کے خط کا جواب دوسرے دن لکھا، تو ساتھ ہی ساتھ تاخیر کی تلخی کو ظرافت کی چاشنی سے بدلنے کی بھی کوشش کی۔ فرماتے ہیں:

"بندہ پرور! آپ کا خط کل پہنچا۔ آج جواب لکھتا ہوں۔ واہ دنیا کتنا شتاب لکھتا ہوں؟" (۲)

اسی طرح مجروح کے خط کے جواب کو کئی دن کی دیر ہو گئی تو انھیں لکھا:

"واہ واہ سید صاحب! تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے۔ نثر میں خود نمائیاں کرنے لگے۔ کئی دن سے تمہارے خط کے جواب کی فکر میں ہوں، مگر جاڑے نے بے حس و حرکت کر دیا ہے۔ آج جو بسبب ابر کے وہ سردی نہیں، تو میں نے خط لکھنے کا قصد کیا ہے۔" (۳)

ایک بار مہر کو خط لکھا، اور بکس میں رکھ لیا۔ کئی دن کے بعد بکس کھولا تو خط برآمد ہوا اس کے متعلق انھیں تحریر فرماتے ہیں:

"مرا بادہ دلہای من توان بخشید خطا نمودہ ام و چشم آفرین دارم

کل دوشنبہ کا دن، ۲۰ ستمبر کی تھی۔ صبح کو میں نے آپ کو شکایت نامہ لکھا، اور بزنگ ڈاک میں بھیجدیا۔ دوپہر کو ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ تمہارا خط اور ایک مرزا تفتہ کا خط لایا۔ معلوم ہوا کہ جس خط کا جواب میں آپ سے مانگتا ہوں، وہ نہیں پہنچا۔ کچھ شکوہ سے شرمندگی اور کچھ خط کے نہ پہنچنے سے حیرت ہوئی۔ دوپہر ڈھلے مرزا تفتہ کے خط کا جواب لکھ کر ٹکٹ نکالنے لگا۔ بکس میں سے وہ تمہارے نام کا خط نکل آیا۔ اب میں سمجھا کہ خط لکھ کر بھول گیا ہوں۔ اور ڈاک میں نہیں بھیجا۔

(۱) اردوی: ۳۴۰ (۲) ایضاً: ۲۶۸ (۳) ایضاً: ۱۷۴

اپنے نسیان کو لعنت کی اور چپ ہو رہا۔ متوقع ہوں کہ میرا قصور معاف ہو۔" (۱)

ایک مرتبہ میرزا صاحب نے تفتہ کو خط لکھا۔ اُن کی طرف سے جواب نہ ملا، بلکہ خط آیا تو اُلٹی خط نہ بھیجنے کی شکایت درج تھی۔ میرزا صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں:

"آج چہارشنبہ کے دن ۱۰ نومبر کو تمہارا خط آیا، اور میں آج ہی جواب لکھتا ہوں۔ کیا تماشا ہے کہ تمہارا خط پہنچتا ہے، اور میرا خط نہیں پہنچتا۔" (۲)

لیٹے لیٹے لکھتے

میرزا صاحب کی وضعِ خطوط نویسی اس درجہ پختہ ہو چکی تھی، کہ شدتِ مرض اور زیادتیٔ ضعف کے باعث نشست و برخاست کی قوت نہ ہونے کی حالت میں بھی جوابِ خط سے دوستوں کو محروم رکھنا گوارا نہ کرتے، اور لیٹے لیٹے جواب لکھتے تھے۔ ایکبار فروری سنہ ۱۸۵۴ء میں تپ و لرزہ کا شدید دورہ ہوا۔ ابھی مرض کی شدت باقی تھی کہ میرزا تفتہ کا خط آگیا۔ میرزا صاحب نے اُسی حالتِ ضعف میں جواب دیا، اور اُس میں لکھا:

"میں چار دن سے لرزے میں مبتلا ہوں ... اتنی سطریں مجھ سے ہزار جانکاہی لکھی گئی ہیں۔" (۳)

صاحبِ عالم صاحب مارہروی کو بحالتِ بیماری لکھا ہے:

"جو کچھ لکھنا ہوتا ہے وہ بھی اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔" (۴)

اسی طرح ایک مرتبہ بیخبر کا خط آیا، تو میرزا صاحب کو اُٹھنا بیٹھنا دشوار تھا۔ اُسی حالت میں جواب لکھ کر آخر میں فرمایا:

"بارہ پرد بیجے ہرکارہ نے آپ کا خط دیا۔ پلنگ پر پڑے پڑے خط پڑھا، اور اُسی طرح جواب لکھا۔" (۵)

سنہ ۱۸۶۲ء میں تقریباً سارا جسم زخموں سے بھرا ہوا تھا، اور بالخصوص سیدھے ہاتھ کے پھوڑے کی تکلیف سے روح تحلیل ہوئی جاتی تھی؛ لیکن اس حالت میں بھی

(۱) اردوی: ۲۵۵ (۲) ایضاً: ۵۰ (۳) ایضاً: ۷۸ (۴) ایضاً: ۲۷۳ (۵) عود: ۱۷۴

خطوں کے جوابات برابر بھیجتے رہے۔ سرور کو لکھتے ہیں:

"اشعار کی اصلاح یک قلم موقوف۔ خطوط ضروری لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ دو خط چودھری صاحب کے آئے، اور ایک خط شاہ عالم صاحب کا اور دو خط حضرت صاحب کے آئے۔ جواب نہ لکھ سکا۔ آج اپنے کو ملنے دیکر مرد بنایا، جب یہ عبارت لکھی۔" (۱)

اُنھیں کے ایک خط میں اشعار کے حسن و قبح کا معیار بتاتے ہوئے آتش و ناسخ کا ذکر کرتے ہیں۔ استشہاد میں اُن کا کوئی شعر یاد نہیں آتا، تو کہتے ہیں:

"یاد کیا آوے۔ لیٹا ہوا ہوں۔ دو مبدم پانو کے ورم کی ٹیس ہوش اوڑائے دیتی ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون!" (۲)

اسی زمانے میں مرزا تفتہ کو لکھا ہے:

"میں ناتوان بہت ہوگیا ہوں۔ گویا صاحب فراش ہوں۔ کوئی شخص بیا تکلف کی ملاقات کا آجائے تو اوٹھ بیٹھتا ہوں ورنہ پڑا رہتا ہوں لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں۔" (۳)

ضعف کے سبب مراسلت میں کمی

جب بوجہ پیرانہ سالی میرزا صاحب کا ضعف روز افزوں ہونے لگا، تو مجبوراً مراسلت میں کمی کرنی پڑی۔ تاہم اس حالت میں یہ کبھی نہ ہوا کہ کسی جواب طلب خط کا جواب نہ دیا ہو۔ ہاتھ میں رعشہ اور بینائی میں نقصان آجانے کے بعد اخبارات میں اپنی اس حالت کا اعلان کرکے اربابِ ادب سے التجا کی تھی کہ آیندہ جوابِ خط اور اصلاحِ اشعار سے معاف رکھے جائیں۔ اسپر بھی برابر خطوط چلے آتے تھے، اور میرزا صاحب کسی بے تکلف دوست کے منتظر رہتے۔ جب ایسا دوست آجاتا، اُس سے جواب لکھا دیتے۔ ایک بار رضوان نے کوتاہ قلمی کی شکایت کی۔ اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

"مرزا رسم تحریر خطوط بسبب ضعف ترک ہوتی جاتی ہے۔ تحریر کا تار ک نہیں ہوں،

(۱) اردوی: ۱۵۱ (۲) ایضاً: ۱۵۰ (۳) ایضاً: ۹۴

بلکہ متروک ہوں اگر شمار بے خط کا جواب نہ لکھوں، تو محل ترحم ہے نہ مقام شکایت" (۱)

اپریل سنہ ۱۸۶۶ء میں سید احمد حسن مودودی کو لکھتے ہیں:

"پیر و مرشد! آپ کو میرے حال کی بھی خبر ہے۔ ضعف نہایت کو پہنچ گیا۔ رعشہ پیدا ہو گیا۔ بینائی میں بڑا فتور پڑا۔ حواس مختل ہو گئے۔ جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجا لایا۔ اوراق اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا، اور اصلاح دیتا تھا۔ اب نہ آنکھ سے اچھی طرح سوجھے، نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ شرف بو علی قلندر کو لسیب کبر سنی کے خدا نے فرض اور پیمبر نے سنت معاف کر دی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمت اصلاح اشعار مجھ پر معاف کر دیں۔ خطوط شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو سکے گا لکھ دیا کروں گا۔ زیادہ حد ادب!" (۲)

ذکا نے کیفیتِ مزاج دریافت کی، تو سپرد افشانی فرماتے ہیں:

"تم میری بات پوچھتے ہو، مگر میں کیا لکھوں؟ ہاتھ میں رعشہ، انگلیاں لکھنے میں نہیں، ایک آنکھ کی بینائی زائل۔ جب کوئی دوست آجاتا ہے، تو اس سے خطوط کا جواب لکھوا دیتا ہوں۔" (۳)

جون سنہ ۱۸۶۷ء میں سیاح کو اپنی حالت لکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

"میرا حال اسی سے جانو کہ اب میں خط نہیں لکھ سکتا۔ آگے لیٹے لیٹے لکھتا تھا۔ اب رعشہ و ضعف بصارت کے سبب سے وہ بھی نہیں ہو سکتا۔" (۴)

اُنھیں کو اگست سنہ ۶۷ء میں لکھا ہے:

"آگے میں لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا۔ اب وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ بات میں رعشہ، آنکھوں میں ضعف بصر۔ کوئی تعہدی میرا نوکر نہیں۔ دوست آشنا کوئی آجاتا ہے، تو اس سے جواب لکھوا لیتا ہوں۔ بھائی! میں تو اب کوئی دن کا مہمان ہوں، اور اخبار والے میرا حال کیا جانیں؟ ہاں اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار والے

(۱) اردو ی: ۳۲۱ (۲) ایضاً: ۳۲۳ (۳) ایضاً: ۴۰ (۴) ایضاً: ۳۳

کہ یہ یہاں کے رہنے والے ہیں، اور مجھ سے ملتے رہتے ہیں۔ سو اون کے اخبار میں میں نے اپنا حال مفصل چھپوا دیا ہے۔ اور اوس میں میں نے عذر چاہا خطوں کے جواب سے اور اشعار کی اصلاح سے۔ اوس پر کسی نے عمل نہ کیا۔ ابتک ہر طرف سے خطوں کے جواب کا تقاضا اور اشعار اصلاحوں کے چلے آتے ہیں، اور میں شرمندہ ہوتا ہوں۔ بوڑھا، اپاہج، پورا بہرا، آدھا اندھا۔ دن رات پڑا رہتا ہوں۔" (۱)

نواب میر غلام بابا خاں بہادر نے کبھی کبھی اطلاع خیریت کی خواہش کی تھی۔ اُنھیں ۶ اپریل سنہ ۱۸۶۸ء کو لکھتے ہیں:

"آپ جو فرماتے ہیں کہ تو اپنی خیر و عافیت کبھی کبھی لکھا کر۔ آگے اتنی طاقت باقی تھی کہ لیٹے لیٹے کچھ لکھتا تھا۔ اب وہ طاقت بھی زائل ہو گئی۔ ہاتھ میں رعشہ چلا گیا۔ بینائی ضعیف ہو گئی۔ متصدی نوکر رکھنے کا مقدور نہیں۔ عزیزوں اور دوستوں میں سے کوئی صاحب وقت پر آ گئے، تو میں مطلب کہتا گیا وہ لکھتے گئے۔" (۲)

سید احمد حسن مودودی کو کسی دوست نے اطلاع دی کہ اب میرزا صاحب کو افاقہ ہے۔ اُنھوں نے میرزا صاحب سے اس کی تصدیق چاہی۔ اسپر تحریر فرماتے ہیں:

"وہ جو آپ نے سنا ہے کہ اب غالب کو مرض سے افاقت ہے، سو محض غلط ہے مگے ناتوان تھا، اب بیجان ہوں خط نہیں لکھ سکتا۔ ایک لڑکے سے یہ چند سطریں لکھوا دی ہیں۔ جو میں کہتا گیا ہوں، وہ غریب لکھتا گیا ہے۔" (۳)

اپنی اس مجبوری کے زمانے میں میرزا صاحب دوستوں اور شاگردوں کے خطوط کی طرح اعزہ کے خطوط کا جواب بھی بمشکل دیا کرتے تھے۔ عارف کے بڑے بیٹے باقر علی خاں کامل، جنھیں بیٹوں کی طرح پالا تھا، روزگار کی تلاش میں الور گئے اور دلی میں بیوی اور ایک بچی چھوڑ گئے۔ میرزا صاحب سے امید تھی کہ اپنی اور بہو اور پوتی کی خیریت سے جلد جلد مطلع کرتے رہیں گے۔ لیکن میرزا صاحب اُن کو بھی تاخیر سے

(۱) اردوی: ۲۰ (۲) ایضاً: ۸ (۳) ایضاً: ۶۷

جواب دیتے تھے۔ ایک بار انھوں نے شکایت کی۔ میرزا صاحب نے جواب میں تحریر فرمایا:

"مجھ سے جو تم گلہ کرتے ہو خط کے نہ بھیجنے کا۔ بھائی! اب میری انگلیاں نکمی ہو گئی ہیں، اور بصارت میں بھی ضعف آگیا ہے۔ دو سطریں نہیں لکھ سکتا۔ اطراف و جوانب کے خط آتے ہوئے دھرے رہتے ہیں۔ جب کوئی دوست آجاتا ہے، میں اوس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ پرسوں کا تمہارا خط آیا ہوا دھرا تھا۔ اب اس وقت مرزا یوسف علی خاں آ گئے۔ میں نے اون سے یہ خط لکھوا دیا۔" (۱)

(۱) اردوی: ۳۴۹

املای غالب

میرزا صاحب کی نوشتہ تحریروں اور شعری اصلاحوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں صحتِ املا کا بڑا خیال رہتا تھا۔ ایک بار تفتہ نے "چشمہ" کو "چشمۂ" لکھ دیا تھا۔ اس معمولی سہوِ کتابت پر تنبیہ کرتے ہوئے انھیں لکھتے ہیں:

"اتنے بڑے مشاق سے ایسی غلطی! بہت تعجب کی بات ہے۔" (۱)

جنون بریلوی نے فارسی کے ماضی قریب کے صیغۂ واحد حاضر کو "ی" کے ساتھ لکھا تھا۔ آج کل اہلِ ایران اسی طرح لکھتے ہیں، مگر اُس زمانے میں ایسا دستور نہ تھا۔ اس کی اصلاح میں ارشاد فرمایا ہے:

"بردۂ، رفتۂ، یہ جتنے الفاظ ہیں ان میں یای تحتانی نہیں لکھتے۔ بس وہی ہای ابنای حرکت رہتی ہے۔ پس اگر وہ ساکن ہے، تو تو رفتہ، بردہ اس صورت پر رہے گی، اور اگر اوس کو حرکت لازم آئے، تو علامت حرکت ہمزہ لکھ دیا جائیگا رفتۂ، آمدۂ اور ان مفعول کے سب صیغوں کا یہی حال ہے۔" (۲)

شیونرائن کو تحریر کیا ہے:

"چونکہ تم کو مشاہدۂ اخبار اطراف اور خود اپنے مطبع کے اخبار کی عبارت کا شغل رہتا ہے، بہ تقلید اور انتشار دازوں کے تمہاری عبارت میں بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ میں تم کو آگاہ کرتا رہتا ہوں۔ خدا چاہے تو املا کی غلطی کا ملکہ زائل ہو جائے۔" (۳)

بیتاب رامپوری نے "طیور" لکھا تھا۔ اس پر فرماتے ہیں:

"یہ لفظ "طوی" سے نہیں "تے" سے ہے۔ اور پھر تیور بروزنِ تنبور نہیں۔ دراصل تر بروزنِ سیہ دُر ہے۔" (۴)

(۱) خطوط: ۱، ۱۸۱ (۲) ایضاً: ۱۱۹ (۳) اردو ی: ۱، ۴۵۸ (۴) مکاتیب: ۱۰۴

نواب ناظم اور بیتاب کے اصلاحی مسودوں میں خطی اصلاحیں خاصی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ ان اصلاحوں نیز دوسرے شاگردوں کی املائی تصحیح سے میرزا صاحب کی روشِ خاص کا تعین آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ جو حسبِ ذیل ہے:۔

(۱) وہ اپنے عہد کی طرزِ کتابت کے مطابق یائے معروف و مجہول کے لکھنے میں بول چال سے زیادہ خطی خوشنمائی اور کاغذ پر باقی ماندہ جگہ کا لحاظ کرتے تھے۔ معروف کی جگہ مجہول اور مجہول کی جگہ معروف "ی" کا استعمال اُن کے یہاں اتنا عام ہے کہ بعض اوقات پڑھنے میں دقت اور تذکیر و تانیث کے متعین کرنے میں دشواری پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) اُن کی تحریروں میں آپ ہائے مخلوط کو دو چشمی "ھ" کی جگہ ہائے سادہ کا شکل پائیں گے۔ اُس زمانے کے کاتبوں کا دستور تھا کہ مخلوط "ھ" کو دو سادہ "ہاؤں" سے ظاہر کرتے تھے، جیسے آنکھ، ہاتھ، کلمہ وغیرہ۔ میرزا صاحب اس کے بھی خلاف ہیں۔ اُنھوں نے اس قسم کے تمام لفظوں کو ایک ہی سادہ "ہ" سے لکھا ہے۔ اور بیتاب یا ناظم کے مسودوں میں اس کے خلاف جس قدر غلط پائے ہیں، اُنھیں درست کیا ہے۔ البتہ انتخابِ اردو میں سات کو سات ہ اپنے قلم سے بنایا ہے۔

(۳) اُن کے زمانے تک ترکی رسم الخط کی دیکھا دیکھی اردو خط میں بھی اعراب بالحروف کا طریقہ ایک حد تک مروج تھا۔ مگر میرزا صاحب اسے ناپسند کرتے تھے۔ اُنھوں نے زبر کو الف سے اور زیر کو "ی" سے ظاہر نہیں کیا۔ بیتاب نے "مہر دمہ" کو "مہر دماہ" اور "اسی" کو "ایسی" لکھ دیا تھا، تو اُنھوں نے اس کتابت کو غلط قرار دیا، اور "مہر دمہ" بحذفِ الف، اور اسے بحذفِ یا اپنے قلم سے لکھ دیا۔

"مینہ" کا املا بھی بحذفِ "ی" پسند کرتے تھے۔ خود اُن کی اپنی تحریروں میں "مینہ" موجود ہے (۱) لیکن نواب فردوس مکاں کے اس شعر میں

آکر ترے کوچے میں یہ کچھ ہم سے بن آئی جاتے ہوئے اک مینہ تھا کہ برسا گئیں آنکھیں

"مینہ" کو "مِنہ" بنایا ہے۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ وہ "مِنہ" کو بہتر املا جانتے تھے۔ اور

(۱) مکاتیب: ۴۰، ۴۹۔

اسی املا کو شاگردوں میں رائج کرنا پسند کرتے تھے۔ لہٰذا اُن کے اپنے خطوں میں "مینہ" کا وجود سہو یا عادتِ جاریہ تسلیم کیا جائے گا۔

اسی طرح پیش کو واو سے ظاہر کرنا بھی ناپسند تھا۔ عام طور پر "پہنچنا" اور اُس کے مشتقات میں لوگ "و" لکھا کرتے ہیں۔ میرزا صاحب کے خود نوشتہ خطوں میں بارہا یہ آتا ہے، مگر کہیں بھی اسے "پہونچنا" نہیں لکھا گیا ہے۔ انتخابِ دیوانِ اردو میں کاتب نے واو سے لکھدیا تھا۔ اسے میرزا صاحب نے درست کیا ہے (۱) ناظم اور بیتاب کے مسودوں میں بھی بارہا یہ لفظ اور اس کے مشتقات استعمال ہوئے ہیں، کاتبوں نے انھیں حسبِ دستورِ زمانہ واو کے ساتھ لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے بغیر استثنا کے ہر مقام پر اصلاح کی ہے۔

ناظم کا ایک شعر ہے:

واں کے جانے سے رُکے اور آگئی فصلِ بہار لو مبارک، جمع پھر وحشت کے ساماں ہوگئے

کاتب نے اس میں "رو کے" لکھا تھا، میرزا صاحب نے "و" قلمزد کر دیا۔

ایک شعر میں "دوکاں" لکھا تھا۔ اس کا واو بھی کاٹ دیا گیا۔ بیتاب کے اس شعر میں:

پھکا جاتا ہے دل سینے میں، اللہ چھپاؤں کب تلک سوزِ نہاں کو

کاتب نے "پھوکا جاتا ہے" لکھدیا تھا۔ اس میں سے بھی میرزا صاحب نے واو نکالدیا ہے۔

خود میرزا صاحب کے انتخابِ دیوانِ اردو میں کاتب نے لکھا تھا:

کھوتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

اسے میرزا صاحب نے "کھلتا" بنایا ہے۔ (۲)

"خور اور خورشید" کا عام املا بواو ہے۔ میرزا صاحب خورشید کو غلط نہیں جانتے تھے، لیکن ترجیح دیتے تھے خُرشید بے واو کو۔ البتہ "خُر" کو بغیر واو کے لکھنا غلط خیال کرتے تھے۔ اس کی توجیہ انھوں نے یہ پیش کی ہے کہ پارسیِ قدیم میں "خُر" بضم اخا نورِ ظاہر کو کہتے ہیں۔ "خید" بکسرِ خا میں کے معنی روشنی ہیں۔ ایرانی آفتاب کو بعد از خدا بزرگ جانتے تھے۔

(۱) انتخاب غالب اردو، قلمی: ۳۹ (۲) ایضاً: ۳۲

اس لیے اُنھوں نے سورج کو خُرّاور خُرشید کہا۔ جب عرب و عجم مل گئے، اکابر عرب نے واسطے دفع التباس کے "خُر" میں واوِ معدولہ بڑھا کر "خور" لکھنا شروع کیا۔

اس سے بھی یہی مترشح ہے کہ میرزا صاحب پیش کو واو سے ظاہر کرنا پسند کرتے تھے۔ خُور میں صرف اس لیے اسکو جائز رکھا کہ بے واو لکھنے کی صورت میں خر سے التباس پیدا ہو جانے کا ڈر تھا۔(۱)

لیکن خشنود اور خُرّم کو خوشنود اور خورّم لکھدیا ہے، حالانکہ ان کا متفقہ املا بے واو کے ہے۔ ان میں سے "خوشنود" ۲۲ مارچ سنہ ۱۸۶۵ء کے فارسی خط میں اور "خورّم" ۳ نومبر سنہ ۱۸۶۷ء کے خط کے ساتھ مرسلہ اردو قطعے میں پایا جاتا ہے۔ یہ دونوں خط ایسے زمانے اور حالات میں تحریر کیے گئے ہیں کہ ہم میرزا صاحب کے حواس سے اس سے زیادہ کوتاہی کو بھی بعید نہیں سمجھتے، اس بنا پر یہاں "و" کے اضافے کو سہوِ قلم شمار کرنا چاہیے۔

"مُنھ" کا پُرانا املا "مونہ یا مونہہ" ہے۔ نواب ناظم کے مسودوں میں متعدد جگہ لفظ آیا ہے، اور ہر جگہ اسے کاتب نے "مونہہ" لکھا ہے۔ میرزا صاحب نے ایک جگہ کو مستثنیٰ کرکے "مُنہ" (مُنھ) بنا دیا ہے۔ اور چونکہ حذفِ واو بیہم ثابت ہے، اس لیے ایک جگہ واو کا لکھدینا سہوِ قلم قرار پائے گا۔

(۴) میرزا صاحب اسے بھی غلط شمار کرتے تھے کہ فارسی اور ہندی لفظوں کے املا میں

(۱) رضا قلی ہدایت نے بھی میرزا صاحب کی اس توجیہ کو قبول کر لیا ہے۔ فرہنگ انجمن آرای ناصری (لفظ خر) میں لکھتا ہے: "با ضم آفتاب۔ و متاخرین برای آن کہ کلمۂ خوشنود و بواو نویسند۔ لیکن در زبان قدیم بے واو بودہ" مگر ڈاکٹر صدیقی صاحب فرماتے ہیں کہ "انھوں نے جانے اس مسلک کی جو توجیہ کی ہے، وہ درست نہیں۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ قدیم فارسی میں "خور" کی خ کو پیش تھا حقیقت یہ ہے کہ ایران کی پرانی زبان میں بعض لفظوں کا پہلا حرف ساکن ہوتا تھا۔ چنانچہ خور اور خود وغیرہ کی "خ" ساکن تھی اور "و" مفتوح، یعنی "خ و" آپس میں مل کر ایک دہری آواز پیدا کرتے تھے۔ آگے چل کر جب ابتدا بالسکون فارسی زبان میں ترک ہو گئی، تو "و" کی تبدیل ہو کر تلفظ میں ایک ضمہ باقی رہ گیا۔ کتابت میں ابتک وہ معدولہ "و" برقرار ہے۔

یہ بھی صحیح نہیں کہ عربوں نے واسطے دفع التباس کے واو معدولہ بڑھا کے خور لکھنا شروع کیا۔ عرب کی زبان میں نہ خور کو دخل ہوا نہ خورشید کو، اور نہ خُر اُن کی زبان میں دخیل تھا۔ پھر اُن کو التباس کے دور کرنے کی فکر کیوں ہونے لگی۔" (مقدمۂ خطوط: صفحہ ز)

عربی کے مخصوص حروف، ث، ح، ص، ض، ط، ظ، ع، استعمال کیے جائیں۔ ایک صاحب کو لکھتے ہیں:

"عین کا حرف فارسی میں نہیں آتا۔ جس لغت میں عین ہو، اوس کو سمجھنا کہ عربی ہے ... جس طرح عین فارسی میں نہیں ہے، طوی بھی نہیں ہے، مثلاً نشت لغت فارسی الاصل ہے۔ املا اس کی طوی سے غلط ہے۔" (۱)

بیتاب نے "طمانچہ" اور "طیور" لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے طمانچہ کو "تپانچہ" بنا دیا، اور طیور کے بارے میں یہ لکھا کہ:

"یہ لفظ طوی سے نہیں، تے سے ہے۔ اور پھر یہ بوزن تنور نہیں۔ دراصل تیر بوزنِ سہ دُر ہے۔" (۲)

میرزا صاحب "ذ" کو بھی عربی کے مخصوص حرفوں میں شمار کرتے تھے اور کبھی کسی فارسی لفظ میں "ذ" نہیں لکھتے تھے۔ بیتاب کے مسودے میں خذف تھا۔ اُسے "خزف" بنا کر لکھا ہے:

"خزف بمعنی ٹھیکری کے لغت فارسی اور املا اس کی زے سے ہے۔" (۳)

گذشتن، پذیرفتن وغیرہ فارسی مصادر کے تمام مشتقات، نیز اسامی جامد میں جہاں کہیں بھی کاتب "ذ" لکھتے ہیں، میرزا صاحب نے "ز" استعمال کی ہے۔ ناظم نے "سرگذشت" لکھدیا تھا، تو اُسے "سرگزشت" بنایا ہے۔ ڈاکٹر صدیقی صاحب فرماتے ہیں:

"گذشتن، گذاشتن، پذیرفتن، یہ سب لفظ ذال سے ہیں۔ البتہ "گزاردن" زے سے صحیح ہے۔ میرزا غالب نے پہلے نادانی سے، پھر سخن پروری اور سینہ زوری سے "ذ" کو فارسی سے خارج کرنے کی کوشش کی۔ اردو میں یہ لفظ "ز" سے لکھیے، تو مضائقہ نہیں، مگر فارسی میں "ذ" لکھنا ضروری ہے۔" (۴)

اس قاعدے کی اُنھوں نے بڑی سختی سے پابندی کی ہے۔ وہ اُن عربی لفظوں میں بھی عربی کے مخصوص حرف نہیں لکھتے، جو اپنے معنی کی بنا پر ہندی یا ہندی بن گئے

(۱) مقدمۂ خطوط: و ازاردو ئے معلی: ۲۰۲/۲ (۲) مکاتیب: ۱۰۴ (۳) ایضاً: ۱۰۵ (۴) حاشیۂ دستور الفصاحت، ص ۱۰۔ قلمی۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ تحریر لکھکر حضرت عرشی کو بھیجی ہے۔

ہیں، جیسے طیّار اور ذرا۔ طیّار کے بارے میں ایک صاحب کو لکھا ہے:

"طیّار... لغت عربی، اصلاً اس کی طا حطی ہے... بازداروں میں اس لفظ نے جنم لیا، حقیقت بدل گئی۔ طوی، تے بن گئی۔ یعنی، جب کوئی شکاری جانور شکار کرنے لگا، بازداروں نے بادشاہ سے عرض کی کہ "فلاں باز" فلاں شکرہ طیّار شدہ است و صیدی گیرد"۔ بہرحال اب تاری قرشت سے یہ لفظ نیا نکل آیا۔ اس لفظ کو مستحدث اور در اصل اردو اور بنای قرشت یعنی آمادہ، اشخاص اور اشیا پر عام تصور کرنا چاہیے۔" (۱)

"ذرا" اصلاً عربی ہے اور اس کا اصل ذرّہ ہے۔ پہلے اردو محاورے میں تشدید بولا جاتا تھا۔ شاہِ عالم بادشاہِ دہلی آفتاب تخلص کا مقطع ہے:

اے آفتاب دل کو ذرّہ نہ چین تجھ بن؟ اس رشکِ مہ کو جلدی مجھ سے کوئی ملا دے

دوسرے مقطع میں بھی اسی طرح باندھا ہے:

یک ذرّہ تسلّی نہ ہو خورشیدِ جہاں کو اک بوسہ بھی جب تک اسے انعام نہ ہوگا

اگرچہ اب تہامند دہنیں بولتے، لیکن کسی ایسے لفظ کے ساتھ آئے، جو وزن یا ناپ کو ظاہر کرتا ہو، تو ذرّہ ہی تلفظ کرتے ہیں، جیسے "اُسے میری ذرّہ بھر پروا نہیں ہے"۔ ظاہر ہے کہ یہ تشدید وہیں باقی رہ گئی ہے، جہاں حقیقی معنے مراد ہیں۔ پس اس لفظ کو موجودہ معنی کے لحاظ سے اردو اور مستحدث کہا جائے گا۔ اور جب یہ اردو کا لفظ ہوا، تو اس میں "ذ" کی جگہ "ز" کا استعمال چاہیے۔ میرزا صاحب اسی کے قائل تھے اور ۱۲ نومبر سنہ ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں انھوں نے "زرّا" ہی لکھا ہے۔ (۲)

(۵) جن فارسی الفاظ کے آخر میں الف یا واو کے بعد "ی" آتی ہے، خواہ اصلی ہو یا اضافت وصفت کی علامت، عام کاتب اُس "ی" پر ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔ میرزا صاحب اسے عقل کو گالی دینا جانتے تھے۔ تفتہ کے خط میں صراحت فرماتے ہیں:

"دیکھو، پھر تم دنگا کرتے ہو؟... غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے۔ یاد رکھو،

(۱) خطوط ۱/ ۱۸۳ (۲) اردوی: ۲۳۰

یای تحتانی تین طرح پر ہے:

(۱) جزوِ کلمہ،

ہای بر سرِ مرغان ازان شرف دارد
ای میرنامہ نام تو، عقلِ گرہ کشای را

یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یای تحتانی ہے جزوِ کلمہ ہے۔ اس پر ہمزہ لکھنا گویا عقل کو گالی دینا ہے۔

(۲) دوسری تحتانی مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے۔ ہمزہ وہاں بھی مخل ہے، جیسے آسیای چرخ یا آشنای قدیم۔

توصیفی، اضافی، بیانی کسی طرح کا کسرہ ہو، ہمزہ نہیں چاہتا۔ فدای تو شوم رہنای تو شوم، یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

(۳) تیسری دو طرح پر ہے،

یای مصدری، اور وہ معروف ہوگی، مثلاً مصدری، آشنائی۔ یہاں ہمزہ ضرور بلکہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور۔

توحیدی، آشنائے، یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے، دانا نہ کہاؤ گے۔" (۱)

اسی اصول کے ماتحت نواب فردوس مکاں کے مسودوں میں ایک جگہ "موئی سر" اور دوسری جگہ "رائی" کی ہمزہ کو قلمزد کر دیا ہے۔

مگر جہاں کہیں آخرِ کلمہ کی "ی" سے قبل الف یا واوِ مدہ نہیں ہے، میرزا صاحب نے ہمزہ لکھا ہے۔ نیز تہنیتِ غسلِ صحت میں "خجستگی فرخندگیٔ چند" اور خلد آشیاں کے مدحیہ قصیدے میں "گلیم غیبیٔ من" (۳) اُن کے اپنے ہاتھ کا املا ہے۔ ان مواقع پر بھی اُنھوں نے اپنے قلم سے ہمزہ لکھا ہے: (۴)

گشتہ در تاریکیٔ روزم نہان گو چراغی تا بجویم شام را

(۱) خطوط: ۱/۲۳۱ (۲) مکاتیب: ۳۱ (۳) ایضاً: ۴۳ (۴) انتخاب غالب فارسی قلمی: ۷، ۸، ۹

تا خود شبی بہ ہمدمیٔ ما بسر برد — در چشم سنبلِ غیر رہا کرد خواب را
سر منزلِ رسائیٔ اندیشۂ خود یم — در انگبست جلوہ پئ رہنمای را
واں پہنچ کر جو غش آتا پئ ہم پہ ہم کو — صدرہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہو ہم کو[1]

بیتاب نے اس شعر میں "موزونیٔ طبع" بے ہمزہ کے لکھا تھا:

آج ہیں موزونیٔ طبع پہ نازاں ہوا — سچ ہے کہ رونقِ پذیرائے مرد یواں ہوا

میرزا صاحب نے "موزونیٔ طبع" بنا دیا ہے۔

(۶) جن مذکر اسموں کے آخر میں الف یا ہای مختفی ہوتی ہے، بحالتِ تحریف اُن کے آخری "الف" یا "ہے" کو جمعِ قائم کی طرح بول چال میں "ی" سے بدل دیتے ہیں۔ اس میں عربی، فارسی، ترکی۔ ہندی کسی زبان کے الفاظ کا استثنا نہیں ہے۔ کتابت میں الف پر ختم ہونے والے واحد محرف اسموں کو جمعِ قائم کی طرح بالاتفاق "ی" سے لکھا جاتا ہے، مثلاً گھوڑے نے اپنے سوار کو گرا دیا، یا تم نے تماشے میں کیا دیکھا۔ مگر ہای مختفی پر ختم ہونے والوں اسم بحالتِ تحریف بیشتر "ہ" سے اور کمتری سے لکھے جاتے ہیں۔ میرزا صاحب نے بھی اپنے خطوں میں "ی" سے کم اور "ہ" سے زیادہ لکھا ہے۔ لیکن انتخابِ اردو میں "حسن غمزہ کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد، پرتو سے آفتاب کے ذرّہ میں جان ہے، زلف گرہ بجاؤں تو شانہ میں اُلجھا دے مجھے، تھا۔"[2] میرزا صاحب نے "غمزے، ذرّے، شانے" بنایا ہے۔ ناظم اور بیتاب کے مسودوں میں بھی بالالتزام ایسے تمام اسماء کی آخری "ہ" کاٹ کر "ی" بڑھا دی ہے۔ چنانچہ اُن کے یہاں "پینے سے، اشارے ہی نے، سینے، ساقہ ناقے کے، میخانے میں، آئینے کو، نمحانے میں، سرنامے سے، گریبانے نے، میکدے کا، چہرے کی، نالے کی۔ شیشے سے، زمانے کا" میرزا صاحب کا اصلاح دیا ہوا املا ہے۔ اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ میرزا صاحب اصولاً اسی املا کے قائل تھے، ورنہ سابق املا کو قلمزد کر کے "ی" کیا تھ کیوں لکھتے، ہاں ایک استثنا اُن کی تحریروں میں موجود ہے، اور وہ اُن ہای مختفی پر ختم

(۱) انتخاب اردو قلمی: ۲۷ (۲) ایضاً: ۱۴، ۳۱، ۴۶

ہونے والے اسما کا ہے، جو فارسی ترکیب میں واقع ہوں۔ ان میں میرزا صاحب نے بہرحال "ہ" باقی رکھی ہے۔ چنانچہ بیتاب نے "گل ولالے" لکھا تھا، میرزا صاحب نے اسے قلمزد کر کے "گل ولالہ" بنایا ہے۔

اسی طرح لفظ ریختہ کو بھی ہمیشہ "ہ" سے لکھا اور لکھوایا ہے۔ نواب فردوس مکاں کے اس شعر میں:

یہ طرز کسی اور کو کب یاد ہے ظلم ہیں ریختے میں پیرو انداز خسرو ہم

"ریختہ" بنا دیا ہے۔

(۷) ہای مختفی پر ختم ہونیوالے الفاظ کے متعلق ڈاکٹر صدیقی صاحب فرماتے ہیں:

"اور محققوں اور استادوں کی طرح غالب بھی اس میں محتاط تھے۔ سوا "دیوانہ، ماہ، لالہ" وغیرہ کے، جو گویا علم ہیں، کبھی ہندوستانی لفظ "ہ" سے نہ لکھتے تھے؛ ایسے لفظوں میں "ہ" نہ لکھتے تھے، جن کا وجود فارسی یا عربی میں نہیں اور جو تیار اور زرا کی طرح ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے ہیں، جیسے خاکا، نقشا وغیرہ۔

اس سے آگے بڑھ کر، وہ اُن فارسی عربی لفظوں کو بھی، جو اردو میں بہت گھل مل گئے ہیں، یا جو محاورے میں آگئے ہیں، اکثر الف ہی سے لکھتے تھے جیسے روانا، مزا وغیرہ۔" (۱)

لیکن قاضی عبدالودود صاحب کی رائے یہ ہے (اور مجھے اُن کی رائے سے کامل اتفاق ہے) کہ میرزا صاحب کے ہاتھ کی تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہای مختفی کے لکھنے میں ایک روش کے پابند نہ تھے۔ تھانہ، پودینہ اور کیوڑہ کو باوجود ہندی ہونے کے "ہ" سے لکھا ہے۔ "نقشا" کو نقشہ لکھا ہے۔ جھروکہ درشن، پرچہ ہنڈوی، گل تکیہ، قولہ، چوترہ، دو درقہ، جولاہہ، روزمرہ، دوسالہ، وغیرہ بھی اُن کے خطوں میں موجود ہیں ان کو زیادہ تر "ہ" سے اور کم الف سے لکھا ہے۔ (۲)

چونکہ یہ آزادی اُن کی اخیر عمر تک کی تحریروں میں موجود ہے، اس لیے اس

(۱) مقدمۂ خطوط غالب: ۱۰۱ (۲) رسالہ سمیر دہلی، ج ۲ نمبر ۶ ص ۱۴۲

بارے میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اُنھوں نے آخر میں فلاں روش اختیار کر لی تھی۔ البتہ اُنھوں نے ناظم کے مسودے میں "گلا" کو "گلہ" بنا دیا ہے۔ بظاہر یہ عام بول چال میں شامل ہو کر ہندوستانی بن چکا ہے۔ اس لیے اس کے الف کو "ہ" میں تبدیل کرنے سے یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ لفظ "گلا" (یعنی حلق) سے التباس دور کرنے کے لیے ایسا کیا تھا۔ اگر یہ صحیح ہے، تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ میرزا صاحب مواضع التباس میں عربی فارسی کے اُن لفظوں کو ہائی مختفی سے ہی لکھتے تھے، جو اردو میں گھل مل گئے ہیں۔

(۸) اردو کے جن الفاظ میں الف یا واوِ مدّہ کے بعد "ی" واقع ہوتی ہے، اُن کی کتابت بھی یکساں نہیں ہے۔ "ہاے، کھاے، ہوے" کو کبھی بے ہمزہ کے اور کبھی ہمزہ کے ساتھ "ہائے، کھائے، ہوئے" لکھا ہے۔ اسی طرح یای مدّہ کے بعد "ی"۔ ہو، تو یای اول کو کبھی بصورتِ ہمزہ، کبھی بصورتِ یا اور کبھی "ی" اور ہمزہ دونوں کے ساتھ لکھا ہے۔ چنانچہ لیے، دیے، چاہیے، کو "لئے، دئے چاہئے" اور، لیئے، دیئے اور چاہیئے" ہر طرح لکھ دیا ہے۔ اور اکثر تو ایسا کیا ہے کہ ایک ہی سطر میں ایک قسم کے الفاظ کو دو طرح سے لکھ دیا ہے، اس لیے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان لفظوں کے املا کی کسی خاص شکل کو ضروری نہیں جانتے تھے۔

لیکن نواب ناظم اور بیتاب کے مسودوں میں "کیجئے، دیکھئے، چاہئے پوچھئے، ہساتے، گئے، آجائے، لائے، لگ جائیگی، آئے ہو۔ ہوتے، پھیلائے" وغیرہ میں سے ہمزہ کو قلمزد کر دیا ہے۔ یہ اس پر دال ہے کہ میرزا صاحب ان لفظوں کو بے ہمزہ کے انسب جانتے تھے۔ چونکہ میرزا صاحب املا اور تلفظ کے تطابق کے حامی ہیں، اور مذکورۂ بالا لفظوں کو "ی" کے ساتھ لکھنا اُن کے تلفظ کے عین مطابق ہے، اس بنا پر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ میرزا صاحب کا پسندیدہ املا یہی ہے۔

(۹) نونِ غنہ کے استعمال میں میرزا صاحب نے احتیاط کی ہے۔ پانو کا املا تین طرح کا مروج تھا: پانو، پانوں، پاؤں۔ میرزا صاحب اول الذکر کو صحیح

اور باقی دونوں کو غلط کہتے تھے، ناظم اور بیتاب کے مسودوں میں جگہ جگہ پانو کی یہ اصلاح موجود ہے۔ جنون بریلوی نے پاؤں لکھا تھا۔ اُن کو بتاتے ہیں کہ پاؤں کی یہ املا غلط۔ پانو، گانو، چھانو، درست ہے۔(۱) اور کسی شاگرد نے "پانوں" تحریر کیا تھا۔ اُسے لکھتے ہیں:

"پانو۔ قافیہ گانو اور چھانو کا ہے۔ آگے اس کے نون لکھنا غلط ہے۔ مگر ہاں بصیغۂ جمع یوں لکھنا چاہیے، پانوں"۔(۲)

ڈاکٹر صدیقی صاحب فرماتے ہیں:

"پانو، گانو، چھانو، دانو کی یہ املا یقیناً بہتر ہے؛ اس لیے کہ ایک تو غنہ یہاں حقیقت میں الف میں ہے۔ دوسرے جمع کی محرف حالت میں ان لفظوں کی صورت یوں ہوتی ہے: پانوؤں، گانوؤں وغیرہ۔ بخلاف اس کے اگر واحد کی لکھاوٹ "پانوں" یا "پاؤں" قرار دیجیے، تو جمع محرف "پانوؤں" یا "پاؤنوں" بنتی ہے، جو ہرگز قبول کرنے کے لائق نہیں"(۳)

میں عرض کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کا استدلال قوی نہیں ہے۔ کنواں، دھواں، رُواں جوں کی جمعیں کنووں، دھوؤں، رُوؤں، رووں، اور جوؤں، جووں ہیں۔ مذکورہ اصول کے پیشِ نظر ہم یوں کہتے: "اس کنوئیں کا پانی شہر بھر کے کنوانوں سے بہتر ہے"، حالانکہ "کنووں سے بہتر ہے"، سب بولتے ہیں۔ میری ناقص رائے یہ ہے کہ ان لفظوں میں الف اور واو دونوں کے بعد نون غنہ ہے، اس لیے بہتر املا چانوں اور گانوں ہے۔

پوچھنا کو کچھ کاتب اب تک پونچھنا اور سوچنا کو سونچنا لکھ دیتے ہیں۔ اول الذکر میں سے بیتاب اور ناظم کے مسودوں میں ہر جگہ نون کاٹ دیا ہے۔ مگر "سوچنا" کو خود کئی جگہ "سونچنا" لکھ دیا ہے۔(۴)

"دونوں" کو بعضے احباب "دونو" بے نونِ آخر لکھتے ہیں۔ میرزا صاحب اسے

(۱) خطوط: ۲، ۱۱۸ (۲) ایضاً: مقدمہ صدیقی: ح (۳) مکاتیب: ۱۴۱،

نون کے ساتھ لکھتے تھے۔ مذکورۂ بالا مسودوں میں بھی اس لفظ کی اصلاح کی ہے۔

(۱۰) ہای مخلوط کے بارے میں ڈاکٹر صدیقی صاحب فرماتے ہیں:

"ایک اور چیز جس کی لکھاوٹ میں اختلاف ہے، مخلوط "ھ" ہے۔ بعضے لفظ اگلے زمانے میں "ھ" کے ساتھ لکھے جاتے تھے، جیسے سامھنے، اور غالب کے زمانے میں یا اُس سے کچھ پہلے ان لفظوں میں سے لوگ "ھ" کو حذف کرنے لگے تھے۔ چنانچہ "سامنا" خود غالب نے لکھا ہے۔ مگر تڑپنا کو نہیں لکھتے:

"بای فارسی اور نون کے درمیان ہای مخلوط التلفظ ضرور ہے"

اسی طرح "ڈھونڈھتے" لکھتے ہیں[1] مگر جہاں کہیں "ھ" ہے ہی نہیں، وہاں منع کرتے ہیں: "چابی یعنی کلید شوق سے لکھو، نہ چاہبی"۔

ہاتھ کو غالب نے جب لکھا، ہات لکھا اور "او دھ اور میرٹھ میں بھی اکثر "ھ" نہ لکھتے۔ البتہ "ساتھ ہیں ضرور لکھتے کہ کہیں "ہ" کا دھوکا نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مخلوط "ھ" جب لفظ کے آخر میں آتی ہے، تو اُس کی آواز بہت ہی ہلکی ہوتی ہے بلکہ کبھی کبھی غائب ہو جاتی ہے۔ غالب اس ہلکی "ہ" کو ہای مغمزہ کا نام دیتے ہیں:

"رہ لفظ ہندی الاصل رکھتے ہے یہ ہای مغمزہ"

اُن کے اس کہنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ اصل لفظ رکھ ہے جس میں "ہ" کی آواز ہندی میں تو پوری ہے، مگر اُس کا تلفظ اردو کے فصیحوں یا دلی والوں کی زبانوں پر بہت ہلکی ھ کے ساتھ ہے، ایسی ہلکی کہ گویا اُس کا وجود ہی نہیں۔ ظاہرا اسی بنا پر ہاتھی کو "ہاتی" لکھتے تھے۔

"دلی کی زبان میں مخلوط "ھ" پر کبھی قلب کا عمل ہوتا ہے۔ ایک خط میں غالب نے گرنکھ کو گڑھ پھنک لکھا ہے۔ ایک دوسرے خط میں بھی یہ لفظ آیا ہے، اور م[2] (اردوی معلی حصہ اول کے پہلے ایڈیشن) کے کاتب نے گڑھ پھنک لکھا ہے۔ اور ایک اور جگہ۔ تو۔۔۔ فارسی بھگارا کر (یعنی گھمارا کر)[3]

(۱) ناظم نے بھی ایک جگہ ڈھونڈا لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے اُسے ڈھونڈھا بنا دیا ہے (۲) ایک جگہ میرزا صاحب نے گھٹائیں کو گھٹائیں لکھا ہے۔ مکاتیب: ۶۰

ھ لکھنے کے قلب مع ابدال کی مثالیں ہیں: سوہٹھ کی جگہ سہرٹ اور پہنچا کی جگہ "پونچھا"

ان مثالوں سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ غالب املا کو زبان کے مطابق رکھنے کے اہم اُصول پر عمل کرتے تھے[1]

میں عرض کرتا ہوں کہ "ناظم کے اس مصرع میں ے ہاتھ میں خط لیا کہ دم نکلا۔ کاتب نے "ہاتھ" لکھا تھا، اور ے ہاتھ سے رضواں کے چھوٹا شانہ زلفِ حور میں، اس کے اندر "ہات" لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے دونوں جگہ "ہاتھ" بنایا ہے، جو اس کی دلیل ہے کہ موخرالذکر کو میرزا صاحب مرجح جانتے تھے۔ پس اس صورت میں یہ کہنا کہ ہاتھ کو ہمیشہ ہات لکھتے تھے، صحیح نہیں، بلکہ یہ قیاس مناسب ہوگا کہ پہلے ہات لکھتے تھے، بعد میں "ہاتھ" کو ترجیح دینے لگے۔

"ٹھہرنا" کو کچھ لوگ "ٹھیرنا" کچھ "ٹھرنا" لکھتے ہیں۔ میرزا صاحب نے اس لفظ کو "ٹہرنا" لکھا ہے، اور ناظم کے اس مصرع میں ے "جو آ گئے ہو مرے گھر تو کوئی دم ٹھیرو"۔ "ٹھیرو" بنایا ہے نیز بیتاب نے لکھا تھا:

کیا مزا دکھاتے ہیں ہم بھی تو طبیب جا تقریریں کر کے اور یہ ناصح، تو ہل گیا

اس میں "ٹہر تو جا" بنایا ہے۔ جس کا یہ مطلب ہے کہ میرزا صاحب اسے ایک سادہ "ہ" سے لکھتے تھے۔

بعض لفظوں میں عام بول چال کے اندر ہائے مخلوط نہیں ہے۔ مثلاً منہ چڑھانا" اور "بگھلنا" کو منہ چڑانا اور پگلنا بولتے ہیں۔ میرزا صاحب نے بیتاب کے مسودوں میں بول چال کے املا کو غلط قرار دیا ہے، اور دونوں جگہ "ھ" بڑھادی ہے۔

(۱۱) بعض ہندی الفاظ کا تلفظ ایک مقام پر "ڈ" سے اور دوسرے پر "ڑ" سے کیا جاتا ہے۔ جیسے گاڑی، بوڑھا، کہ اضلاعِ سہارنپور و میرٹھ میں "گاڈی" اور "بوڈھا" بولتے ہیں۔ میرزا صاحب نے بھی ان دونوں لفظوں کو "ڈ" سے لکھا ہے[2]

(۱) خطوط، مقدمہ، طد ی (۲) مکاتیب: ۳۲ / ۳۸، ۴۸۔

"اُکھاڑ ڈالنا" کو "اوکھاڑ ڈالنا" لکھ دیا ہے[1]۔ اگر تشدید کو از راہِ سہو ڈھلی علامت کے بدلے نہیں لکھ دیا ہے، تو یہ بھی لہجے کے مطابق املا کی مثال ہے۔

"فرمائیے، اور "کھائیے" کو تشدید دیا "فرمائیّے" اور "کھائیّے" لکھا ہے[2]۔ پہلے زمانے میں اُن نے، اور "اُس سے" کو ملا کر اُنّے اُسّے لکھا کرتے تھے۔ میرزا صاحب خود بھی دو لفظ ملا کر لکھ دینے کے عادی ہیں، مگر مذکورہ مثالوں میں اُنھوں نے ہمیشہ احتیاط اور بیتاب کو جدا جدا لکھنے کی تلقین کی ہے، جس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اُن دو لفظوں کو ملا کر نہیں لکھتے تھے، جن میں سے اول کا اخیر حرف اور دوسرے کا پہلا حرف ایک ہو۔

لفظ آئینہ جب فاعلن کے وزن پر نظم میں باندھا ہے، تو اُسے "آینہ" لکھا ہے، آئنہ نہیں لکھا، اور یہی املا ناظم کو بتایا ہے۔ اسی طرح خامُشی اور بہیُدہ میں "د" کے اضافے کو منع کیا ہے۔

املا میں بھول چوک

میرزا صاحب نے عربی الفاظ کا صحیح املا لکھنے کی پوری کوشش نہیں کی، اس لیے اُن سے متعدد غلطیاں سرزد ہوگئی ہیں:

۱) بیتاب نے ایک شعر میں "جزِ لاینفک" لکھا تھا[3]۔ میرزا صاحب نے اُنھیں بتایا کہ بجائے اس کے "جزوِ لاینفک" لکھنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کا اس لفظ کو سہ حرفی بتانا درست ہے، لیکن اس کے آخر میں ہمزہ کی جگہ واو لکھنا صحیح نہیں۔ دراصل یہ لفظ "جزٔ" ہے۔ واو عجمیوں کی کارستانی ہے۔

۲) جن لفظوں میں حرفِ جارہ "ب" معرّف باللام پر داخل ہوا ہے، اُن کی کتابت میں میرزا صاحب نے غلطی کی ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے "بالکل، بالفعل، باللہ" لکھا ہے[4] حالانکہ صحیح کتابت "بالفعل، بالکل، باللہ" ہے۔

۳) جن عربی اسمِ فاعل کے صیغوں میں الف کے بعد "ی" آتی ہے، جیسے ایم

(۱) مکاتیب: ۳۷ (۲) ایضاً: ۱۷ (۳) ایضاً: ۱۰۵ (۴) ایضاً: ۲۱، ۲۲، ۲۷

قایم، وغیرہ اُن کا صحیح املا ہمزہ کیا تھا ہے، مگر میرزا صاحب نے بغیر "ی" کے ساتھ لکھا ہے اور اگر کہیں ہمزہ لکھی بھی ہے، تو "ی" کے اوپر۔ چنانچہ مائدہ کو مایدہ[۱]، جائز کو جایز[۲]، اور مطمئنہ کو مطمیئنہ[۳] لکھا ہے۔ لفظ قائل اور مائل کو قایل، مایل لکھا تھا[۴] مگر اس کے تیرہ دن بعد قایل اور مایل لکھا[۵] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ "ی" کے ساتھ املا کو ترجیح دیتے تھے۔

۴) یہی حال عربی کی اُن جمعوں کا ہے، جو فواعل وزن پر آتی ہیں، مثلاً حقائق دقائق۔ کہ ان کا صحیح املا ہمزہ ہے، مگر میرزا صاحب نے انھیں بھی حقایق، دقایق، طبایع وغیرہ یا لیاء لکھا ہے،[۶] جو عجمیوں کی پیروی معلوم ہوتی ہے۔

۵) عربی کے دو ناموں عُمَر اور عَمْر میں فرق کرنے کے لیے علمای عرب نے مفتوح العین کے آخر میں واو بڑھا دیا ہے، چنانچہ وہ نام عَمْرو لکھا اور عَمْر پڑھا جاتا ہے۔ داستانِ امیر حمزہ کا ایک کردار عَمرو عیار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب اس نام کے تلفظ اور املا دونوں سے ناواقف تھے۔ مُنھوں نے اس کو بحرِ کتِ اوسط نظم کیا، اور بے واو کے لکھا ہے۔[۷]

۶) مولانا اور اولانا کی کتابت میں بھی میرزا صاحب کے یہاں دو رنگی پائی جاتی ہے۔ ایک مکتوب میں اُنھوں نے "مولانا" لکھا ہے، جو صحیح طرزِ کتابت ہے، مگر اس کے سولہ دن بعد مولنا اور اولنا لکھا ہے۔[۸]

۷) لفظِ مُؤبّد کو بے ہمزہ کے "مُوبّد" لکھا ہے[۹]، جو غلط ہے۔

۸) اُدوِیہ کو اَدْوِیّہ، بُوجہ کو بوجہ، توجہ کو توجہ لکھا ہے۔[۱۰] یہ غلطی اُن سے اکثر جگہ سرزد ہوئی ہے۔ کتاب خانے میں دستنبو کا جو قلمی نسخہ میرزا صاحب کا پیش کردہ ہے، اُس کے حاشیوں پر حلِ لغات میرزا صاحب کے قلم کا ہے۔ ان حاشی میں اُنھوں نے کئی جگہ اس قسم کے لفظوں میں ایک "ہ" بڑھا دی ہے۔

(۱) مکاتیب: ۴۶ (۲) ایضاً: ۴۶، ۱۰۱ (۳) ایضاً: ۶۰ (۴) ایضاً: ۶۷ (۵) ایضاً: ۷۷۔
(۶) ایضاً: ۵۴، ۶۰ (۷) ایضاً: ۴۳ و ۸) ایضاً: ۴، ۵۔ (۹) ایضاً: ۴۷ (۱۰) ایضاً: ۲۲، ۶۵، ۷۸،

۹) فارسی کے جن لفظوں میں الف کے بعد "ی" آتی ہے، جیسے گنجایش، آیندہ وغیرہ۔ ان کا صحیح املا "ی" کے ساتھ ہے، اور اس طرح میرزا صاحب نے لکھا بھی ہے۔ مگر پایندہ اور فرایندہ کو "پائندہ اور فرائندہ" لکھدیا ہے۔(۱)

۱۰) خُرّم کو خوّرم یا واو لکھدیا ہے۔(۲)

۱۱) فارسی کے وہ لفظ جن کے آخر میں "بد" آتا ہے، جیسے موبد، اسپہبد، وہ بفتح با صحیح ہیں۔ میرزا صاحب نے اسپہبد کو اسپہُبد بضم با لکھدیا ہے۔(۳)

۱۲) انگریزی الفاظ بھی اکثر غلط لکھے ہیں۔ چنانچہ، لارڈ اور بورڈ کو لاڑد اور بوڑد، سارٹیفکٹ کو سارتیفکٹ، پنشن کو پنسن، کلکٹر کو کلکتر، ہارڈنگ اور ڈلہوسی کو ہاردنگ اور دلہوسی لکھدیا ہے۔

علامات اوقاف

میرزا صاحب کی تحریروں میں پرانی علاماتِ اوقاف کا استعمال بھی پایا جاتا ہے۔ وہ پیراگراف کے آخر میں اکثر یہ علامت (ط) لکھتے ہیں، جو لفظِ "فقط" کی طغرائی شکل ہے۔ کبھی بارہ کا ہندسہ (۱۲) بھی اس مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں، جو لفظِ "حد" کے عدد ہیں۔ اس ہندسے کے بارے میں لطیفے کے طور پر تمہر کو لکھتے ہیں:

"صاحب، بندہ، اثنا عشری ہوں؛ ہر مطلب کے خاتمہ پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں۔"(۴)

چند خطوں میں یہ علامت (ص) بھی خط کے یا پیراگراف کے آخر میں لکھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ "بُقِیَ" یا "بِقِصَّہٖ" کا مخفف ہے۔ اول الذکر کے معنی ہیں "صاف کیا گیا" اور دوسرے کا مطلب ہے "بالفاظہٖ"۔ یہ دونوں لفظ مطابقِ اصل نقل کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بادشاہوں کے فرامین کے آخر میں بالعموم یہ نشان ثبت ہوتا ہے۔ چونکہ اصلِ فرمان محافظ خانے میں محفوظ رہتا تھا، اور اُس کی نقل کا اجرا کیا جاتا تھا، اس لیے نقل پر بادشاہ اپنے قلم سے ص بنا دیا کرتے ہوں گے، تاکہ ثابت ہو جائے کہ نقل مطابقِ اصل ہے، اور فرمان بادشاہ کے دستخط سے مزین ہو چکا ہے۔

(۱) مکاتیب: ۱۰ (۲) ایضاً: ۶۷ (۳) ایضاً: ۴۳ (۴) اردوی: ۲۵۷

چونکہ یہ علامت آخرِ فرمان میں بنائی جاتی تھی، قیاس یہ ہے کہ منشیوں نے اسے خاتمے کی علامت کی جگہ لکھنا شروع کر دیا، اور رفتہ رفتہ نہ صرف کسی دستاویز کے آخر میں بلکہ ایک پیراگراف کے ختم پر بھی اسے لکھنے لگے۔

نئے جملے کے پہلے لفظ کے اوپر یہ شکل (ـہ) بھی بناتے ہیں، جو عربی کے لفظِ "بَت" کی شکل ہے۔ کبھی کبھی نئے پیراگراف کے آغاز میں بھی یہ علامت بنائی ہے۔

بعض خطوں میں میرزا صاحب نے نئے پیراگراف کو دوسری سطر سے شروع کیا ہے، جو اس کی دلیل ہے کہ وہ انگریزی طریقِ کتابت سے آگاہ تھے۔

ایک خط میں صفحہ ختم ہو جانے کے باعث کچھ عبارت حاشیے پر لکھنا پڑی تھی۔ اس کے ربط کی طرف اشارہ کرنے کے لیے انھوں نے (۱۵) کا ہندسہ متن کے آخر اور حاشیے کے شروع میں لکھا ہے۔[1]

شعر یا مصرع کے پہلے یہ علامت (ـہ) ضرور لکھتے تھے، جو لفظِ "بیت" کی مخفف شکل ہے۔ ایک بار نامہ تاریخ لکھ دینے کے بعد کوئی بات یاد آئی، تو اُسے "لہ" لکھ کر تحریر کیا ہے۔[2] عربی کا یہ فقرہ عموماً مجموعہائے اشعار میں استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ اس کے معنی ہیں، "اُس کا"، اس لیے کسی ایک شاعر کے متفرق شعر لکھتے وقت ہر نئے شعر سے پہلے "لہ" لکھ دیتے ہیں، تاکہ پڑھنے والے کو معلوم ہو جائے کہ یہ شعر بھی اُسی شاعر کا ہے، جس کا شعر ابھی گزر چکا ہے۔ میرزا صاحب نے اسے نثر میں بھی استعمال کیا ہے۔

حسابی رقوم

میرزا صاحب نے روپوں کی تعداد ظاہر کرنے کیلیے حسابی رقوم بھی لکھی ہیں، جو بسا اوقات تعداد ظاہر کرنیوالے الفاظ کے اوپر لکھی گئی ہے، لیکن چند خطوں میں عبارت کے بجائے رقموں پر اکتفا کی گئی ہے۔ میرزا صاحب نے سو روپے کی رقم کو اسطرح لکھا ہے (۱۰۰/۰) آجکل اسے ایک سو پڑھا جائیگا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایک کی رقم (۱/۰) انگریزی کے لفظ (SHILLY) یعنی مد کی جگہ لکھی گئی ہے، تاکہ کو[illegible] جلسازی سے سو کی رقم کے آگے کچھ بڑھا نہ سکے۔

(۱) مکاتیب: ۸، ح ۱ (۲) ایضاً: ۱۰

طباعتِ خطوط

میرزا صاحب کی صناعت

سب سے پہلے منشی شیونرائن اور تفتہ کو میرزا صاحب کے خطوط کی طباعت کا خیال پیدا ہوا۔ ان دونوں نے علیحدہ علیحدہ میرزا صاحب کو اپنی تجویز سے مطلع کر کے اشاعت کی اجازت چاہی۔ اُس عہد تک مراسلت میں انشا پردازی کے تمام اصول و ضوابط کا لحاظ ضروری شمار ہوتا تھا، اور میرزا صاحب کے خیال میں زبانِ اردو کے لیے اس بارِ گراں کا تحمل دشوار تھا۔ چنانچہ ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب کی فرمائش اردو کے جواب میں اُنھوں نے یہی لکھدیا تھا، کہ اس زبان میں زورِ قلم صرف کر کے معانیٔ نازک پیدا کرنا اور اس طرح اپنا کمالِ انشا ظاہر کرنا مشکل ہے۔ اس میں گنجائشِ عبارت آرائی کہاں، جو کوشش کی جائے؟ لہذا مجھے اس خدمت سے معاف رکھا جائے[1]۔ علاوہ ازیں اُنھوں نے اردو مراسلت کا دشت پژوہی سے بچنے کے لیے شروع کی تھی، اور اس وجہ سے کبھی قلم سنبھالکر اور دل لگاکر کوئی خط نہ لکھا تھا۔ ان یارانِ باصفا کی تجویز منظور کر لینے میں خطرہ ہوا کہ کہیں کمالِ انشای فارسی کے مداح اردو نثر دیکھ کر شکوہ سخنوری پر نکتہ چینی نہ کرنے لگیں، اور اردو کا یہ پھیکا پھوان فارسی کی اونچی دوکان کی شہرت پر دھبا نہ لگا دے۔ اس لیے ۱۸ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء کو منشی شیونرائن کو جواباً لکھا:

"اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زاید بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا کہ جو میں نے قلم سنبھالکر اور دل لگاکر لکھا ہوگا، ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اوسکی

(۱) اردوی معلی، ص ۲۷۳ و ۲۹۷ پر وہ خطوط ملاحظہ ہوں جن میں میرزا صاحب نے اردو نثر لکھنے سے انکار کیا ہے، اور ساتھ ہی اس انکار کے وجوہ بھی بتائے ہیں۔

شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں؟ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپا میرے خلاف طبع ہے۔" (۱)

اسی اثنا میں مرزا تفتہ کا پرزور نیاز نامہ آیا۔ اس کو پڑھ کر ۲۰ نومبر سنہ ۵۸ء کو ادھر منشی شیونرائن کو لکھا:

"رقعوں کے چھاپے کے باب میں مخالفت لکھ چکا ہوں، البتہ اس باب میں میری رائے پر تم کو اور مرزا تفتہ کو عمل کرنا ضرور ہے۔" (۲)

اور اس طرف تفتہ کی ہٹ کے جواب میں مشفقانہ تحریر کیا:

"رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے۔ لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔ اور اگر تمھاری اسی میں خوشی ہے تو صاحب مجھ سے نہ پوچھو۔ تم کو اختیار ہے۔ یہ امر میرے خلاف رائے ہے۔" (۲)

اس کے بعد ان دونوں نے طباعتِ مکاتیب کے سلسلے میں کچھ نہیں لکھا، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انھوں نے ارادۂ طباعت فسخ کر دیا تھا۔

غالب کے خطوں کا پہلا مجموعہ: مہرِ غالب

اس واقعے کے دو سال بعد سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) میں سرور اور منشی ممتاز علی خاں، رئیس میرٹھ، نے میرزا صاحب کی اجازت حاصل کیے بغیر اُن خطوط کی طباعت کا تہیا کیا، جو سرور کے نام میرزا صاحب نے لکھے تھے۔ ترتیب کا کام سرور کے سپرد ہوا اور طباعت کا ذمہ، ممتاز علی خاں نے لیا۔ سرور نے اس کا نام "مہرِ غالب" رکھ کر اُس کے دیباچے میں لکھا: (۳)

(۱) اردو ی: ۳۶۱ و ۳۶۲ (۲) ایضاً: ۱۰۵ (۳) اگرچہ سرور نے سنہ ۱۸۶۱ء میں میرزا صاحب کے خطوط مرتب کر لیے تھے، لیکن دیباچہ لکھنے کی نوبت سنہ ۱۸۶۴ء میں آئی، جب کہ کتاب پریس کو جا رہی تھی۔ اس لیے کہ خود ہندی (ص ۴۷) میں میرزا صاحب کا ایک خط اس دیباچے کی تعریف میں درج ہے، جو اس لیے سنہ ۱۸۶۳ء کا مکتوب معلوم ہوتا ہے کہ اس میں میرزا صاحب نے ماقبل مکتوب کا حوالہ دیا ہے، اور ماقبل کا خط کثرھ شیورہ اور رام کی وہستان پر مشتمل ہے، جو سنہ مذکورہ کا واقعہ ہے۔

"ارباب علوم کو معلوم ہو کہ میں انکسار ظہور، عبد الغفور تخلص بہ سرور، مارہروی بدو شعور سے اہل سخن کا طالب اور صاحب کمال کا خواہاں تھا۔ جب کلام بلاغت نظام رشک صائب، فخر طالب، جناب اسد اللہ خاں غالب کا دیکھا، دل کو بھایا۔ یکتا پایا ترسیل مراسلات میں قدم بڑھایا۔ ہر کتابت کا جواب آیا۔ جو نامہ کہ بنام میرے بعبارتِ اردو تحریر کیا، مکتوب سادہ رویوں سے دلربا تر، اور ہر سطر اوس کی سلسلہ مویوں سے تاب فرسا زیادہ ہے۔ جس آنکھ نے دیکھا، وہ بینا ہے، جس کان نے سنا وہ شنوا ہے۔ پس تنہا مستلذ ہونا اور آپ ہی آپ مزہ اڈھانا خلاف انصاف جانا دل مائل تمام بشہرت عام ہوا، اور ہنوز یہ قصد ناتمام تھا، کہ بمن اتفاق فخرداں وحید دوراں، جناب ممتاز علی خاں صاحب متوطن میرٹھ ... رونق افزای مارہرہ ہوے ... ایک روز محفل ممدوح میں ذکر ہمہ دانی وشیوہ بیانی جناب استادی و مخدومی در میان آیا۔ ارشاد کیا کہ کلام مرزا صاحب نسیم جانفزا اور شمیم دلکشا ہے۔ فارسی کا کیا کہنا! اردو بھی یکتا ہے۔ نظم و نثر فارسی تو محلی بحلیۂ انطباع ہوا، لیکن نثر اردو زیور طبع سے عاری رہا۔ اگر وہ خطوط کہ بنام تمہارے آئے اور تم نے سنائے ہیں، جمع کرو تو میں اوس کے انطباع کا بیڑا اوٹھاتا ہوں۔ اس تقریر سے نسیم تاثیر نے غنچۂ دل کھلایا۔ منشای خاطر ظہور میں آیا۔ وہ مکتوب کہ بنام میرے آئے تھے ترتیب دیے۔ گویا جواہر بے بہا کان قلدان سے نکالکر کشتیٔ اوراق میں جمع کیے چونکہ محبت جناب غالب میرے حال پر بہت غالب ہے، لہذا نام اس انشا کا "مہرِ نیم" (بکسر میم) مناسب ہے۔ سال ختم تالیف بھی اس نام سے مطابق پایا۔" (۱)

یہ تجویز منظور ہو گئی اور منشی ممتاز علی خاں میرٹھ چلے آئے۔ ابھی طباعت شروع نہوئی تھی کہ انھیں خیال پیدا ہوا کہ میرزا صاحب کے مزید رقعات تلاش کر کے اس مجموعے میں شامل کیے جائیں۔ اس خیال کی تکمیل میں قدرت نے امداد کی اور انھیں ایک اور مجموعے کا پتا چلا، جو میرزا صاحب کے علم اور اُن کی امداد سے مرتب کیا جا رہا تھا۔

(۱) عود ہندی: ۵ و ۶

غالب کے خطوں کا دوسرا مجموعہ

یہ مجموعہ بیخبر مرتب کر رہے تھے۔ اُنھوں نے اپنے ارادے کی اطلاع میرزا صاحب کو پہلے سے دیدی تھی۔ اور خواہش کی تھی کہ اُن تمام خطوں کی نقول بھی مہیا کردیں، جو دوسرے احباب اور شاگردوں کے نام لکھے گئے ہیں۔ میرزا صاحب نے اس التماس کو قبول کر لیا تھا۔ لیکن اُس وقت تک اُن کا یہ خیال تھا کہ صرف وہ خط مرتب کیے جائیں، جن میں کوئی ادبی خوبی ہو۔ روزمرہ کی نجی ضروریات پر مشتمل خطوں کو خارج کردیا جائے، اس لیے بیخبر کو جواب میں لکھا تھا:

"آپ کو معلوم رہے کہ منشی حبیب اللہ ذکا اور نواب مصطفیٰ خاں حسرتی کو کبھی اردو خط نہیں لکھا۔ ہاں ذکا کو غزل اصلاحی کے ہر شعر کے تحت میں منشاء اصلاح سے آگہی دیجاتی ہے، نوابصاحب کو یوں لکھا جاتا ہے: "کہار آیا۔ خط لایا۔ آم پہنچے کچھ باتیں۔ کچھ کھائے۔ بچوں کو دعا۔ بچوں کی بندگی۔ مولوی الطاف حسین صاحب کو سلام" یہ تحریر اس ہفتہ میں گئی ہے۔ غرضکہ عامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے۔ اب یہ عبارت جو تم کو لکھ رہا ہوں، یہ لائق شمول مجموعۂ نثر اردو کہاں ہے؟ یقین جانتا ہوں کہ ایسی نثروں کو آپ خود نہ درج کریں گے۔" (۱)

اسی زمانے میں نساخ کو ایک خط لکھا تھا۔ اُس کی نقل بیخبر کو روانہ کرتے ہوئے تمہیداً تحریر کرتے ہیں:

"پیر و مرشد! کوئی صاحب ڈپٹی کلکٹر ہیں کلکتہ میں۔ مولوی عبدالغفور خاں اون کا نام اور نساخ اون کا تخلص ہے۔ میری اونکی ملاقات نہیں۔ اونھوں نے اپنا دیوان چھاپے کا سوسوم بہ "دفتر بیمثال" مجھکو بھیجا۔ اوس کی رسید میں یہ خط میں نے اون کو لکھا۔ چونکہ یہ خط مجموعۂ نثر اردو کے لائق ہے، آپ کے پاس ارسال کرتا ہوں۔" (۲)

ان نجی خطوں کی مجموعۂ خطوط میں موجودگی سے معلوم ہوتا ہے کہ بیخبر نے اُن کے اس

(۱) عود ہندی: ۱۸۷ (۲) ایضاً: ۱۳۵

مشورے کو نہ مانا، اور ہر قسم کے خط شاملِ مجموعہ کر لیے۔

مقامِ طباعت

میرزا صاحب کا خیال تھا کہ نجبر اس مجموعے کو الہ آباد میں، جہاں وہ مقیم تھے، طبع کرائیں گے۔ اس لیے ایک انگریز کے استفسار کے سلسلے میں نجبر کو لکھا:

"جناب کیمس صاحب بہادر افسر مدارس غرب و شمال کا باوجود عدم تعارف خط مجھ کو آیا۔ کچھ اردو زبان کے فضور کا حال پوچھا تھا۔ اوس کا جواب لکھ بھیجا۔ نظم و نثر اردو طلب کی تھی۔ مجموعۂ نظم بھیجدیا۔ نثر کے باب میں تمہارا نام نہیں لکھا، مگر یہ لکھا کہ الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے۔ بعد انطباع و حصول اطلاع وہاں سے منگا کر بھیجدوں گا۔" (۱)

مگر نجبر نے اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے لکھا کہ منشی ممتاز علی خاں، رئیس میرٹھ، نے اپنے مطبع میں طباعت کا اہتمام کیا ہے۔ میرزا صاحب ان بزرگ سے واقف تھے، اس لیے نجبر کی اس خبر پر اطمینان ظاہر کیا، اور جب نجبر نے دوبارہ اُنکا ذکر کیا تو تحریر فرمایا:

"حضرت پیر و مرشد! اس سے آگے آپ کو لکھ چکا ہوں کہ منشی ممتاز علی خاں صاحب سے میری ملاقات ہے، اور وہ میرے دوست ہیں۔" (۲)

طباعت میں تاخیر

نجبر نے مکاتیب کی جمع و ترتیب کا کام سنہ ۶۱ء میں شروع کیا۔ میرزا صاحب کے مکتوب الیہوں میں سے جو بزرگ خود اُن کے دوست تھے، اُن سے براہِ راست، اور جن کی خدمت میں خود نیاز حاصل نہ تھا، اُن سے بتوسطِ غالب خطوط کی نقلیں مہیا کیں، اور سنہ ۶۵ء میں یہ سلسلہ ختم کر دیا۔ لیکن میرزا صاحب نے، جو سنہ ۶۳ء کے بعد سے طباعت کا انتظار کرنے لگے تھے، آخرِ کار مجبور ہو کر تقاضا شروع کر دیا۔ چنانچہ ایک خط کے آخر میں نجبر کو لکھا ہے:

(۱) عود: ۱۷۵ (۲) ایضاً: ۱۳۸

"اور ہاں حضرت! وہ مجموعہ چھپے گا بالفتح یا چھپے گا بالضم۔ چھپ چکا ہو تو حق التصنیف کی جتنی جلدیں منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت افضا کرے، فقیر کو بھیجیے۔" (۱)

احباب کے تقاضے

اس مجموعے کی ترتیب میں مختلف اصحاب کے پاس سے خطوط کی نقلیں منگائی گئی تھیں اس لیے ملک میں اس کی شہرت ہو چکی تھی۔ جب اشاعت میں زیادہ تاخیر ہوگئی، تو میرزا صاحب کے پاس تقاضے کے خطوط آنے لگے۔ ان تقاضوں سے پریشان ہو کر میرزا صاحب نے، مارچ سنہ ۱۸۶۴ء کو بیخبر کے نام حسب ذیل خط لکھا:

"ہاں حضرت! کہیے منشی ممتاز علی خاں کی سی بھی مشکور رہو گی؟ وہ مجموعۂ اردو چھپے گا یا چھپا ہی رہے گا؟ احباب اوس کے طالب ہیں۔ بلکہ بعض نے طلب کو بسر حد تقاضا پہنچا دیا ہے۔" (۲)

پنجاب اماطے کی مانگ

ان تقاضا کرنے والے احباب میں سب سے زیادہ حصہ زندہ دلانِ پنجاب نے لیا تھا۔ ان سے مجبور ہو کر میرزا صاحب نے منشی ممتاز علی خاں کو ملزم ٹھہراتے ہوئے بیخبر کو تحریر کیا:

"اجی حضرت! یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں؟ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوائے فی الحال پنجاب اماطہ میں اون کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ اون سے کہیں۔ مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں وہ سب یا اون سب کی نقل بطریق پارسل آپ مجھکو بھیجدیں۔ جی یوں چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب وہی پارسل ہو۔" (۳)

میرزا صاحب کا دیباچہ

غالباً اس کے جواب میں بیخبر نے میرزا صاحب کو لکھا کہ آپ مجموعۂ نثر اردو کیلیے دیباچہ لکھ کر روانا فرمائیں، تو کتاب پریس کو بھیجی جائے۔ اس سلسلے میں میرزا صاحب

(۱) عود: ۱۲۵ (۲) ایضاً: ۱۲۴ (۳) ایضاً: ۱۳۵

نے تحریر کیا:

"میں صاحب فراش ہوں۔ اٹھنا بیٹھنا ناممکن ہے۔ خطوط لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ اس حال میں دیباچہ کیا لکھوں" (۱)

بیخبر نے اس کے بعد بھی دیباچہ لکھنے کی درخواست کی، تو انھیں ظریفانہ انداز میں لکھا:

"بندہ پرور! اگر ایک بندۂ قدیم، کہ عمر بھر فرمان پذیر رہا ہو، بڑھاپے میں ایک حکم بجا نہ لائے، تو مجرم نہیں ہو جاتا۔ مجموعۂ نثر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچہ پر موقوف ہے، تو دس مجموعہ کا چھپ جانا بالفعل میں نہیں چاہتا بلکہ چھپ جانا بالقہر چاہتا ہوں۔ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

رسم است کہ مالکانِ تحریر آزاد کنند بندۂ پیر۔

آپ بھی اوسی گروہ یعنی مالکان تحریر میں سے ہیں، پھر اس شعر پر عمل کیوں نہیں کرتے" (۲)

عودِ ہندی

بیخبر نے میرزا صاحب کا عذر تسلیم کر کے اپنے جمع کردہ خطوط منشی ممتاز علیخاں کے پاس بھیج دیے۔ منشی صاحب نے سرور اور بیخبر کے مجموعہای مکاتیب کو یکجا کر کے "عودِ ہندی" نام رکھا، اور خود دیباچہ لکھ کر جمع و ترتیب میں سعی کرنے والے اصحاب کی محنت کی اس طرح داد دی:

"... نجم الدولہ اسداللہ خاں بہادر غالب، جن کی ذات باکمالات محتاج تعریف نہیں... سارا ہند ادنھیں جانتا ہے۔ ایران تک اونکی جادو بیانی کا چرچا ہے مجھ مدت سے اس کا خیال تھا کہ فارسی تصنیفیں تو اونکی بہت مرتب ہوئیں اور چھاپی گئیں... مگر کلام اردو نے سوائے ایک دیوان کے ترتیب نہ پائی۔ یہ دولت اربابِ شوق کے ہاتھ نہ آئی۔ حالانکہ نثر اردو اونکی اوروں کی فارسی سے ہزار درجہ بہتر

(۱) عود: ۱۳۸ (۲) ایضاً: ۱۲۷

یہ سلامت بیان، پختگی زبان، روزمرہ کی صفائی، اداؤں کی شوخی، کس کو کب میسر ہے؟ اور سے بھی ترتیب دیجئے۔ قدردانوں پر احسان کیجئے۔ میرے عنایت فرما اور میرزا صاحب کے شاگرد یکتا چودھری عبدالغفور صاحب سرور تخلص سے یہ ذکر آیا، تو اونھوں نے جتنے خطوط مرزا صاحب کے اون کے نام کے تھے، سب کو ایک جا کرکے اور اوسپر ایک دیباچہ لکھکے، وہ مجموعہ عنایت کیا۔ عرصہ تک سرگرم تلاش رہا۔ جابجا سے اور تحریریں مرزا صاحب کی بہم پہنچائیں، بڑی محنت اوٹھائی، تب تمنا بر آئی، اور مجموعہ مرتب ہوا۔ آج پورا اپنا مطلب ہوا۔

خواجہ غلام غوث خانصاحب بہادر بیخبر تخلص، جو نواب معلی القاب لفٹنٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی کے میر منشی اور میرے مخدوم خاص اور حضرت غالب صاحب کے مخلص با اختصاص ہیں، اس تلاش میں میرے معین اور مددگار رہے۔ بہت کچھ ذخیرہ اون کی بدولت بہم پہنچا۔

اس کتاب کی دو فصل اور ایک خاتمہ ہے۔ پہلی فصل میں چودھری صاحب کے مرتب کیے ہوئے خطوط اور اون کا لکھا ہوا دیباچہ، دوسری فصل میں میرے جمع کیے ہوئے رقعات، اور خاتمہ میں چند نثریں ہیں، جو جناب غالب نے اوردں کی کتابوں پر تحریر فرمائی ہیں۔ "عود ہندی" اس کتاب کا نام ہے۔" (۱)

عود ہندی کا سال طباعت

عود ہندی کا یہ ایڈیشن منشی ممتاز علی خاں نے اپنے مطبع مجتبائی، واقع شہر میرٹھ، میں طبع کیا۔ کتاب ۱۸۸ صفحوں پر تمام ہوئی۔ خاتمہ خلق میرٹھی نے لکھا۔ آخر میں چار تاریخی قطعے اضافہ کیے گئے۔ ان میں ایک قلق کا، ایک اُن کے شاگرد محمد میرٹھی کا اور بقیہ دو غالباً خود منشی ممتاز علی خاں کے ہیں۔

ان قطعات سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۲۸۵ ھجری میں طباعت پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ آخری صفحے کے نچلے گوشہ میں ۱۰ رجب سنہ ۱۲۸۵ ہجری (۲۷ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ء) درج ہے۔

(۱) عود: ۲ و ۳۔

جس سے تاریخ وماہ بھی متعین ہو جاتے ہیں۔

میور صاحب کی نذر

آخری خط کے مطالعے سے ایک [illegible] معلوم ہوتی ہے کہ منشی ممتاز علی خاں نے میور صاحب (غالباً سر ولیم میور گورنر ممالکِ مغربی وشمالی) کی خدمت میں عودؔ کا مطبوعہ نسخہ نذر گزرانا تھا۔ سر ولیم میور علومِ مشرقیہ کے عالم تھے۔ بنجیر نے، جو عودِ ہندی کی جمع وترتیب میں برابر کے شریک تھے، طابع کو مشورہ دیا ہوگا کہ مطبوعہ نسخہ صوبے کے اعلیٰ حاکم کے نام معنون کر کے نشر واشاعت کی تکمیل پر مہرِ یونیق ثبت کریں۔ اس زمانے میں اردو زبان میں ایسی نادر کتابیں معدودے چند شائع ہوئی تھیں۔ گورنمنٹ بعض سیاسی مصالح کے ماتحت نئی مفید کتابوں کی اشاعت میں انعام کے نام سے یا امدادِ طبع کہکر اخراجات کا بار اُٹھا لیا کرتی تھی؛ اس لیے بعید نہیں کہ منشی صاحب کو بھی کچھ روپیہ مل گیا ہو۔

میرزا صاحب کا حقِ تصنیف

ایک بار میرزا صاحب نے کتاب کی فوری اشاعت کا تقاضا کرتے ہوئے بنجیر کو لکھا تھا:

"اور ہاں حضرت! وہ مجموعہ چھپے گا بالفتح یا چھپے گا بالضم۔ چھپ چکا ہو تو حق التصنیف کی جتنی جلدی منشی ممتاز علی خاں صاحب کی ہمت انتفا کرے، فقیر کو بھیجے۔" (۱)

یہ امر یقینی ہے کہ عودِ ہندی میرزا صاحب کی زندگی میں شائع ہو چکی تھی۔ بظاہر خیال ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے اس کا حقِ تصنیف حاصل کیا ہوگا۔ لیکن اُن کے مکاتیب میں اس کی طباعت یا حقِ تصنیف کے نسخوں کی وصولیابی کا مطلق ذکر نہیں پایا جاتا۔

عود کے رقعات کی تعداد

عودِ ہندی کے کل رقعات کی تعداد ۱۶۲ ہے۔ ان میں ۲۵ سرور کے نام،

(۱) عود: ۱۲۵

۲ صاحب عالم مارہروی کے نام، ۲ شاہِ عالم مارہروی کے نام، ۲۰ شفق کے نام، ۲ عزیز کے نام، ۳۱ مجروح کے نام، امیر سرفراز حسین کے نام، ۱ علائی کے نام، انگشتہ کے نام، ۱۸ قہر کے نام، ۲۵ بیخبر کے نام، انساخ کے نام، اظہیر الدین خاں کی طرف سے اُن کے چچا کے نام، ۱ شیفتہ کے نام، ۱ رعنا مراد آبادی کے نام، امرزا رحیم بیگ کے نام، ۱۰ شاکر کے نام، ۱۵ اخون بریلوی کے نام، امولوی عزیز الدین کے نام، ۱ سید محمد عباس صاحب کے نام اور ۱ منشی غلام بسم اللہ صاحب کے نام ہے۔

اُن خطوط کے علاوہ دو تقریظیں، قہر کی مثنوی کی تقریظ اور سرور کی گلزارِ سرور کی تقریظ، اور تین دیباچے، حدائق الانظار کا دیباچہ، قواعد تذکیر و تانیث کا دیباچہ، اور مرزا کلب حسین خاں بہادر کے مجموعۂ قصاید کا دیباچہ بھی کتاب میں شامل ہیں۔ ایک خط بیخبر کا بھی درج کیا گیا ہے، جو میرزا صاحب کے خط کا جواب اور اپنی ادبی خوبیوں کی وجہ سے مرتب کی نظر میں شاملِ مجموعہ ہونے کے قابل تھا۔

غالب کے خطوں کا تیسرا مجموعہ

ابھی عودِ ہندی طبع ہونے نہ پائی تھی کہ اطرافِ ہند سے میرزا صاحب کے مجموعۂ خطوط کی مانگ شروع ہوگئی۔ میرزا صاحب نے بیخبر کو اُن کے مرتب کردہ مجموعے کی طباعت کے متعلق بار بار لکھا، اور جب سال پر سال گزرنے لگا اور کسی طرح کتاب نہ چھپی، تو انھیں اُس کی طباعت کی طرف سے مایوسی ہوگئی۔ احبابِ دہلی نے میرٹھ کے کاربردازوں کا تساہل دیکھ کر اس شرف کو خود حاصل کرنے کا تہیا کیا اور مالک اکمل المطابع دہلی، کو اخراجاتِ طباعت برداشت کرنے پر آمادہ کیا۔ اب خطوط کی فراہمی کا مسئلہ باقی رہتا تھا۔ وہ اس طرح حل ہوگیا کہ خود میرزا صاحب جو اپنی انشا کی حقیقی قدر و قیمت اور بازاری مانگ سے باخبر ہو چکے تھے، اس میں ہاتھ بٹانے کے لیے تیار ہوگئے۔ چاروں طرف اصل خطوط یا اُن کی نقول کی طلب میں خطوط لکھے گئے، اور رفتہ رفتہ کافی ذخیرہ فراہم ہوگیا۔ اس سلسلے میں خود میرزا صاحب نے جن احباب کو لکھا اُن میں سے علائی کے متعلق دستاویزی ثبوت موجود ہے

بقیہ اصحاب نے میرزا صاحب کے تقاضائی خطوط کی نقلیں نہیں بھیجیں، اس لیے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کون بزرگ تھے، جنھیں خود میرزا صاحب نے ارسالِ نقول کے لیے لکھا تھا۔ علائی کو سب سے پہلا مکتوب اُن کے لوہارو پہنچنے کے بعد لکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

"مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند احباب میرے مسودات اردو کے جمع کرنے پر اور اوس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگے ہیں، اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجا ہو وہاں بھیجدیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمہارے پاس بہت ہوں گے اگر اون کا ایک پارسل بنا کر لبیل ڈاک بھیجدو گے، یا آج کل میں کوئی ادھر آنیوالا ہو اوس کو دیدو گے، تو موجب میری خوشی کا ہوگا، اور میں ایسا جانتا ہوں کہ اوس کے چھاپے جانے سے تم بھی خوش ہوگے۔" (۱)

اس خواہش کی تکمیل میں علائی نے پس و پیش کیا۔ میرزا صاحب نے سمجھا کہ غالباً نواب صاحب نجی معاملات کی اشاعت کے خیال سے گریز کر رہے ہیں۔ اگرچہ کچھ عرصہ قبل خود میرزا صاحب نے تفتہ کو یہ لکھکر اشاعتِ خطوط سے روکا تھا کہ نجی واقعات کو منظرِ عام پر لانا کیا ضرور ہے، لیکن اب اُن کا ادبی عقیدہ بدل چکا تھا، اس لیے نواب صاحب کے اس خیال کی تردید میں تحریر کیا:

"میرے خطوط اردو کے ارسال کے باب میں جو کچھ تم نے لکھا تمہارے حسنِ طبع پر تم سے بعید تھا۔ میں سخت ہیزہ ہوا۔ اگر ہیزگی کے وجوہ لکھوں، تو شاید ایک تختہ کاغذ سیاہ کرنا پڑے۔ اب ایک بات موجزہ مختصر لکھتا ہوں۔ سنو بھائی! اگر اُن خطوط کا تم کو اخفا منظور ہو، اور شہرت تمہارے منافی طبع ہے، تو ہرگز نہ بھیجو۔ قصہ تمام ہوا۔ اور اون کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے، تو میرے دستخطی خطوط اپنے پاس رہنے دو، اور کسی نقدی سے نقل اوتروا کر، جا ہو کسی کے ہاتھ جا ہو لبیل پارسل ارسال کرو، لیکن جلد۔ خدا کے واسطے! کہیں غصہ میں آکر "عطائی تو لقای تو"

(۱) اردو ۳۹۸

کہکر اصل خطوط نہ بھیجدینا، کہ یہ امر میرے مخالف مقصود ہے۔" (۱)

معلوم ہوتا ہے کہ اس خط کے بعد بھی علائی نے ارسالِ نقول میں توقف کیا تھا؛ مگر میرزا صاحب نے پھر اس کے متعلق کچھ نہ لکھا، اور جب اُنہوں نے اصلِ خطوط بھیجکر میرزا صاحب کے ترکِ طلب کا سبب دریافت کیا، تو صبح شنبہ، ۳۰ مئی سنہ ۱۸۶۳ء کو ازراہِ معذرت لکھا:

"لَامَوْجُوْدَ اِلَّا اللہ! اوس خدا کی قسم ہا جس کو میں نے ایسا مانا ہے، اور اوس کے سوا کسی کو موجود نہیں جانا ہے، کہ خطوط کے ارسال کو مکرر نہ لکھنا از راہِ طال نہ تھا۔ طلب کے ذوق کو سست پاکر میں متوقف ہوگیا۔ متوسط ایک جلیل القدر آدمی اور طالب کتب کا سوداگر ہے۔ اپنا نفع نقصان سوچے گا۔ لاگت بچت کو جانچے گا۔ میں متوسط کو مہتمم سمجھا تھا، اور یہ خیال کیا تھا کہ یہ چھپوائے گا۔ ۳۰ رقعے ایک جگہ سے لیکر اونکو بھیجے۔ اوس کی رسید میں تقریباً اونھوں نے طلب رقعات پر تکلیف سوداگر لکھی، اور اوس سوداگر کو مفقود الخبر لکھا۔ ظاہراً کتابیں لیکر کہیں گیا ہوگا۔ (یا) کتابیں لیلے گیا ہوگا۔ یہ ۲۳ لفافے اور ۴ ۳ خط بدستور میرے بکس میں موجود و محفوظ رہیں گے۔ اگر متوسط بتقاضا طلب کرے گا اُن خطوط کی نقلیں اوس کو اور اصل تم کو بھیجدوں گا، ورنہ تمہارے بھیجے ہوئے کاغذ تم کو پہنچ جائیں گے۔" (۲)

غالباً اس خط کی روانگی کے بعد ہی مہتمم مطبع نے خطوط کی نقلیں حاصل کرلیں۔ میرزا صاحب یکشنبہ ۳۰ محرم الحرام سنہ ۱۲۸۰ھ (۲۱ جون سنہ ۱۸۶۳ء) کو اصلِ خطوط واپس کرکے لکھتے ہیں:

"میری جان! مرزا علی حسین خاں آئے اور مجھ سے ملے۔ میں نے خطوط مرسلہ تمہارے یکمشت اون کو دیے۔ اب تمہارے پاس بھیجنے کا اون کو اختیار ہے۔ رسید کا البتہ مجھے انتظار ہے۔" (۳)

(۱) اردوی: ۴۲۳ (۲) ایضاً: ۴۲۸ (۳) ایضاً: ۴۰۸

اردوی معلی

خطوط کا یہ تیسرا مجموعہ "اردوی معلی" کے اسم سے موسوم ہوا۔ مجروح نے اس کا دیباچہ اور سالک نے خاتمہ لکھا۔ کتاب دو حصوں میں منقسم ہوئی: "پہلے حصے میں صاف صاف عبارت کے خط تحریر کیے، تا طلبای مدرسہ فائدہ اوٹھائیں، دوسرے حصے میں مطالبِ مشکلہ کی تحریر اور تقریظ وغیرہ لکھی"۔(۱) غالباً پہلی بار صرف حصۂ اول شائع ہوسکا، اس لیے کہ کتب خانۂ عالیۂ رامپور میں جو نسخہ موجود ہے، وہ مکمل ہوتے ہوئے صرف حصۂ اول پر مشتمل ہے۔

اردوی معلی کا سالِ طباعت

بظاہر یہ یقین کرنے کے تمام وجوہ موجود تھے کہ خطوط کا یہ مجموعہ جلد از جلد شائع ہوگا؛ لیکن قدرت نے اس ادبی انقلاب کی اولیت کا شرف میر مہدی کو ودیعت کیا تھا۔ عود ہندی۔ ارجب سنہ ۱۲۸۵ھ کو شائع ہوگئی، اور اردوی معلی میرزا صاحب کے انتقال کے ۱۹ دن بعد ۲۱ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ، (۶ مارچ سنہ ۱۸۶۹ء) کو چھپکر تیار ہوا۔(۲) سالک نے سالِ طبع لکھا:

کیا کہوں! کچھ کہا نہیں جاتا — لب پہ نالوں کا ازدحام ہوا
صدمۂ مرگِ حضرتِ غالب — سببِ رنجِ خاص و عام ہوا
ہے یہی سالِ طبع و سالِ وفات — "آج اون کا سخن تمام ہوا"
۱۲۸۵ھ

مقامِ طباعت اور حقِ تصنیف

اردوی معلی، دلی کے مطبع اکمل المطابع میں طبع ہوا۔ حکیم غلام رضا خاں اس کے مالک، میر فخر الدین مہتمم، اور لالہ بہاری لال منشی تھے۔(۳)

کتاب کے آخر میں ایک اعلان شائع ہوا کہ اس کا حقِ تصنیف میرزا صاحب نے حکیم غلام رضا خاں کو عطا کر دیا ہے، اور ایک رقعہ بطورِ سند لکھدیا ہے؛ لہٰذا کوئی صاحب حکیم صاحب کی بلا اجازت رقعات چھاپنے کا قصد نکریں۔ اس کے بعد

(۱) اردوی: ۵ (۲) ایضاً: ۵۸ (۳) ایضاً: ۵ و ۴۱۴

میرزا صاحب کی حسب ذیل تحریر چھپی:

"پیکرِ بے روح و رواں فقیر اسد اللہ خاں غالب تخلص بیچداں کہتا ہے اور لکھدیتا ہے کہ یہ جو اردوی معلی، تصنیف فقیر مطبع اکمل المطابع دہلی میں چھاپا ہوا، سو میں نے از راہِ فرط محبت اپنا حق تالیف نور چشم، اقبال نشان، حکیم (غلام) رضا خاں کو بخشدیا ہے اور اوس حق کو خاص اون کا حق کیا۔ اب اور کوئی صاحب اگر مالک اکمل المطابع حکیم (غلام) رضا خاں کی بے اطلاع اردوی معلی کے چھاپنے کا قصد کریں گے تو موافذہ سے محفوظ نہ رہیں گے، اور فوراً حسب منشاء قانون لیتھو، سنہ ۱۸۴۷ء سزا پائیں گے۔ (مہر نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ ۱۲۶۷)"(۱)

اردوی معلی کا پہلا ایڈیشن

اردوی معلی حصہ اول، کا پہلا ایڈیشن ۴۶۴ صفحات پر مشتمل ہے جن میں ۵ صفحے مجروح کے دیباچے کے ہیں۔ پانچویں صفحے کی پندرھویں سطر سے خطوط شروع ہو کر صفحہ ۴۵۸ کی تیرھویں سطر پر ختم ہوتے ہیں، اور باقی چار سطریں خاتمۃ الطبع پر مشتمل ہیں۔ صفحہ ۴۵۹ سے ۴۶۱ کی ساتویں سطر تک سالک کا خاتمہ ہے۔ اس کے بعد جوہر کی تاریخِ طبع، اور پھر اُسی صفحے کی گیارھویں سطر سے صفحہ ۴۶۴ کی تیرھویں سطر تک تصحیح اغلاط کا نقشہ ہے۔ بعد ازاں میرزا صاحب کا اعلانِ طبعیہ حق تالیف ہے۔ کتاب خانہ رامپور کے نسخے کے شروع میں زرد رنگ کا سرورق ہے(۲) یہ میرزا صاحب کی زندگی ہی میں چھپ گیا تھا، اس لیے اس میں اُنھیں مرحوم نہیں لکھا گیا ہے۔

رقعات کی تعداد

اردوی معلی کے اس ایڈیشن کے رقعات کی کل تعداد ۴۰۷ ہے۔ ان میں ۱۰ نواب میر غلام بابا خاں بہادر کے نام، ۲۹ سیاح کے نام، ۱۰ اوکا کے نام، ۸۹ تفتہ کے نام، ۳ شاہزادہ بشیر الدین صاحب بہادر کے نام، ۵ سید بدر الدین المعروف بفقیر کے نام،

(۱) اردوی: ۴۶۴ (۲) ڈاکٹر صدیقی صاحب (الہ آباد) کے پاس اس ایڈیشن کے دو نسخے ہیں، اور دونوں کی جلد گہرے سبز رنگ کے کاغذ کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جلد کے لیے مختلف رنگوں کے کاغذ کا اہتمام کیا گیا تھا۔

۱۶ سرور مارہروی کے نام، ۲ میر سرفراز حسین کے نام، ۴۳ مجروح کے نام، ۲ شاہ عالم صاحب کے نام، ۲ صاحب عالم صاحب کے نام، ۱ نساخ کے نام، ۱ عزیز کے نام، ۱۱ قاضی عبدالجلیل جنون بریلوی کے نام، ۲ رعنا مرادآبادی کے نام، ۲ شاکر کے نام، ۱ مولوی عزیز الدین کے نام، ۱ مفتی سید عباس کے نام ۲۳ حکیم غلام نجف خاں کے نام، انجم الدین حیدر خاں کے نام، ۵ وفا کے نام، ۲ مولوی احمد حسن قنوجی کے نام، ۱۱ حکیم سید احمد حسن مودودی کے نام، ۱ تفضل حسین خاں کے نام، ۱۸ مہر کے نام، ۲ منشی نبی بخش کے نام، ۱ منشی عبداللطیف ابن منشی نبی بخش کے نام، ۱۴ بخبر کے نام، ۱ نیر کے نام، ۷ مرزا شہاب الدین احمد خاں کے نام، ۱۹ شفق کے نام، ۳ میرن صاحب کے نام، ۲ سالک کے نام، ۲ رمضان کے نام، ۲ کامل کے نام، ۴ حسین مرزا کے نام، ۱۲ یوسف مرزا کے نام، ۳۳ منشی شیونرائن کے نام، ۲ بابو ہرگوبند سہای کے نام، ۶ نواب امین الدین احمد خاں بہادر کے نام، ۵۶ علائی کے نام، ۱ فرخ مرزا کے نام، ۲ میکش کے نام، ۱ حکیم غلام مرتضیٰ خاں کے نام، ۱ حکیم غلام رضا خاں کے نام، ۳ ماسٹر پیارے لال کے نام، ۲ جوہر کے نام، ۱ منشی ہیرا سنگھ کے نام، اور ۲ مشتاق کے نام ہیں۔

اردوئے معلی حصہ دوم

غالباً میرزا صاحب کے یکایک انتقال کے صدمے نے مہتممین اشاعتِ اردوئے معلی کو حصۂ دوم کی ترتیب و طباعت کی طرف سے برداشتہ خاطر کر دیا، اور یہ حصہ دیباچے کے وعدے کے باوجود شائع نہ ہو سکا۔

سنہ ۱۸۹۹ء میں مولوی عبدالاحد مرحوم، مالکِ مطبعِ مجتبائی دہلی، نے اردوئے معلی کی اشاعت کا ارادہ کیا۔ خواجہ حالی مرحوم نے حصۂ دوم کے لیے کچھ مواد عطا فرمایا، جو مہتممِ طباعت نے حصۂ دوم کے نام سے آخر میں شامل کر دیا۔ خود عبدالاحد مرحوم کے الفاظ میں "اس حصہ میں خاصکر وہ رقعات ہیں جن میں انھوں نے (میرزا صاحب نے) لوگوں کو اصلاحیں دی ہیں، یا شاعری کے متعلق کوئی ہدایت کی ہے، یا کوئی نکتہ بتایا ہے، اور بعض کتابوں کے دیباچے اور ریویو بھی ہیں۔"

چونکہ مجروح نے بھی تقریباً اسی قسم کے خطوط مرتب کرنے کا وعدہ کیا تھا، اس لیے کچھ بعید نہیں ہے کہ مجروح کا ذخیرہ خواجہ صاحب کو مل گیا ہو، اور مہتمم مطبع نے اس حقیقت کا اظہار کیے بغیر کتاب چھاپ دی ہو۔

نسخۂ مجتبائی کا حصۂ دوم ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں، سطروں کا ایک مختصر تقریبی نوٹ ہے۔ اس کے بعد سراج المعرفت اور حدائق الانظار کے دیباچے ہیں۔ بعد ازاں شاہ ظفر کی ایک کتاب اور سرور کی گلزارِ سرور کی تقریظیں ہیں۔ ان کے بعد دیوانِ ذکا، میرزا کلب حسین خاں نادر بنارسی کی ایک کتاب، نیز رسالۂ تذکیر و تانیث مصنفۂ صغیر بلگرامی کے دیباچے ہیں۔ یہ تمام دیباچے اور تقریظیں صفحات ۱-۱۳ پر درج ہیں۔ ان کے بعد اسی صفحے سے اصلاحی خطوط شروع ہوتے ہیں، جن میں ۲۴ خطوط تفتہ کے نام، ۱ ماسٹر پیارے لال کے نام، ۵ ذکا کے نام، ۵ سیاح کے نام، ۲ شاہزادہ بشیر الدین کے نام، ۱ ہشیار کے نام، ۱ مولوی کرامت علی کے نام، ۱ جوہر کے نام، ۱ منشی ہیرا سنگھ کے نام، اور ۲ مجروح کے نام ہیں۔

ضمیمۂ اردوی معلی

سنہ ۱۹۲۹ء میں شیخ مبارک علی صاحب، تاجر کتب لاہور، نے اردوی معلی کے حصۂ اول و دوم کے ساتھ سرخوش کا مرتب کیا ہوا ایک ضمیمہ بھی شائع کیا ہے۔ یہ ۲۳ خطوط پر مشتمل ہے، جن میں سے ۲۲ قدر بلگرامی کے نام اور ایک فسخ لطیف احمد بلگرامی کے نام ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام خطوط مولوی علی اصغر صاحب بلگرامی نے مولانا حسرت موہانی کے ماہانہ رسالے "اردوی معلی" (علیگڑھ) کے دسمبر سنہ ۱۹۰۷ء کے پرچے میں شائع کیے تھے۔ سرخوش نے اُس پرچے کے حوالے بغیر خطوط نقل کر دیے ہیں۔

اس ضمیمے کے آغاز میں دو خط اور شامل کیے گئے ہیں، جو پبلشر کو شفیق مکرم آغا محمد باقر، نبیرۂ حضرت آزادِ دہلوی سے دستیاب ہوئے تھے۔

میرزا صاحب کے خطوط کا آخری مجموعہ: مکاتیب غالب

مذکورۂ بالا مجموعوں کی اشاعت سے ساٹھ پینسٹھ برس بعد ریاستِ عالیۂ رامپور کی طرف سے میرزا صاحب کے اُن خطوط کا مجموعہ "مکاتیبِ غالب" کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے، جو موصوف نے نواب فردوس مکاں، نواب خلد آشیاں یا وابستگانِ دربار کو لکھے تھے۔

سرکارِ رامپور سے میرزا صاحب کی مراسلت بارہ سال تک جاری رہی۔ اس عرصے میں اہلِ رام پور سے بھی اُن کے خاصے تعلقات قائم ہو گئے تھے، اور متعدد اصحاب سے خط کتابت بھی رہتی تھی۔ لیکن سوءِ اتفاق سے اُن کی مراسلت کا بڑا حصہ ضائع ہو گیا۔ اس مجموعے میں صرف وہ خط مرتب کیے گئے ہیں، جو دارالانشا میں محفوظ تھے۔

مکاتیب کی تعداد

مجموعۂ ہٰذا کے مکاتیب کی تعداد ۱۲۹ ہے۔ اس میں سے ۴۳ خط نواب فردوس مکاں کے اور ۳۷ نواب خلد آشیاں کے حضور میں پیش ہوئے تھے۔ بقیہ میں سے ۲ صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر کے نام، ۲ صاحبزادہ سید عباس علی خاں بہادر بتاب کے نام، ۷ منشی سیلچند میر منشی کے نام، ۱ خلیفہ احمد علی احمد رامپوری کے نام، اور ۱ مولوی محمد حسن خاں ایڈیٹر دبدبۂ سکندری کے نام ہے۔

نواب فردوس مکاں کے نام کے خطوں میں ۴ فارسی زبان کے اور بقیہ ۳۹ اردو کے ہیں۔ اور چونکہ مجموعے میں ایک فارسی قصیدہ مستقل نمبر کے تحت درج ہوا ہے بنابریں اُن کے نام کے خطوں کی تعداد ۴۴ اور کل مکتوبات کا شمار ۱۳۰ ہو گیا ہے۔

گم شدہ خطوط کی تعداد

نواب فردوس مکاں اور نواب خلد آشیاں کے فرامین کے مسوّدوں نیز میرزا صاحب کے زیرِ نظر مکاتیب میں تقریباً ۱۳۵ ایسے خطوں کے حوالے ملتے ہیں جو امثلہ میں موجود نہیں ہیں۔ یہ سب خط بھی محفوظ ہوتے، تو مکاتیبِ غالب کی تعداد ۳۶۴ ہوتی،

جو اور بڑھ جاتی، اگر اُن کی اہلِ شہر سے خط کتابت بھی دستیاب ہوسکتی۔ لیکن

در دستِ دیگر لیست سفید و سیاہِ ما

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"بحضورِ نواب صاحبِ والا مناقبِ عالی شان، قلزمِ فیض و عمانِ احسان، جناب نواب محمد یوسف علی خان بہادر، دَامَ اِقْبَالُہٗ مقبول باد" (۱)

(نواب سید یوسف علی خاں بہادر، فردوس مکان، طَابَ ثَرَاہُ، نواب سید محمد سعید خاں بہادر، ابنِ نواب سید غلام محمد خاں بہادر، ابنِ نواب سید فیض اللہ خاں بہادر، ابنِ نواب سید علی محمد خاں بہادر، بانیٔ ریاستِ روہیلکھنڈ کے فرزندِ اکبر تھے۔ آپ جناب عالیہ فخر النسا بیگم صاحبہ، بنتِ محمد نور خاں بڑیچ، ہمشیرزادہ نواب سید فیض اللہ خاں بہادر، کے بطن سے دوشنبہ ۵ ربیع الثانی ۱۲۳۱ھ ہجری (۵ مارچ ۱۸۱۶ء) کو متولد ہوئے، اور دوشنبہ ۱۲ رجب ۱۲۶۱ھ، (۷ دسمبر ۱۸۴۵ء) کو مسندِ حکم رانی پر قدم رکھا۔ جلوس سے دو سال دو ماہ بعد، ۱۴ رمضان ۱۲۷۳ھ، (۹ مئی ۱۸۵۷ء) کو مشہور واقعۂ غدر رونما ہوا۔ آپ نے اس فتنے کے فرو کرنے میں حکومتِ ہند کی اعانت کر کے، بسلسلۂ اعترافِ خدمات بیس ہزار روپے کا خلعت، ایک لاکھ بیس ہزار روپے سالانہ آمدنی کا جدید علاقہ، اور "فرزندِ دلپذیر دولتِ انگلشیہ" کا خطاب حاصل کیا۔ سلامی گیارہ ضرب توپ کے بجائے تیرہ ضرب مقرر کی گئی، اور مراسلت میں القاب و آداب "نواب صاحب مشفق بسیار مہربان

(۱) یہ عبارت میرزا صاحب عرائض کے لفافوں پر لکھا کرتے تھے۔

کرم فرمائے مخلصان سلامت، بعد از شوقِ ملاقاتِ مسرت آیات مشہودِ خاطرِ الطاف ذخائر میدارد" طے پایا۔ آپ نے خود اس عطیے کی حسبِ ذیل تاریخ ارشاد فرمائی ہے:

جب گورمنٹ سے ہوا حاصل ملک مجکو بصیغۂ انعام
ناظم، از روئے ہمتِ عالی سالِ بخشش ہے "بخششِ حکام"

آپ نے عربی و فارسی کی باقاعدہ تعلیم پائی تھی۔ فارسی میں خلیفہ غیاث الدین عزت رامپوری مصنفِ غیاث اللغات، اور میرزا غالب سے، اور علومِ عربیہ و حکمیہ میں مفتی صدر الدین خاں آزردہ اور مولانا فضلِ حق خیر آبادی سے تلمذ تھا۔ تخت نشینی کے بعد شعر و سخن کا مشغلہ بھی شروع کر دیا تھا۔ ناظم تخلص فرماتے تھے، اور میرزا غالب سے مشورۂ سخن تھا۔ نکتہ رس ذہن، رنگین و شوخ طبیعت، اور اعجوبۂ روزگار استاد نے ان کو زبانِ اردو کا ایک بلند پایہ شاعر بنا دیا ہے۔ مومن و غالب کے بعد ان کی نظیر "اِلَّا مَا شَاءَ اللہ" کا حکم رکھتی ہے۔ دیوان دو بار شائع ہوا، لیکن اب کمیاب ہے۔

آپ فنونِ سپہگری میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ جسم ورزشی اور مضبوط اور چہرہ نہایت خوش قطع تھا۔ داڑھی صاف اور مونچھیں باریک رکھتے اور اکثر رنگین و زرتار لباس زیبِ تن فرمایا کرتے تھے۔

آپ نے دس سال چند ماہ حکومت کر کے، جمعے کے دن ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ (۲۱- اپریل ۱۸۶۹ء) کو اس دارِ فانی سے رحلت کی، اور قلعۂ معلے کے اندر امام باڑے میں اپنے والدِ ماجد کے پہلو میں مدفون ہوئے۔

(۱)

بحضورِ سراسر سرور، جنابِ مستطاب، نوابِ ہمایون القاب، جہانیان کام بخش، جہان جہاں کامیاب، دَامَ بَقَاءُہٗ بِقُبُوْلِ الْاِقْبَال!

سجدۂ فشانیٔ قلم با پوزش گستریٔ عریضہ نگار تو اُم افتادہ۔ ہمانا آن درگاہِ اسکندر

و دارا گزرگاه پیوسته در نظر است، که هم از دور در زمرهٔ نزدیکان بندگی بجای آورد- سپاس این معنی خود از اندازه افزون تواند بود، که بعنوان روشناسی ذرّه با مهر، و آشنائی قطره با بحر، گدا را با شاه بیگانگی درمیان نسبت- در آن روزگار رنگین تر از نوبهار، که به فرّ فرخندگی وجودِ مسعود، و ساده با سپهر ساده دم از برابری زد، نگاشتن و روان داشتنِ قطعهٔ تاریخ جلوس[۵]، به توانائی آن دانائی و روان آسائی آن شناسائی صورت پذیرفت- اکنون که گیتی خدای قلمرو دانش، آن به فرتاب تاب نظر با برجیس جلیس، و آن به فروزهٔ فرزنش عمل با عقل فعّال همال، امیرالدوله مولوی حافظ محمد فضل حق خان بهادر[۶] به بندهٔ فرمان پذیر فرمان فرستادند: که غالب به پرستش گری کمر بندد، و در مشاطگی شاهدانِ افکار حسنِ خدمت عرضه دهد، اندیشهٔ مهربیشه درنگ برنتافت، و هم امروز که فردای ورودِ نوازش نامهٔ مولاناست، این نامه که نخطِ بندگی ماناست، روان داشته آمد- چشم داشت آنست که دوری راه تفرقه درمیان نیندازد، و پس در حاضرانِ آن حضرت و دعاگویانِ دولت بشمار آیم- زیاده حدّ ادب- بخت ازل آورد در روز افزونی دولتِ ابدپیوند باد!

عرضداشتِ هوا خواه، اسدالله- نگاشته و روان داشته چارشنبه ۲۹ جنوری ۱۸۵۶ء- (مهر: نجم الدوله دبیرالملک اسدالله خان بهادر نظام جنگ، ۱۲۶۷)[۷]

(۲)

همانا، اگر گوهرِ جان فرستم — به نواب یوسف علی خان فرستم
ز نامش، نشانی بعنوان طرازم — ز مدحش، طرازی بدیوان فرستم
ز دخلش، حسابی به معدن نویسم — ز بذلش، صلائی بعمان فرستم
ز لطفش، که عامست در کام بخشی — نویدی به گبر و مسلمان فرستم
ز لطفش، که خاصست در ملک گیری — مثالی بشیراز و شروان فرستم
زهی! شهسواری، که گردِ سمندش — پیِ سرمهٔ چشمِ حسّاقان فرستم
رود سام، چون، بهر پیکار سویش — عزا نامه سوی نریمان فرستم

درش را بود پایه در خیالم — نگه سویش از دور پنهان فرستم
کلیم، ار، عصا ارمغانم فرستد — من این ارمغان بهر دربان فرستم
وجودش بود فخر اجرام و ارکان — تحیّت باجرام و ارکان فرستم
زجودش، بود وعده بازیرستان — بشارت به برجیس و کیوان فرستم
زمویش، شمیمی به جنت رسانم — زکویش، نسیمی برضوان فرستم
هم از شرقِ اشراقِ دی، آفتابی — باختر شناسانِ یونان فرستم
هم از روی نیکوی دی، ماهتابی — به شب زنده دارانِ کنعان فرستم
اگر تیز گردد تیرش از سینهٔ من — دل از سینه همراهِ پیکان فرستم
وگر سر ازین راه دزدد جبین را، — چو گویش درین ره بچوگان فرستم
سرشت از خزانست بدخواهِ او را — سه فصلِ دگر هم بدینسان فرستم
هم از آتشِ دوزخ آرم تموزش — هم از زمهریرش زمستان فرستم
وگر تا بهاران لبختی به میرد — در آردی بهشتش بزندان فرستم
سپه چون کشد، گر نه از ناتوانی — توانم که خود را بمیدان فرستم
درین انزوا، از نفسهای گیرا — برایات، آیاتِ قرآن فرستم
بتوقیعِ فضلِ حق، آن عینِ معنی، — که "آباد بر وی فراوان فرستم
گزشت اندر اندیشه، کز نامه رنجی — بدان قلزمِ فیض و احسان فرستم
بدل گفتم: "البته کار لیست مشکل؛ — نباید که این نامه آسان فرستم"
سگالش چنین رفت و در کار سازی — که فرخ بود، چون بفرمان فرستم
فرستادم، اما نیامد جوابی — که تا هرچه فرمان رسد آن فرستم
ندانم که شورِ فغانِ گدا را — چسان بازتا گوشِ سلطان فرستم
بدل گفتم: "آری، فرستاده باشم — گر از راهِ چاکِ گریبان فرستم
وگر جادهٔ ره نمایان نه گردد — هم از جیبِ چاکی بدامان فرستم
بدان تاروائی دهم کارِ خود را — زخونابه موجی بمژگان فرستم

دمم در تنِ نی دمِ آتشین را — فروزنده شمعی بایوان فرستم
برفتارِ ناز اندر آرم قلم را — تدروی بصحنِ گلستان فرستم
سخن کوته. آن به که از نظم جزوی — بدیوانِ آن صدر یگهان فرستم
فرستم ولیکن خرد چون پسندد — که برگِ گیاهی به بستان فرستم
گرفتم که رنگین خیالم بگیتی — شقایق به بنگاهِ نعمان فرستم
گرفتم که بحرِ روانم به معنی — گهر جانبِ ابرِ نیسان فرستم
گرفتم که روشن روانم بدانش — چراغی به مهرِ درخشان فرستم
درین پرده خواهم که از موبمو سخن — سلامی بسوی سلیمان فرستم
نشستم که خدمت گزارانِ لب — پیِ دعوی خویش برهان فرستم
بشب بستم این نقش و در بندِ آنم — که حرزِ دعا بامدادان فرستم
بقا، بهرِ داور، ز داور خواهم — به "آمین" خروش از سرشان فرستم[۱]

(۳۷)

بحضورِ پُرظهور، حضرتِ نوابِ معلّی القاب، جاودان کامیاب، ولیِّ نعمتِ آیهٔ رحمت، دامَ اِقبالَهٗ!

سپاس بجا می آورد، و پوزش همی گسترد. آن بارگاهِ سپهر کارگاه را قبلهٔ حاجات میداند، و بهنجارِ سرگزشت حکایتی بعرض میرساند. سه شنبه ۲۷ جنوری نامهٔ مولینا وبالفضل اولینا[۲] بمن رسید. چهارشنبه ۲۸ جنوری عرضداشت روان داشتم. چون دو هفته گزشت، و سررشتهٔ ژاک درین بند دستِ جدید استوار نماند، گفتم: "مگر نرسیده باشد". دی که چهارشنبه یازدهم فروری ۱۸۵۰ بود، چاشتگاه قصیدهٔ بقصدِ اظهارِ فرمان پذیری فرستادم. شامگاه سرهنگِ یام "منشورِ عطوفت" آورد. برمردمکِ دیده سودم، و خرده جان نثار کردم. تانورد از هم نگشودم، دو ورق از فهرستِ گنجینهٔ اسرار، یعنی اوراقِ اشعارِ گهربار، و هفتهٔ دوصد و پنجاه روپیه در آن نورد یافتم. دفترِ شعر سجلِ اعتبارِ من شد، و زرِ آن هفته بعرضِ وصول آمد. کرم در بندهٔ پروری بهانه میجوید، ورنه این افتتاح

بشیرنی نیاز نداشت۔ کریمان بندہ را بہ نمک ہمی پرورند، ولیّ نعمت را بندہ بشکر پروردن آئین است۔ شکرِ این منکر بہبودۂ جانِ شیرین فروگذاشتم۔ و این نامہ بہر آنکہ رسیدنِ عطیّہ حالی گردد، بدین زودی نگاشتم۔ اشعار خود بہنگامِ خویش خواہد رسید، و این سررشتہ ہیچگاہ از ہم نخواہد گسست۔ زیادہ حدِّ ادب۔ نیرِ دولت و اقبال سرچشمۂ فروغِ بی زوال باد!

غالب

پنجشنبہ، ۱۲ فروری ۱۸۵۷ء۔

(۴)

حضرت ولیّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

آداب بجالاتا ہوں۔ غزلوں کے مسودات کو صاف کرکر حضور میں بھیجتا ہوں۔ مسودات اپنے پاس رہنے دیتے ہیں، اس نظر سے کہ اگر احیاناً ڈاک میں لفافہ تلف ہوجائے، تو میں پھر اُس کو صاف کرکر بھیجدوں؛ ورنہ موقع حک و اصلاح مجھے کیا یاد رہے گا؟

میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسمِ سامی اور نامِ نامی تخلص رہے۔ ناظم، عالی، انور، شوکت، نیساں، ان میں سے جو پسند آئے وہ رہنے دیجے۔ مگر یہ نہیں کہ خواہی نخواہی آپ ایسا ہی کریں۔ اگر وہی تخلص منظور ہو، تو بہت مبارک۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو قیامت تک!

عنایت کا طالب، غالب۔ روز یکشنبہ، ۱۵ فروری سنہ ۱۸۵۷ء

(میرزا صاحب نے ۸ مارچ ۱۸۵۷ء کو ایک عریضہ ارسال کیا تھا، جو ۱۱ ماہِ مذکور کو رامپور پہنچا۔ اس کا صرف لفافہ شاملِ مثل ہے، اور اُس کی پشت پر تحریر ہے:

"عرضی حسب الحکم چاک نمودہ شد۔ ۱۹ رجب سنہ ۱۲۷۳ھ")

میرزا صاحب نے یکم اپریل سنہ ۱۸۵۷ء کو ایک اور عریضہ ارسال کیا تھا، جو ۳ اپریل کو رامپور پہنچا۔ مثل میں اس کا بھی صرف لفافہ شامل ہے، اور اُس کی

پشت پر تحریر ہے: "عرضی از دستِ مبارک چاک شد، و بندِ غزلیاتِ مرسلہ در حضور ماند۔ ۹ شعبان سنہ ۱۲۷۳ھ"۔

(۵)

جناب عالی، کچھ کم مہینا ہوا کہ میں نے حضور کی غزلوں کو دیکھ کر خدمت میں روانہ کیا ہے، اور اوس کے پہنچنے سے اطلاع نہیں پائی۔ اب ڈاک میں خط تلف بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ اس واسطے میں متردد ہوں، اور مُدّعا اس تحریر سے یہ ہے کہ اگر وہ لفافہ نہ پہنچا ہو، تو میں اوس مسودہ کو پھر صاف کر کر روانہ کروں۔ زیادہ حدِ ادب۔ از غالب۔ نگاشتہ صبح پنجشنبہ، ۲۷ شعبان سنہ ۱۲۷۳ ہجری(۱)

(۶)

جنابِ عالی، آداب بجا لاتا ہوں۔ اور عرض کرتا ہوں کہ اچورہ وار پہنچا، مگر لُٹا ہوا، اور بھیگا ہوا، اور بھاگتا ہوا۔ گوجروں نے اوسے لوٹ لیا۔ روپیہ، کمّل، سب لے لیا۔ خط اوس دار و گیر میں گر پڑا، بھیگ گیا۔ لفافہ مجھ تک نہ پہنچا(۲)، خط مع ہنڈوی کے پہنچا۔ خط میں سے القاب بہ تکلف پڑھا، اور یہ جملہ "سفتجۂ مبلغ دو صد و پنجاہ روپیہ" پڑھا گیا، اور باقی خیر و عافیت۔ "تکرر آنکہ" اس کے بعد جو کچھ لکھا تھا، اوس میں سے "حولوی" یہ لفظ، اور بعد ایک لفظ کے "نانصاحب" یہ پڑھا گیا، اور کچھ نہیں۔ مجھکو غم یہ ہے کہ غزلہای اصلاحی اور دیوانِ اردو کی رسید میں نے نہ پائی(۳)۔

ہنڈوی کا بھینہ وہ حال جو میرے خط کا تھا۔ کچھ پڑھا جاے، کچھ نہ پڑھا جاے۔ آپ کا نام اور ڈھائی سو روپیہ یہ پڑھا گیا۔ چونکہ مہاجن مجھکو جانتا تھا، اوس نے اوس بھیگے ہوئے کاغذ کو اپنی چٹھی میں لپیٹ کر رامپور اوس مہاجن کے پاس بھیجا ہے۔ جب وہ صحیح کر کر بھیجیگا، تب وہ مجھکو روپیہ دیگا۔ اوس کے صحیح کرنے میں کیا تامل ہے؟ میں نے صرف بطریقِ اطلاع لکھا ہے۔ اور غزلوں کی اور دیوان کی رسید اور جو اس خط میں "تکرر آنکہ" (کے)(۴) بعد مطالب مندرج تھے، وہ پھر ایسے

(۲) اصل میں "نہ پہنچا" ہے لیکن یہ سہو قلم معلوم ہوتا ہے کیونکہ اسی سطر میں "لفافہ [illegible] درست لکھا ہے۔
(۳) یہاں سہواً لفظ "کے" ساقط معلوم ہوتا تھا اس لیے اضافہ کر دیا گیا ہے۔

ہی باریک کاغذ پر لکھ کر اس ساہوکار کو دیجے گا، اور اس کو تاکید کیجے گا کہ اس کو بھیجدے۔ یہاں کے ساہوکار نے میری خاطر سے اس رقعہ کو اپنی[1] چٹھی میں روانہ کیا ہے۔ غالب۔ پنجم ذی الحجہ[2]۔

(۷)

بوالا خدمت، رفعات درجت، جناب نواب صاحب والا مناقب عالیشان، قلزم فیض ومحیط احسان، عزّ نصرہٗ ودام مُلکہٗ!

آداب نیاز بجامی آرد، ونیاز مندانہ عرضہ می دارد۔ در زمانِ چیرہ دستیِ کورنگانِ سیاہ رُوسیاہ سررشتۂ پیام از ہم گسست۔ ناچار بفرستادنِ نامہ بر، رساندنِ نامہ و پیام صورت بست۔ درین روزگار، کہ فرمانِ داورانِ دادگر روائی وسلسلہ آمدشد نامہ رسائی یافت، نامہ در پیام روان داشتہ شد، و نارسیدنِ پاسخ آن راچنان پنداشتہ شد، کہ مگر آن نیایشنامہ نرسیدہ باشد، یا فرطِ احتیاط مانعِ تحریرِ جواب گردیدہ باشد۔ ہر آئینہ در دل چنان گزشت کہ درین بار بدانسان سخن سرای توان گشت، کہ سرگزشتِ من از دلی نعمت نہان، وحجابی درمیان نماند۔

حالئ رای جہان آرای باد کہ دیرینہ نمکخوارِ سرکارِ انگریزم۔ واز سرآغازِ سالِ یکہزار وہشت صد وشش، کہ دران گاہ شمارِ سنینِ عمرِ من از وہ نگزشتہ بود، بعوضِ جاگیرِ عمِّ حقیقیِ نسبیِ خود، نصراللہ بیگ خان بہادر[3]، کہ باجمعیتِ رسالۂ چہار صد سوار بجیتِ جرنیل لاڈو[4]، لیک بہادر[5] در فتحِ ہندوستان کوششہای نمایان کردہ، و پرگنہ "سونک سونسا" بقیدِ حینِ حیات جاگیر یافتہ، و ہمدران عہد بمرگِ ناگاہ از جہان رفتہ بود، بفرمانِ جرنیل لاڈو لیک بہادر ومنظوریِ گورمنٹ، مشتِ زری شاملِ جاگیرِ عمِّ سببیِ من نواب احمد بخش خان بہادر[6]، در وجہِ معاشِ من منجملۂ زدِ استمراریِ سرکاری، کہ بذمۂ نواب احمد بخش خان بہرِ دوام واجب الادا بود، قرار یافتہ

(۴) میرنا صاحب نے اس لفظ کا املا ہر جگہ لاڑو لکھا ہے، حالانکہ صحیح تلفظ لارڈ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں دلّی والے اس لفظ کو ڑ اور و کے ساتھ بولتے تھے۔

چون جانشینِ احمد بخش خان[۱] کیفیر کردار یافت، و جاگیر بسرکار باز یافت شد، رسیدنِ آن وجہ مقرری از خزانۂ کلکتریٔ دہلی صورت پذیرفت، چنان کہ تا انجام اپریل سنہ ۱۸۵۵ از کلکتریٔ دہلی یافتہ ام، و از منشیٔ خود آشکار است کہ حال چیست. پیوندِ تعلق با بہادر شاہ[۲] جز آن نبود، کہ از ہفت ہشت سال بتحریرِ تاریخِ سلاطینِ تیموریہ، و از دو سہ سال بہ اصلاحِ اشعارِ شہریاری پرداختم. درین ہنگامہ خود را بکنار کشیدم. و بدین اندیشہ کہ مبادا، اگر یک قلم ترکِ آمیزش کنم، خانۂ من بتاراج رود، و جان در معرضِ تلف افتد، بباطن، بیگانہ و بظاہر آشنا ماندم. ہرگاہ شہر بدستِ سپاہِ انگریز فتح شد، ہمہ جاگیرداران و پنشنداران[۳] از شہر بدر رفتند، چنانکہ تا امروز آوارۂ دشت و کوہ اند. من از جا نہ جنبیدم، و ہم چناں گوشہ گیر ماندم. درین بندوبست کہ خاصہ از بہرِ سیاستِ مجرمان ست، و تحقیقاتِ جرم از روی دفترِ قلعہ و اظہارِ مخبران می کنند، ہیچ گونہ آلایشِ دامنِ من پدید نیامد، و دارد گیر و باز پرس رد نہ داد. بودنِ من در شہر از حکام نہان نیست؛ اما چون پرسشی درمیان نیست، لاجرم محفوظ ماندہ ام. می بایست کہ خود سلسلہ جنبان گشتمی، و یا حکام پیوستمی. درین بارہ سخن آنست کہ درین فرمانداں با ہیچ کس سابقۂ معرفتی ندارم؛ و معہذا، ہنوز موقع و محلِ آن نمی نگرم کہ نامہ نویسم، و خواہشِ ملاقات بمیان آورم. راستی اینکہ درین فتنہ و آشوب خدمتی بجا نیاوردہ ام. لیکن مقامِ شکر است کہ بہ تقدیم نرسیدنِ خدمت از راہِ بیدستگاہی است، و ذریعۂ اخلاص و خلوص ہمان بیگناہی است.

حالِ خود را، اگرچہ پرسش از جانبِ آن والا مناقب نبود، گفتم[۴]، و خون میخورم کہ صحت و عافیتِ ذاتِ ہمایونِ اقدس، کہ یارب! جاودان سلامت باد، چگونہ دریابم. ہمدرین کنج کہ مسکنِ من ست، شنیدہ ام کہ والا شان زین العابدین خان بہادر[۵] بشہر آمدہ اند. نیازمندیٔ من بامرحومی نواب عبداللہ خان بہادر[۶] و مہروزیٔ

۳) میرزا صاحب اس لفظ کو ہمیشہ "س" سے لکھتے ہیں. ورنہ صحیح تلفظ پنشن ہے۔

من با اصغر علی خان مرحوم[۱] و محبت و خلّتِ من با نواب عبدالرحمٰن خان بہادر مغفور[۲] کجا دیدہ اند، و آن مدارج کی در نظر دارند، کہ ایشان را در ضمیر میگزشت کہ گدای گوشہ نشین را باید دید؟ من خود پائی کہ رفتار داشتہ باشد، ندارم، و از زاویہ بروں آمدن نتوانم۔ بہ نگاشتنِ این نامہ، زحمتِ اوقاتِ ملازمان از آن رُو روا داشتہ ام کہ اگر نفرستادنِ نامہ محض از روی احتیاط است، ہویدا گردد، کہ در عنایت تفریط و در رعایت افراط است۔ چشم دارم کہ بمشاہدۂ سوادِ نوازشنامہ، فروغِ نظر اندوزم۔ شغلِ شعر و سخن، ہر آئینہ یقین دارم کہ درین چنین فتنہ و آشوب دل بدان کار چگونہ گراید؟ دولت پائندہ و نصرت طرب فزائندہ باد!

از اسداللہ غالب۔ نگاشتہ و روان داشتہ پنجشنبہ ۱۴ جنوری سنہ ۱۸۵۸ ۔

لہ

دبیرانِ خاص، بر عنوانِ نامہ ہای پیشین، نشانِ کلیۂ این درویشِ دلریش عقبِ مسجدِ جامع نبشتہ اند۔ و من از ہفت ہشت سال، در محلّۂ بلی ماری ماندم۔ پس نشانِ این محلہ نگاشتہ شود[۳]۔

(۸)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!(۴)

منشورِ عطوفت کے دیکھنے سے زندگی کی صورت نظر آئی۔ مخمس اور غزلوں کے پہنچنے کی اطلاع پائی۔

یہ بھی ایک سخنش کا بہانہ پیدا کرنا ہے؛ ورنہ حضور کے کلام کو اصلاح کی احتیاج کیا ہے! میری کیا سخنوری اور سخن سرائی ہے! آپ کی قدردانی، بلکہ قدر افزائی ہے۔ تکلف ہے، اگر کہوں کہ تا قیامت رہو۔ بے تکلف دعا یہ ہے کہ خدا کرے ایک سو بیس برس تک سلامت رہو!

اس قرینے سے کہ بسبب کم فرصتی کے ان کا ملاحظہ نکرنا مرقوم ہوا، رسیدنِ کے دیوان اور اس کتاب کا پہنچنا معلوم ہوا۔ دیوان کے دیکھنے نہ دیکھنے میں

(۴) اس خط میں القاب کے ختم ہوتے ہی اگلی سطر سے مطالب شروع کر دیے ہیں۔

آپ کو اختیار ہے۔ مگر یہ چار جزو کا رسالہ جواب بھیجا ہے، اس کا دیکھنا ضرور درکار ہے۔ فارسی، قدیم اور پھر حُسنِ معنی اور صنعتِ الفاظ؛ با این ہمہ ہزار کی احتیاط، اور ہر بات کا لحاظ (۱)۔

جنابِ عالی، طرفہ معاملہ ہے۔ خدا کا شکر ہے، اور اپنی قسمت کا گلہ ہے خدا کا شکریہ کہ باوجودِ تعلقِ قلعہ کسی طرح کے جُرم کا بہ نسبت میرے احتمال بھی نہیں؛ قسمت کا گلہ یہ کہ عطائی پنشنِ قدیم کا حُکام کو خیال بھی نہیں۔ یہ نومبر سنہ ۱۸۵۸ اُنیسواں مہینا ہے۔ گویا بن کھائے جیتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جنوری شروع سال میں پنشداروں کو روپیہ ملے گا۔ دیکھیئے، کیا نیا گل کھلے گا! پہلی نومبر کو یہاں اشتہارِ عام ہوگیا ہے، کہ اب قلمروِ ہندوستان میں عملِ ملکۂ معظمۂ عالیمقام ہوگیا ہے۔ میں پہلے سے مدّاحوں میں اپنا نام لکھوا چکا ہوں، اور وزرای ملکۂ دارا دربان کے دو سارتی (۲) ٹکٹ پا چکا ہوں۔ اگر اس اجمال کو بہ تفصیل معلوم کیا چاہیئے، تو اسی کتاب، موسوم بہ "دستنبو" میں دیکھا چاہیئے۔ خوشنودی کا طالب، غالب۔ نگاشتہ، روزِ یکشنبہ ہفتمِ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء۔

(۹)

خداوندِ نعمت سلامت! (۳)

جو آپ بن مانگے دیں، اوس کے لینے میں مجھے انکار نہیں، اور جب مجکو حاجت آپڑے، تو آپ سے مانگنے میں عار نہیں۔

بارِ گرانِ غم سے پست ہوگیا ہوں۔ آگے تنگدست تھا، اب تہیدست ہوگیا ہوں۔ جلد میری خبر لیجیے، اور کچھ بھجوا دیجیے۔ عنایت کا طالب، غالب ۱۲

چارشنبہ یازدہم ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۵ ہجری و ۱۷ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء (۴)

(۲) میرزا صاحب نے لفظ سارٹینکٹ میں پہلی "ٹ" کو "ت" تحریر کیا ہے۔

(۳) اصل میں القاب کے بعد اُسی سطر سے مطالب شروع کر دیے گئے ہیں۔

(۱۰)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد آداب بجا لانے کے عرض کرتا ہوں کہ منشور یافت لکھا ہوا ۲۵ نومبر کا جمعہ کے دن تیسری دسمبر کو اس دعاگوی دولت کے پاس پہنچا۔ ڈھائی سو روپیہ کی ہنڈوی معتمد کے حوالہ کی گئی۔ آج یا کل روپیہ آجائیگا خاطرِ عاطرِ اقدس جمع رہے۔

میرے حاضر ہونے کو جو ارشاد ہوتا ہے، میں وہاں نہ آؤں گا، تو اور کہاں جاؤں گا؟ پنشن کے وصول کا زمانہ قریب آیا ہے۔ اس کو ملتوی چھوڑ کر کیونکر چلا آؤں؟ سنا جاتا ہے، اور یقین بھی آتا ہے کہ جنوری آغاز سال ۵۹ عیسوی میں یہ قصہ انجام پائے۔ جس کو روپیہ ملنا ہے اوس کو روپیہ، جس کو جواب ملنا ہے اوس کو جواب ملجائے ۱۲

حضور نے یہ کیا تحریر فرمایا ہے کہ ان بارہ غزلوں کی اصلاح میں کلام خوش مطلوب ہے، اگلی غزلوں کی طرح نہوں؟ مگر اگلی غزلوں کی اصلاح پسند نہ آئی، اور اون اشعار میں کلام خوش نہ تھا؟ حضرت کا تو اون غزلوں میں بھی وہ کلام ہے کہ شاید اوروں کے دیوان میں ویسا ایک شعر بھی نہ نکلے گا۔ میں بقدر اپنی فہم و استعداد کے کبھی اصلاح میں قصور نہیں کرتا۔ زیادہ حدِ ادب۔ عرضداشتِ غالب۔ معروضۂ جمعہ ۲۶ ربیع الثانی سنہ ۵۵ و ۳ دسمبر ۵۸ء۔

(۱۱)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

میں اس دولتِ ابد مدت کا از راہِ مودت خیر خواہ ہوں۔ امرِ طال انگیز اندوہ آور میں آرائشِ گفتار گوارا نہیں کرسکتا۔ نواب مرزا نے دلی آکر پہلے نویدِ بزم آرائی سنائی۔ چاہتا تھا کہ اوس کی تہنیت لکھوں۔ کل اوس نے از روی خطِ آمدِ رامپور حضرت جنابِ عالیہ کے انتقال کی خبر سنائی۔ کیا کہوں، کیا غم و

اندوہ کا ہجوم ہوا! حضرت کے غمگین ہونے کا تصور کرکر اور زیادہ مغموم ہوا۔ بیدرد نہیں ہوں، کہ ایسے مقام میں بطریقِ انشا پردازی عبارت آرائی کروں۔ نادان نہیں ہوں، کہ آپ جیسے دانا دلِ دیدہ ور کو تلقینِ صبر و شکیبائی کروں ؎

از دست گدای بی نوا ناید ہیچ جز آن کہ بصدقِ دل دعائی گوید

حق تعالیٰ ذاتِ ستودہ صفات کو دایماً اور ابداً جاہ و جلال و دولت و اقبال کے ساتھ سلامت باکرامت رکھے ۱۲

عریضہ نگار، اسداللہ المتخلص بہ غالب ۱۲

مرقومۂ یکشنبہ، ۲۱ شعبان و ۲۷ مارچ سال حال۔

(۱۲)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

ایک خط مشتمل اپنے حال پر[۱] اور ایک خط جناب بیگم صاحبہ و قبلہ مغفورہ کی تعزیت میں روانا کرچکا ہوں۔ اب ایک قطعۂ تاریخ بھیجتا ہوں۔ اگرچہ ایک کا تعمیہ ہے، لیکن تعمیہ کتنا خوب اور بے تکلف ہے! عرضداشتِ اسداللہ۔ معروضہ ۱۳ رمضان و ۱۷ اپریل سالِ حال[۲]

جنابِ عالیہ از بخششِ حق بہ فردوسِ برین چون کرد آرام
سخن پرداز غالب سالِ رحلت "بنلو و خلد" گفت از روی الہام
(۱۲۷۵ھ)

(۱۳)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم کے عرض کرتا ہوں۔ آج دوشنبہ کا دن ۱۴ رمضان المبارک کی اور ۱۸ ماہِ اپریل کی صبح کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا، اور منشورِ عطوفت لایا۔ میں نے سر پر رکھا، آنکھوں سے لگایا۔ تعجب ہے کہ میرے دو خطوں کی رسید اس عنایت نامہ میں مرقوم نہیں۔ آیا: پہنچے، یا پہنچے اور نہ پڑھے گئے، کچھ معلوم نہیں[۳]۔

پہلے خط میں یہ عرض کیا ہے کہ مجموع پنسنداروں کی فہرست مرتب ہے، اور ہنوز

صدر کو روانا نہیں ہوئی۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر نے کلکتہ سے میرے پنسن کے کاغذ طلب کئے، اور وہ کاغذ فہرست میں سے الگ ہو کر لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں ارسال ہوئے۔ وہاں سے کلکتہ کو بھیجے جائیں گے۔ پھر وہاں سے حکم منظوری پنجاب ہوتا ہوا یہاں آئیگا، اور یہاں مجکو روپیہ ملجائیگا۔ آج روپیہ ملا، کل میں نے آپ سے سواری اور بار برداری مانگی۔ آج سواری اور بار برداری پہنچی، اور کل میں نے رامپور کی راہ لی۔ بلکہ اسی نیاز نامہ میں کچھ حسنِ طلب بھی تھا۔ افسوس کہ ایسا خطِ ضروری نہ پہنچے!

دوسرا خط جنابِ عالیہ مغفورہ کی تعزیت میں تھا۔ اوس کا بھی ذکر اس عنایت نامہ میں نہ تھا۔ ناچار پہلے خط کا مضمون اس ورق میں مکرر لکھدیا، اور دوسرے خط کے صرف ذکر پر اکتفا کیا۔ حق تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے، اور صبر و ثبات و دولت و اقبال و عمر و جاہ و جلال بطریقِ دوام عنایت کرے!

دو غزلیں منجملہ بارہ غزلوں کے بعد اصلاح ارسال کر چکا ہوں۔ خدا کرے پہنچ گئی ہوں! پرسوں ایک قطعہ جناب بیگم صاحب و قبلہ کی تاریخِ وفات کا بھیجا ہے۔ یقین ہے کہ پہنچے گا۔ ازراہِ احتیاط وہ قطعہ اس ورق میں پھر لکھتا ہوں؛ اور نیز ازراہِ احتیاط یہ خط بیرنگ روانا کرتا ہوں۔ زیادہ حدِّ ادب۔ عریضہ اسداللہ خاں معروضہ دوشنبہ چہاردہم رمضان۔ سنہ ۱۲۷۵، مطابق ہژدہم اپریل سنہ ۱۸۵۹ (۲)

قطعہ

جنابِ عالیہ از بخششِ حق — بفردوسِ برین چون کرد آرام
سخن پرداز غالب، سالِ رحلت — "خُلودِ خُلد" گفت از روی الہام

(۱۴)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

نوازشنامہ کے ورودِ مسعود کی اطلاع دیتا ہوں، اور ہنڈوی کے پہنچنے کا شکر بجالاتا ہوں۔ ستمبر سنہ ۱۸۵۹ کے مہینے کے سو روپیہ پہنچے۔ خاطرِ اقدس جمع رہے!

عزم ولایت کا حال معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ آپ کو ہر جگہ مظفّر و منصور و کامیاب رکھے[۱]! خدمتگزار ہوں، اور دعا و ثنا میرا کام ہے۔ بڑھاپے نے کھویلا۔ جز نقصے چند مجھ میں کچھ باقی نہیں۔ زیادہ حدِ ادب۔

عرضداشتِ غالب۔ معروضۂ یکم اکتوبر سنہ ۱۸۵۹ عیسوی۔

(۱۵)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تقدیم تسلیم گزارش کرتا ہوں۔ پرسوں ایک نیازنامہ بھیجا ہے یقین ہے کہ پہنچے گا، اور اوس کا جواب جلد عنایت ہوگا۔ کل نوازشنامہ، جس میں سو روپیہ[۲] کی ہنڈوی بابت ماہِ اکتوبر سنہ ۱۸۵۹ عیسوی، شرفِ ورود لایا۔ زیرِ مندرجۂ ہنڈوی معرضِ وصول میں آیا۔ خاطرِ اقدس جمع رہے.....

شنبہ ۵ نومبر سنہ ۱۸۵۹[۳]

(۱۶)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد بجالانے آدابِ نیاز کے عرض کرتا ہوں۔ یہ میرا دردِ دل ہے۔ نامۂ تہنیت میں اس کا اندراج مناسب نہیں جانا۔ میں انگریزی سرکار میں علاقہ ریاست دودمانی کا رکھتا ہوں۔ معاش اگرچہ قلیل ہے، مگر عزت زیادہ پاتا ہوں۔ گورمنٹ کے دربار میں داہنی صف میں دستواں لمبا اور سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید، خلعت مقرر ہے۔ لارڈ ہارڈنگ صاحب[۳] کے عہد تک پایا۔ لارڈ دلہوسی[۴] یہاں آئے نہیں۔ اب یہ نوابِ معلّی القاب آتے ہیں[۵]۔ زمانے کا رنگ اور۔ کوئی حاکم، کوئی سکرتر میرا آشنا نہیں۔ بڑے میرے مربی قدردان، جناب اڈمنسٹن صاحب[۶]۔ وہ بھی چیف سکرتر نہ رہے، لفٹنٹ گورنر ہو گئے۔ وہ سکرتر رہتے، تو مجھے کچھ غم نہ تھا۔ اب تک میں اپنے کو یہ بھی نہیں سمجھا کہ بیگناہ ہوں یا گناہگار، مقبول ہوں، یا مردود۔ مانا کہ کوئی

خیر خواہی نہیں کی، جو نئے انعام کا مستحق ہوں؛ لیکن کوئی بیوفائی بھی سرزد نہیں ہوئی، جو دستورِ قدیم کو برہم مارے۔" بہرحال اس تشویش میں ہوں۔ راہِ چارہ مسدود، اور دکھ موجود۔ عرفی خوب کہتا ہے ؎

مرا زمانہ طنّاز دست بستہ و تیغ زند بفرقم و گوید کہ "ہان! سرے بیخار"

مرقومۂ صبح یکشنبہ، ۷ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء (۲)

(۱۷)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد بجا لانے آدابِ نیاز کے عرض کرتا ہوں۔ منشورِ عطوفت پہنچا۔ نوّابِ عالی جناب کی ملازمت کا حال بسبیلِ اجمال مندرج تھا۔ میں از روی اخبار بتفصیل دریافت کر چکا ہوں۔ ہندستان میں کسی رئیس کے واسطے یہ بات کاہے کو ہوئی ہے؛ مسند تکیہ کسی کو کب ملا ہے؟ یہ کمالِ عزّ و شان اور استحکامِ بنائی ریاست کا نشان ہے۔ لطف یہ ہے کہ اب صاحبانِ کورٹ آف ڈرکٹر (۳) حائل نہیں رہے۔ نواب گورنر جنرل بہادر نائبِ سلطنت ہیں۔ اس صورت میں جو کچھ انھوں نے دیا ہے، وہ عطیہ حضرتِ فلک رفعت ملکۂ معظمہ کا ہے ایسے شاہنشاہ کی سرکار سے وسادۂ سروری کا عطا ہونا، بہت بڑی نوازش اور سزاوارِ صدگونہ نازش ہے۔ یہ چار بالش امارت اور "کاشی پور" کا ضمیمۂ ملکِ موروثی ہونا، پہلے آپ کو اور پھر ولیعہد بہادر کو اور پھر آپ کی اولاد واخوان و انصار کو اور سب کے بعد غالبِ دعاگوی گوشہ نشین کو مبارک ہو! زیادہ حدِ ادب۔

مرقومۂ صبح یکشنبہ، ۲۷ نومبر ۱۸۵۹ء (۴)

(۱۸)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

آدابِ نیاز بجا لا کر عرض کرتا ہوں، کہ سو روپیہ کی ہنڈوی بابت مصارفِ

ماہِ نومبر ۱۸۵۹ پہنچی، اور روپیہ وصول میں آیا، اور صرف ہوگیا، اور میں بدستور بھوکا اور ننگا رہا۔ تم سے نکہوں تو کس سے کہوں؟ اس مشاہرۂ مقرری سے علاوہ دو سو روپیہ اگر مجکو اور بھیج دیجے گا، تو جلا لیجے گا؛ لیکن اس شرط سے کہ اس عطیۂ مقرری میں محسوب نہو، اور بہت جلد مرحمت ہو۔ زیادہ حدِ ادب۔

عرضداشتِ غالب۔ معروضۂ صبحِ پنجشنبہ ہشتمِ دسمبر سنہ ۱۸۵۹ بھجرد دردِ غایت تامۂ مرقومۂ ماہِ حال (۲)

(۱۹)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

آدابِ نیاز بجا لاتا ہوں، اور مزاجِ اقدس کی خبر پوچھتا ہوں، اور بکمالِ ناچاری، بصد گونہ شرمساری، عرض کرتا ہوں کہ آج سہ شنبہ، زوری کی ہے۔ جو لوگ کہ میرے ساتھ ہیں، گوش برآواز ہیں، اور جو وظیفہ خواردلی میں ہیں، وہ چشم براہ ہوں گے۔ زیادہ حدِ ادب۔

خوشنودی کا طالب، غالب۔

صبحِ سہ شنبہ ۷ فروری سنہ ۱۸۶۰ (۳)

(۲۰)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

تقدیمِ مراسمِ تسلیم مقدمہ اس گزارش کا ہے کہ عالم دو ہیں: ایک عالمِ شہادت، ایک عالمِ غیب۔ جس طرح عالمِ شہادت میں آپ میری دستگیری کر رہے ہیں، عالمِ غیب میں آپ کا اقبال مجکو مدد پہنچا رہا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ کہ وہ نقشا پنسن واروں کا، جو یہاں سے صدر کو گیا تھا، وہ اب صدر سے بعدِ صدورِ حکم آگیا۔ حکم بہ نسبت ہر واحد کے مختلف ہے۔ تقلیل بہت ہے۔ سو روپیہ مہینے والے کو پچھتر (۷۵) بھی ہیں، اور پچیس (۲۵) بھی ہیں اور دس بھی ہیں۔ اب فرمائیے، میرے واسطے کیا احتمال گزرتا ہے۔ یاسِ کلی ہو،

(۱) اثر راہ سو مرزا صاحب نے نکھوں لکھ دیا ہے۔

لیکن واقع یہ ہوا ہے کہ سب سے پہلے میرا نام اور پورے پنشن کی واگزاشت کا حکم۔ طُرفہ یہ کہ میرے نام کے ساتھ ایک انگریزی تحریر ہے، کہ جس کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کا حکمِ منظوری اس تحریر پر متفرع ہے۔ حکام کے علہ میں اور وکلا اور اہل شہر میں یہ مشہور ہے، کہ وہ تحریر ولایت سے آئی ہے۔ بہرحال دو امر ہنوز مبہم ہیں: ایک اس انگریزی تحریر کا حال، اور دوسرے میرے بھائی کے پنشن کی حقیقت۔ سو یہ دونوں امر چند روز میں معلوم ہوجائیں گے، اور جو معلوم ہوگا، وہ عرض کیا جائیگا۔ **غالب**۔ ۲۲ اپریل ۱۸۶۰ء (۱)

(۲۱)

حضور،

سنہ ۱۸۵۸ء میں، یہ قصیدہ کہ گویا نامۂ منظوم ہے، میں نے حضور میں بھیجا تھا اور بریلی کے ملک ملنے کی تہنیت دی تھی۔ بعد اوس کے، حضرت کو دامنۂ کوہ کی محال، یعنی کاشی پور ملا۔ گویا یہ میری تحریر غلط ہوگئی۔ الحمدللہ! انجامِ کار جو میں نے قصیدہ میں قصد کیا تھا، وہی ہوا۔ اب ارشاد ہو کہ میں لسان الغیب ہوں یا نہیں؟ (۲)

"چون نیست مرا شربتِ آبی ز تو حاصل — دانم کہ تو دریائی و من سبزۂ ساحل
در بادیہ، برگوریِ غریبان، ز چہ سوزد؟ — آن شمعِ فروزان کہ بود در خورِ محفل
زان خسروِ خوبان چہ قدر چشمِ وفا بود؟ — صد حیف! کہ شد نقشِ امیدم ہمہ باطل
افسانۂ غم گر بسرایم، نبود عیب — با دوست کہ پیوستہ ہمی بردغم ازدل
میگویم و ہمدم زندم طعنہ کہ "تن زن" — چون می ندہد داد، ز فریاد چہ حاصل؟"
از طعنہ شدم خستہ دل و از رہِ تیمار — دل گفت کہ "ہان! شیوۂ عشاق فزول"
تا کس نبرد ظن کہ بشاہد بودم روی — حاشا! کہ حکایت کنم از لیلی و محمل
شاہد بود آن دوست کہ اندر غزل اورا — خوانند ستمگارہ و خونخوارہ و قاتل
من نالم ازان دوست کہ در عالمِ انصاف — شایان بودش، گویم اگر خسروِ عادل

او خسروِ خوبان بود و بنده گدایش — او قلزم و عمان بود و من خسِ ساحل
گر خواجه، همانست و گر دوست، همانست — ما نیم و یقینی که بوحدت شده کامل
خود هرچه سر دم همه با اوست گزین پیش — امید گهم بود بهر وادی و منزل
یارب! چه شد اینک نگیرد خبر از من؟ — بربسته بر دیم درِ ارسالِ رسائل
ای یوسفِ ثانی! که بود در همه عالم — مشتاقِ جمالِ تو، چه دیوانه چه عاقل
گر نامِ تو در بحر بگنجید، زیان نیست — شد نامِ نظیرِ تو و هم نامِ تو داخل
تا نزدِ تو چون آیم و دور از تو چه سازم؟ — ماندن ز تو دشوار و رسیدن بتو مشکل
ای کاش! یکوی تو چنین روی نمودی — زنهار که فرو رفته مرا پای درین گل
چونست که گاهی نکنی روی بدین[1] سوی؟ — از چیست که هرگز ندهی وایه به سائل؟
گر جان دهم از غصهٔ تو دانی که بگیتی[2] — حرفی غلط از صفحهٔ هستی شده زائل
خواهی که مرا بنگری از دور بفرمای — تا نزدِ تو آرند یکی طائرِ بسمل
از صنعتِ استادِ ازل دان که زهر سوی — چون قبله نما، سوی توام ساخته مائل
«غالب، لبسخن نام من آمد ازل آورد — دانی که درین شیوه نیم عامی و جاهل
در فنِ سخن دم مزن از عرفی و طالب — این آیه[3] خاصست که بر من شده نازل
من گنجم و گردون به گل اندوده درم را — می بین، درِ گنج ار چه کشودن شده مشکل
خود در خورِ ویرانه بود گنجِ گران مند — غم نیست، گر آبادیِ دهلی شده زائل
هاروت، فسونِ نفسِ گرم چه داند؟ — اعجاز ز دهلی بود و سحر ز بابل
آن را که صریرِ قلمم هوش ربا ید — دیگر نبرد ذوق ز آوازِ عنادل
توقیعِ «بریلی»، تو فرخنده! که من نیز — بستم بفره مندی، خویش از کرمت دل
حاشا! که ستانیم رقمِ قاضی و مفتی — حاشا! که پذیرم علِ شحنه و عامل
بفرست خرومندکسان را بحکومت — در جیبِ گدا ریز قلیلی ز مداخل
هر سال ازان شهر بمن وایه روان دار — کز بهرِ همین گشته دراقطاعِ تو شامل
امید که لب تشنگی، من نه پسندی — زان رشحه که بر صفحهٔ فنانی ز انامل

(۱) ن: درین (۲) ن: بگیتی (۳) ن: آیت

امید کہ بپزیری و بر من نکنی قہر — پذیرم اگر معذرتِ فرطِ مشاغل
امید کہ آن شیوہ نوروزی کہ نگویم — کز دردِ دلم فارغ و از من شدہ غافل
ای رای تو در روشنی از مہر فزون تر! — ای روی تو در حسن و چند از مہِ کامل!
تا مہر بیک سال کند دائرہ را دور — تا ماہ بیک ماہ کند قطعِ منازل
باشی بسپہرِ شرف آن ماہ کہ باشد — در نور بہ خرشیدِ جہانتاب مقابل[1]

(۲۲)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

شکرِ بندہ پروری بجالا کر عرض کرتا ہوں کہ کل ۱۲ جولائی کو نوازشنامہ مع سو روپیہ کی ہنڈوی کے پہنچا، اور روپیہ معرضِ وصول میں آیا متوقع ہوں کہ یہ عطیہ چوتھی، پانچویں انگریزی کو، جیسا کہ ہمیشہ پہنچتا تھا، پہنچا کرے۔ دسویں بارھویں نہوا کرے[2] ؎

تم سلامت رہو قیامت تک!
خوشنودی کا طالب، غالب۔
صبح جمعہ ۲۳ ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۶
مطابق ۱۳ جولائی سنہ ۱۸۶۰

(۲۳)

ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت[3]!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ کے ورود سے میں نے عزّت پائی۔ سو روپیہ کی ہنڈوی بابت مصارفِ مارچ سنہ ۱۸۶۱ کے پہنچی۔ زرِ مندرجہ معرضِ وصول میں آیا۔ خاطرِ اقدس قرینِ جمعیّت رہے۔ کلیاتِ فارسی کے پہنچنے سے اور اس نذر کے مقبول ہونے سے مجکو بہت خوشی حاصل ہوئی[4] ؎ تم سلامت رہو قیامت تک! عنایت کا طالب غالب ۱۲

صبح یکشنبہ ۷ اپریل سنہ ۱۸۶۱ء

(۳) عریضہ نمبر ۲۳ تا ۲۶ میں خلافِ معمول لفظِ "حضرت" ساقط ہے۔

(۲۴)

ولیّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم تُورہ اور خلعت کے عطیّہ کا آداب بجا لاتا ہوں۔ خدا آپ کو سلامت رکھے، اور اپنی اولاد کی اولاد کی شادیاں کرنی اور اون شادیوں میں تورہ وخلعت کی تقسیم نصیب ہو ۱۲

یہ تحریر نہیں، مکالمہ ہے۔ گستاخی معاف کروا کے اور آپ سے اجازت لیکے بطریقِ انبساط عرض کرتا ہوں کہ یہ سوا سو روپئے، جو تُورہ وخلعت کے نام سے مرحمت ہوئے ہیں، میں کال کا مارا اگر یہ سب روپیہ کھا جاؤں گا، اور اس میں لباس نہ بناؤں گا، تو میرا خلعت حضور پر باقی رہے گا یا نہیں؟ ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

داد کا طالب، غالب ۱۲ دوشنبہ، بجابِ تعزیہ واراں پانچویں، اور از روی ووج ۶ محرم الحرام سنہ ۱۲۷۸ (۱)۔

(۲۵)

ولیّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آٹھ سات برس سے مصدر خدمت اور شریکِ دولت ہوں۔ لازم کر لیا ہے کہ بیہودہ گزارش نکروں، اور کبھی کسی کی سپارش نکروں۔ بھائی حسن علی خاں کے بیٹوں کے باب میں جو علی بخش خاں صاحب (۲) کو لکھا، اس کو میں سپارش نہ سمجھا تھا۔ مُخبر بنا، اور آپ کے اہل کاروں کو اوس بات کی خبر دی کہ جس کا تدارک صاحبانِ ملک و حاکمانِ عہد پر لازم ہے۔ سو بمقتضائے نصفت و عدالت وہ مقدمہ فیصل ہو گیا۔ میر سرفراز حسین اور میر نصاحب کو (۳) واللہ، باللہ (۴)! اگر میں نے بھیجا ہو۔ نوکری کی جستجو کو نکلے تھے۔ میر سرفراز حسین نوکری پیشہ، اور میر من مرثیہ خواں اور

(۴) اس لفظ کو میرزا صاحب نے "باالله" لکھا ہے۔

یہاں کے مرثیہ خوانوں میں ممتاز۔ خانساماں صاحب کو جو میں نے یہ لکھا کہ یہ ایسے ہیں اور ایسے ہیں، غرض اس سے یہ تھی کہ محرّم میں جہاں دس پانچ مرثیہ خواں اور مقرر ہوتے ہیں، میرن بھی مقرر ہو جائیں۔ آخر جا بجا تھانہ دار کوتوال، تحصیلدار نوکر ہیں۔ میر سرفراز حسین ہوشیار اور کارگزار آدمی ہیں کسی علاقہ پر یہ بھی مقرر ہو جائیں یہ دونوں امر یا ان دونوں میں سے ایک ہو جاتا، بہتر تھا؛ نہوا بہتر۔ درحقیقت سپارش نہ تھی، صرف معرّف ہونا تھا۔ سپارش کرتا تو کیا میں آپ کو نہ لکھ سکتا تھا؛ میری طرف سے خاطرِ عاطر جمع رہے ؎

زسینہ تا بلبم سالہا نیابد راہ ہر آن نفس کہ رضای تو اندر آن نبود!

داد کا طالب، غالب۔ دوشنبہ، ۲۲ جولائی سنہ ۱۸۶۱۔

(۲۶)

ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم کے عرض کرتا ہوں، اور طلوعِ ستارۂ اقبال کی مبارکباد دیتا ہوں یقین ہے کہ اس سفرِ فیض اثر میں "ریل گاڈی" کی سواری کی بھی سیر دیکھ لی ہوگی۔ یہ اوس مینت و شکوہ و شوکت سے علاوہ ایک تماشا نیا دیکھا۔ حق تعالیٰ حضرت کو سلامت باکرامت رکھے[۱] ۱۲

دعا گو ایک مہینا بھر سے بیمار ہے۔ ابتدا وہی قولنج دوری۔ بسببِ استعمالِ ادویۂ[۲] حارّہ، کہ اس مرض میں اُس سے گزیر نہیں، تپ نے آگھیرا۔ کئی باریاں بھگتیں۔ اب دو باریاں ٹل گئی ہیں؛ لیکن طاقت بالکل[۳] سلب ہوگئی ہے، اور ضعفِ دماغ نے قریب بہ ہلاکت پہنچا دیا ہے۔ بالفعل[۳] آبِ سیب کا استعمال ہے ۱۲

طریقۂ دعا گوئی و ثنا خوانی کی رعایت سے نوبت بسبیلِ مثنوی، کہ جس

(۲) میرزا صاحب نے اس لفظ کو تشدید یا لکھا ہے۔

(۳) ان دونوں لفظوں کو میرزا صاحب نے ایک الفِ زائد کے ساتھ 'بالفعل' اور 'بالکل' لکھا ہے۔

میں حصولِ عطیۂ سلطانی کی ہجری وعیسوی تاریخ ہے، بہر حال لکھ لی ہیں۔ کل درودِ عنایت نامہ سے معزز ہو کر، آج وہ اشعار نذر کرتا ہوں[1]۔ زیادہ حد ادب ہے تم سلامت رہو قیامت تک! شفقت کا طالب، غالب۔ دوشنبہ ۱۱ نومبر سنہ ۱۸۶۱ء۔

(۲۷)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل ایک شعر ظہوری مغفور[2] کا اور ایک شعر غالبِ مرحوم کا ایک ورق پر لکھ کر، صبح کو ڈاک میں بھجوا دیا۔ شام کو توقیعِ دقیع ہرکارۂ ڈاک نے لا دیا۔ اگست سنہ ۱۸۶۲ کی پرورش کی ہنڈوی پہنچی، اور سو روپیہ وصول ہو گئے۔

فقیر کا شیوہ صدق وسداد کا ہے۔ چند روز سے تفقّد و التفاتِ قدیم میں، خدانخواستہ باشد، کچھ کمی پاتا ہوں۔ اگر غلط ہے میرا گمان، تو بشرفِ اطلاع مشرف فرمائیے؛ اور اگر میرا دلِ دیوانہ سچ سمجھا ہے، تو متوقع ہوں کہ عتاب کے سبب سے آگہی پاؤں[3]۔ زیادہ حد ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

معروضۂ صبح دوشنبہ، ۱۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۲ء۔ [مہر: غالب ۱۲۷۸]۔

یہ عرضداشت جدا ہے، البتہ اس کے جواب کا امیدوار ہوں، اور رسیدِ معمولی جدا ہے[3] ۱۲

(۲۸)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازشنامہ مع سو روپیہ کی ہنڈوی کے پہنچا۔ اگست سنہ ۱۸۶۲ کے مہینے کی پرورش کا روپیہ وصول ہوا۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

(مہر: غالب ۱۲۷۸)۔ دوشنبہ ۱۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۲ء۔

(۲۹)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازشنامہ مع ہنڈوی سو روپیہ کے شرفِ ورود لایا۔ سو روپیہ مصارفِ ستمبر سنہ ۱۸۶۲ کا معرضِ وصول میں آیا ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

معروضۂ دہم اکتوبر سنہ ۱۸۶۲ء۔

خوشنودیٔ مزاج کا طالب، غالب سہ

(۳۰)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازشنامۂ ریوبیت طراز، مورخۂ ۱۱ مارچ ۱۸۶۳ء ۱۴ ماہِ مذکور کو میں نے پایا۔ دوسو روپیہ کی ہنڈوی کا شکر بجا لایا۔ کہاں تک شکر بجا لاؤں گا؟ کس کس عنایت کا سپاس ادا کروں گا؟ "شکرِ نعمتہای تو چندانکہ نعمتہای تو"۔

آپ سنئے اپنے دعاگو کی داستان۔ منگل ۳ مارچ کو جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے[۲] خلعت عطا کیا، اور فرمایا کہ "ہم تمھیں مژدہ دیتے ہیں کہ نواب گورنر جنرل بہادر نے[۳] اپنے دفتر میں تمھارے دربار اور خلعت کے بدستور بحال رہنے کا حکم لکھوا دیا"۔ میں نے عرض کیا کہ "میں انبالے جاؤں"؟ فرمایا: "البتہ انبالے جانا ہوگا"۔

بعد جناب نواب صاحب کے جانے کے شہر میں شہرت ہوئی کہ دلّی کے لوگ انبالے جانے سے ممنوع ہیں۔ گھبرایا اور صاحب کمشنر کے پاس گیا۔ آپ خط اپنا دے آیا۔ زبانی پرسش کا جواب زبانی پایا۔ پھر خط کے جواب میں خطِ محررہ، مارچ آیا۔ چنانچہ لفافہ بلحاظِ گرانیٔ وزن رہنے دیتا ہوں، اور

خط بجنسہ حضرت کو بھیجتا ہوں۔

کل سے ایک اور خبر اوڑی ہے کہ نصیب اعدا لاڑو صاحب کی طبیعت ناساز ہو گئی ہے؛ انبالے میں دربار نکریں گے، اور شملہ کو چلے جائیں گے۔ اب میں دو وجہ سے بَینَ السَّفَرِ وَالسُّکُون متردد ہوں: پہلی وجہ خاص، دوسری وجہ عام۔

دو سو میں سے سو لیکر ساز و سامان درست کیا ہے، اور سو مہاجن کے ہاں ڈاک اور خرچ راہ کے واسطے رہنے دئے ہیں۔ تار برقی میں جناب نواب صاحب سے حکم منگواؤں گا۔ جو حکم آئیگا، آپ سے عرض کر کے اُس کی تعمیل کروں گا۔ ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

معروضہ ۱۶ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء (مہر: غالب ۱۲۷۸) (۱)

(میرزا صاحب نے ایک عریضہ سہ شنبہ ۲۸ جولائی سنہ ۱۸۶۳ء کو پیڈ ضروری لکھا تھا۔ مثل میں اُس کا صرف لفافہ موجود ہے، اور اس پر میر منشی صاحب دارالانشا نے تحریر کیا ہے: "عرضی در حضور ماند")

(۳۱)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ جب انبالے میرا جانا ہوا، تو میں نے قصیدہ مدح، جو دربار کی نذر کے واسطے لکھا تھا، بطریقِ ڈاک جناب چیف سکرتر بہادر کو اس مراد سے بھیجا کہ آپ اس کو جناب نوّابِ معلّی القاب کی نظر سے گزرانیں[۲]۔ اور یہ دستورِ قدیم تھا کہ جب میں قصیدۂ مدحیّہ بھیجتا، تو صاحب سکرتر بہادر کا خط بیواسطۂ حکامِ ماتحت مجکو آجاتا۔ اب جو میں نے موافقِ معمول قصیدہ بھیجا، یقین ہے کہ مارچ یا اپریل کے مہینے میں وہ لفافہ یہاں سے لشکر کو گیا۔ صدائی برنخاست۔ ناامید ہو کر بیٹھ رہا۔ بلکہ یہ خیال

گزرا کہ جب رسمِ تحریرِ خطوط نرہی، تو دربار اور خلعت کہاں؟ ناگاہ کل شام کو صاحب سکرٹر بہادر کا خط ڈاک میں آیا۔ وہی افشانی کاغذ، وہی القاب۔ جی چاہتا تھا کہ اصلِ خط مع سرنامہ بھیجدوں، تاکہ حضور ملاحظہ فرمائیں؛ مگر برسات کا اندیشہ مانع آیا۔ نقل سرنامہ اور خط کی بھیجتا ہوں ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

حضور کی خوشنودی کا طالب، غالب ۱۲

صبح سہ شنبہ ۴ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۳ (۱)

(۳۲)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم کے معروض ہے۔ نوازشنامہ اور اوس کے ساتھ دو بہنگیاں دوسو آموں کی پہنچیں ؎ شکرِ نعمتہای تو چندانکہ نعمتہای تو! (۲) زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب۔

سہ شنبہ، پنجم جولائی سنہ ۶۴۔

(۳۳)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ منشورِ عطوفت مع قطعۂ ہنڈوی شرفِ ورود لایا۔ سو روپیہ باعث بابت تنخواہِ جولائی سنہ ۱۸۶۴ کے معرضِ وصول میں آیا۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

ترحّم کا طالب، غالب ۱۲

۱۱ اگست سنہ ۱۸۶۴۔

(۳۴)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازشنامہ مع ہنڈوی عزِّ ورود لایا۔ سو روپیہ بابت تنخواہِ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۴ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب

ے

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

جمعہ نہم ستمبر سنہ ۱۸۶۴۔

(۳۵)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ صدورِ والا نامہ سے میں نے عزت پائی۔ بذریعۂ ہنڈوی سو روپیہ بابت تنخواہِ ستمبر سنہ ۱۸۶۴ وصول ہوئے۔ زیادہ حدِّ ادب

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

ترحّم کا مستحق اور تفقّد کا طالب، غالب

دوشنبہ دہم اکتوبر سنہ ۱۸۶۴ عیسوی

(۳۶)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم و نیاز معروض ہے۔ جب سے حضرت کی ناسازیٔ مزاجِ مبارک کا حال خارج سے مسموع ہوا ہے، عالم الغیب گواہ ہے کہ مجھ پر اور میری بی بی پر اور میرے فرزند حسین علی خاں[۱] پر کیا گزر رہی ہے۔ ایک دن رات میرے گھر میں روٹی نہیں پکی، ہم سب نے فاقہ کیا۔ بارے وہ خبرِ وحشت اثر غلط نکلی، حواس ٹھکانے ہوئے۔ بالکل[۲] اطمینان جب ہوگا کہ آپ کے

(۲) میرزا صاحب نے اس لفظ کا املا (ابالکل) لکھا ہے۔

غسلِ صحت کی نوید سنوں گا، اور قطعۂ تاریخِ غسلِ صحت لکھ کر بھیجوں گا۔ فی الحال اتنا چاہتا ہوں کہ اس خط کا جواب پاؤں اور حقیقتِ مرض سے آگہی حاصل ہو[۱]۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

تمہاری سلامتی کا طالب، غالب ۱۲

۸ نومبر سنہ ۱۸۶۴۔

(۳۷)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ ابتدائی یکم نومبر سے ۱۱ تک، عرض نہیں کرسکتا کہ ذلیل و خوار مجھ پر کیسے گزرے ہیں۔ راہ دور، میں رنجور، مہذا بیقدور۔ اگر دلّی سے رامپور تک شکرم کی ڈاک جاتی ہوتی، تو میں یہاں ایک دم نہ ٹھہرتا اور خدمت میں حاضر ہوتا۔ تار برقی بھی نہیں، جو صحت و عافیت کی خبر جلد حاصل ہو۔ ناچار از راہِ اضطرار ۸ ماہِ حال، یعنی نومبر کو عریضہ روانا کیا۔ خدا کی عنایت اور مرشدِ کامل، یعنی حضرت، کی ہدایت نے اوس خط کے جواب آنے کی مدت سے پہلے مجھے گردابِ اضطراب سے نکالا۔ کل ۱۲ نومبر کو نوازشنامہ آگیا۔ گویا میری جان بچ گئی؛ بلکہ ایک اور نئی جان میرے بدن میں آگئی۔ اب استدعا یہ ہے کہ حالِ ناسازیٔ مزاجِ اقدس مفصل معلوم ہو۔ زیادہ حدِ ادب[۲]

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عافیت کا طالب [مہر: غالب ۱۲۷۸]

یکشنبہ، ۱۳ نومبر سنہ ۱۸۶۴۔

(۳۸)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ مع ہنڈوی شرفِ ورود لایا۔ سو روپیہ بابت اکتوبر سنہ ۱۸۶۴ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

عافیت کا طالب، غالب ۱۲

۱۳ نومبر سنہ ۱۸۶۴۔

(۳۹)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کس زبان سے کہوں، اور کس قلم سے لکھوں کہ یہ ہفتہ عشرہ کس تردد و تشویش سے بسر ہوا ہے! ہر روز شام تک جانبِ در نگراں رہتا کہ ڈاک کا ہرکارہ آئے، اور حضرت کا نوازشنامہ لائے۔ بارے، خدا کی مہربانی ہوئی، از سرِ نو میری زندگانی ہوئی، کہ کل چار گھڑی رات گئے ڈاک کے ہرکارے نے وہ عطوفت نامۂ عالی دیا، جس کو پڑھ کر روحِ تازہ رگ و پے میں دوڑ گئی۔ نیند کس کی، سونا کس کا! روشنی کے سامنے بیٹھا اور اشعارِ تہنیت لکھنے لگا۔ سات شعر مع مادّۂ حصولِ صحت جب لکھ لئے، تب سویا۔ اب اس وقت وہ مسوّدہ صاف کر کے ارسال کرتا ہوں[۱۱] ۱۲

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

خیر و عافیت کا طالب، غالب۔

۲۷ نومبر سنہ ۱۸۶۴۔

(۴۰)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازشنامہ عزِّ ورود لایا۔ از روی ہنڈوی سو روپیہ

بابت تنخواہِ ماہِ نومبر سنہ ۱۸۶۴ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِ ادب۔
تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!
تمہاری سلامتی کا طالب، غالب ۱۲
۱۳ رجب ۲ دسمبر سنہ ۱۸۶۴۔

(۴۱)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ حضرت کے قدموں کی قسم! چوب چینی کے ارسال کا حکم ڈاک سے میں نے نہیں پایا۔ ۲۲ دسمبر کو ہرکارہ آیا۔ نوازشنامۂ شرف افزا لایا۔ دلّی اب شہر نہیں چھاؤنی ہے، کنپ ہے۔ نہ قلعہ، نہ شہر کے امرا، نہ اطرافِ شہر کے روسا۔ بہرحال تین چار دن میں ہر یک جگہ سے منگوا کر، رنگین و سنگین و بے گرہ یا کم گرہ خود چنکر، پانچ سیر قطعاتِ چوب چینی ایک ٹھلیا میں رکھ کر، آٹے سے منہ بند کیا، پھر کپڑا لپیٹا، ڈوری سے خوب مضبوط باندھ کر، دو جگہ اپنی مہر کی اور وہ ٹھلیا کہار کو سونپی ۵
تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!
روزِ دوشنبہ، ۲۶ دسمبر سنہ ۱۸۶۴، وقتِ صبح، حوالۂ کہارِ سرکار۔ (مہر: غالب، ۱۲۷۸)۔

(۴۲)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازشنامہ کے ورود سے عزّت اور ادراکِ صحت و عافیتِ مزاجِ اقدس سے مسرت حاصل ہوئی۔ پرچۂ ہنڈوی اس توقیع میں ملفوف پایا۔ سو روپیہ بابت تنخواہِ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب ۱۲
تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

حضور کی سلامتی کا طالب، غالب۔
۱۴ جنوری سنہ ۱۸۶۵ عیسوی۔

(۴۳)

حضرت ولیِّ نعمت! آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ مکرمت ظہور کے ورودِ مسعود نے میری عزّت بڑھائی، اور اوس میں تنخواہِ فروری سنہ ۱۸۶۵ کی ہنڈوی پائی۔ زرِ مندرجۂ ہنڈوی معرضِ وصول میں آیا۔ سو روپیہ حضرت کا تصدق پایا۔ الٰہی، وہ دن جلد ہو کہ جو میں سنوں کہ حضرت نے غسلِ صحت فرمایا!

تم سلامت رہو قیامت تک!
دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب۔
۱۱ مارچ سنہ ۱۸۶۵ء

(۴۴)

بحضرتِ فلک رِفعت، نوّابِ معلّی القاب۔ انجم گروہ، آفتاب شکوہ، بخشش و بخشایش بینوایان را تُوانگر کن، و ناتوانان را توانا ساز، و در عزّ و جاہ با تاجداران ہمسر، و در ملک و سپاہ با شہریاران انباز، کہ بفرزانگی حلقہ در گوش افگنندۂ دانش گستران، و بمردانگی غاشیہ بر دوش نہندۂ دلاوران، ہرچہ از نیایش و ستایش بتقدیم ہمیرسد، حرزِ بازوی ہمّت است، تابدان نیرو در سخن دلیری تواند کرد۔

ہانا از رازِ سپہر و ستارہ سخن ہمیرود، و خجستگی و فرخندگی[۲] چند گفتہ می شود۔ این نافِ ہفتہ کہ راستان در باستان این را "بہرام روز" میگفتند

(۱) میرزا صاحب نے "تونگر" لکھا ہے۔
(۲) میرزا صاحب نے یہاں ہمزہ لکھا ہے۔

واکنون "سه شنبه" نام دارد، روز لیست فیروز، ویژه درین سالِ فرخ فال که دوسین روز است از فردردین، و روزِ لبست[1] و یکم از مارچ، در روز لبست و دوم از شوّال۔ باری نخست بر آن سرورِ شاه نشان، که امروز بشستن اندام آبروی گرما به افزود، مبارک، و سپس بر عالبِ سخندان، که عافیت جوی و دعاگوی این درگاه ست، همایون!

همانا درین روزگار، خسروِ ستارگان که مهرِ منیرش دانی، دریزه، واز سوی فرازنخستینِ سیارگان که زحلش خوانی، در ترازو، سعدِ اکبر به قوس، و سعدِ اصغر به ثور۔ آن دو نیّر به بیت الشرف خشنود و شاد، و این دو اختر بکاشانه های خویشتن آباد۔ گمان ندارم که از خسروانِ پارس و سلاطینِ عرب هیچکس را چنین طالعی بهرِ جلوس اتفاق افتاده باشد، که حضرت ولیّ نعمت را برای غسلِ صحّت دست بهم داده است۔ خرد تا گفتارِ مرا شنود، چشمک زد، و به پیغاره سرود که "ای در درخشانیِ انجم و آفتاب، چون کودکان در یال افشانی[2] گرمکهای شب تاب، نگران! از حلقهٔ اختر شماران بدر آی، و بدبستان حکمای روحانی رمزی از حکمتِ ایمانی بشنو، تا یدانی که بدین امیرِ مسند سریر، سلطان نظیر، عمرِ جاودانی و دوام لذّتهای روحانی بخشیده اند"۔ گفتم: "تا برهان نباشد، کالبدِ سخن را جان نباشد۔ مرا بخبر بپندار۔ و اگر حجتی داری، بیار"۔ گفت: "برهانی ازین ارجمندتر، وحجتی ازین خردپسندتر، چه خواهد بود که چون آفریدگان را در آن جهان عمر دوباره دهند، دیگر بیمِ مرگ برخیزد، و به بانگِ صور از خوابِ فنا جستگان در آن گیتی جاوید پایند۔ مگر صحّتِ خداوند ازین رنجوری هولناک[3] بدان نماند که پنداری عمر دوباره یافت؟ پس اقتضای دوباره زیستن تغییر

(۱) میرزا صاحب نے ہمزہ لکھا ہے۔
(۲) میرزا صاحب نے اس لفظ کو "ہولناگ" لکھدیا ہے۔

چرا پزیرد، و چون ہستی یافتگانِ آن جہان در آن جہان جاودان زندہ مانند، آنکہ درین گیتی حیاتِ ثانی پزیرفتہ باشد، ہم درین گیتی ہمیشہ زندگانی چون نکند؟ این عمرِ عزیز کہ بخدایگان داده اند، عمرِ خضر و الیاس نباشد کہ یکی را بشمردنِ ریگِ صحرا، و دیگری را بہ پیمودنِ آبِ دریا گزرد۔ اِنْشَاءَ اللّٰہُ الْعَظِیم جنابِ عالی، تا جہانست، پرویز بزم، تہمتن رزم، دشمن گداز، دوست نواز، طُلب در سخن اختر فشان، و کف در کرم گوہر فشان خواہند زیست۔

قطعۂ تاریخِ غسلِ صحت، و قصیدۂ تہنیت کہ پیش ازین فرستاده ام[۱۱] نظمی است شاعرانہ، و این نگارش نثریست عارفانہ، قانونِ حکمت و شریعت را جامع، ہم از روی نقل حق، و ہم از روی عقل راست۔ بقای خداوند بعمرِ تازہ جاودانی، و نشاطِ بی اندازہ پیشکارِ این حیاتِ ثانی باد! چارشنبہ ۲۳ شوال سنہ ۱۲۸۱، و ۲۲ مارچ سنہ ۱۸۶۵ (مہر: غالب ۱۲۷۸)[۱۲]

بحضور نوابصاحب والامناقب عالیشان، قلزمِ فیض وعمانِ احسان، امیرالمسلمین نواب کلب علیخان بہادر دام اقبالہ مقبول باد[1]

(نواب سید محمد کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں نواب فردوس مکاں کے فرزندِ اکبر تھے۔ آپ جنابِ عالیہ فیروز النسا بیگم صاحبہ، ملقب بہ نواب بہو بیگم، دخترِ سید عیدالعلی خاں بہادر، خلفِ نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے بطن سے ۲۰ ذی الحجہ سنہ ۱۲۵۰ھ (۱۹ اپریل سنہ ۱۸۳۵ء) کو اتوار کے دن صبح کے وقت متولد ہوئے۔ سنہ ۱۸۶۴ء میں گورنر جنرل کی منظوری سے ولیعہدِ ریاست اور ۲۴ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۱ھ (۲۱ اپریل سنہ ۱۸۶۵ء) کو جمعے کے دن ۳۰ سال کی عمر میں مسندنشین ہوئے۔ ۱۵ محرم سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۰ جون سنہ ۱۸۶۵ء) کو مسٹر جان انگلس، ایجنٹ ریاست وکمشنر روہیلکھنڈ، نے رامپور آکر باضابطہ رسمِ مسندنشینی ادا کی۔ ماہِ رجب سنہ ۸۲ھ (دسمبر سنہ ۶۵ء) میں ملکۂ معظمہ کی جانب سے خلعت آیا، اور اسی مہینے میں جشنِ جلوس منایا گیا۔ آپ بڑے حاتم دل، پابند شرع، بامروت، اور خلیق تھے۔ باقاعدہ زکوٰۃ ادا کرتے، اور غیرِ شرعی آمدنی سے خزانے کی دولت کو پاک رکھتے تھے۔ خود صاحبِ علم تھے۔ فارسی خلیفہ غیاث الدین عزت، صاحبِ غیاث اللغات، سے حاصل کی، اور علوم حکمیہ مولوی فضل حق خیرآبادی اور مولوی عبدالحق خیرآبادی سے پڑھے۔ ان کا دربار اہلِ کمال سے بھرا رہتا تھا شرقی علوم وصنائع کا شاید ہی کوئی ایسا ماہر ہو جو ان کے خوانِ جود وکرم کی زلہ ربائی نہ کرتا ہو۔ ان میں علما، شعرا، ادبا، خطاط صنّاع، طبّاخ، اور دیگر تمام ہنروں کے ماہرین شامل تھے۔ علمی مباحثوں کا بہت شوق تھا۔ روزانہ دربار میں کسی نہ کسی علمی یا ادبی مسئلہ پر اہلِ دربار طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ آپ خود برابر کا حصہ لیتے، اور اس طرح اپنی معلومات

(۱) یہ عبارت مرزا صاحب عرائض کے لفافوں پر لکھا کرتے تھے۔

دائرے کو وسیع سے وسیع تر بناتے رہتے تھے۔ کتابیں جمع کرنے اور انھیں پڑھنے کا بھی بیحد شوق تھا۔ اُس عہد میں جس قدر نایاب اور نادر کتابیں مہیا کی گئی ہیں وہ اپنی اہمیت اور قیمت کے لحاظ سے مستقل کتابخانے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فارسی ادبیات سے زیادہ تعلقِ خاطر تھا۔ جب کوئی نئی فارسی کتاب خرید فرماتے، اوس کے سرورق پر اپنے قلم سے تاریخِ آمد وغیرہ لکھتے۔ اردو، فارسی، دونوں زبانوں میں شعر کہتے، اور نواب تخلص فرماتے تھے۔ فارسی کلام مرزا محمد تقی خاں سپہر مولفِ ناسخ التواریخ، کی نظر سے گزرا تھا۔ اردو کلام امیر مینائی لکھنوی دیکھا کرتے تھے۔ ایک فارسی نثر مرزا غالب کو بھی اصلاح کے واسطے بھیجی تھی۔ مرزا ان کی طرزِ نگارش کے بیحد مداح تھے۔ تصنیفات میں چار اردو کے دیوان، دیوانِ فارسی، تاریخِ شاہانِ سلف، انتخابِ بوستانِ خیال اور متعدد نثریں ہیں۔ نوابصاحب کو اخبار بینی کا بھی شوق تھا۔ اخبارِ دبدبۂ سکندری، جو اسپور کا پہلا اخبار ہے، انھیں کے ایما سے ۱۲ جمادی الآخرہ سنہ ۱۲۸۳ھ (۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء) سے ہفتہ وار شائع ہونا شروع ہوا۔ تعمیر کا بھی شوق تھا، اور سابق جامع مسجد اور متعدد محلات ان کے اس شوق کے رہینِ منت تھے۔ آپ نے ۲۲ سال، ۱ ماہ کی حکومت کے بعد ۵۳ سال ۶ ماہ، ۱ روز کی عمر میں بدھ کے دن ۳ بجے کے وقت ۲۷ جمادی الآخرۃ سنہ ۱۳۰۴ ہجری (۲۳ مارچ ۱۸۸۷ء) کو انتقال کیا۔ امیر مینائی نے "خوابگاہِ حامیٔ اسلام امیر المومنین" سے تاریخِ وفات نکالی ہے)

(۴۵)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض باد۔ نوازشنامہ مع ہنڈوی صدر دفعہ بیعزو ورود لایا۔ اپریل سنہ ۱۸۶۵ کی تنخواہ کا روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِ ادب ہے

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عنایت کا طالب، غالب
۶ مئی سنہ ۱۸۶۵ عیسوی(۱)

سرتاسرِ دہر عشرتستانِ تو باد! صد رنگ گلِ طرب بدامانِ تو باد!
عیداست، و بہار خرّمی با دارد جانِ من و صد چو من بقربانِ تو باد!
عنایت کا طالب، غالب۔ شنبہ، صبحِ روزِ عیدِ ذی الحجہ سنہ ۱۲۸۱ ہجری نبوی(۲)

(۴۶)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ تہنیت نامہ ارسال کر چکا ہوں۔ جواب پا چکا ہوں۔ قصیدہ کا لفافہ ارسال کیا ہے۔ یقین ہے کہ پہنچ گیا ہوگا(۲)۔

حضرت فردوس مکانِ سپہر آستان کا معمول تھا کہ محرّم سے۔ دو تین مہینے پہلے سلام پانچ سات(۳) لکھتے تھے، اور فرداً فرداً میرے پاس بھیجا کرتے تھے۔ جب وہ فراہم ہو چکتے، تو محرّم سے دو چار دن پہلے میں اصلاح دیکر بھجوا دیا کرتا تھا۔ اب کے برس ایک ہی سلام بھیجنے پائے بس۔ آج وہ سلام اس مراد سے حضور میں بھیجتا ہوں کہ حضور کے حکم سے حضرت کے دیوان میں شامل ہو جائے۔ زیادہ حدِ ادب ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!(۳)

عنایت کا طالب، غالب
شنبہ یکمِ محرم الحرام سنہ ۱۲۸۲(۴)

(۴۷)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ حق تعالیٰ، جلّ جلالہٗ و عمّ نوالہٗ جس گروہ پر مہربان ہوتا ہے، وہاں حاکم عادل رحیم بھیجتا ہے، کہ وہ بقوّتِ عادلہ، کفر و بدعت کی

(۳) میرزا صاحب نے ساتھ لکھا ہے۔

جڑ اوکھاڑ ڈالے[۱]، اور بصفتِ رحم، رعایا کو پالے۔ مصداق اس کا ذاتِ قدسی صفاتِ جنابِ عالی ہے، کہ قمار خانے کی بنا مٹا ڈالی ہے، زہے! قانونِ سیاست: غلّہ کا محصول معاف کردیا ہے، روپیہ رعیّت پر نثار کیا ہے، زہے! آئینِ ریاست[۲]۔

رباعی

نوّاب کہ شد ز شوکتِ اقبالش بخشیدنِ باجِ غلّہ از اقبالش[۳]
فارغ شد ہر کسیؔ و روداد[۴] فراغ ہم "فارسؔ" و ہم "فراغ" باشد سالش

پیر و مرشد، حضرت فردوس مکاں کا دستور تھا، کہ جب میں قصیدہ بھیجتا، اوس کی رسید میں خط تحسین و آفرین کا، شرم آتی ہے کہتے ہوئے مگر کہے بغیر بنتی نہیں ۵۰ صد کی ہنڈوی اوس خط میں ملفوف عطا ہوا کرتی تھی دو قصیدۂ مدحیّہ، میرے دیوانِ فارسی میں مرقوم، اور وہ دیوان حضرت کے کتابخانے میں موجود ہے۔ خطوں کی تصدیق از روی دفتر ہوسکتی ہے۔ یہ رسم بری نہیں ہے۔ اگر جاری رہے، تو بہتر ہے۔ زیادہ حدِ ادب۔ التفات کا طالب، غالب ۱۲ پنجشنبہ ۱۹ محرم سنہ ۱۲۸۲۔

(۴۸)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازشنامہ مع ۵۰ روپیہ کی ہنڈوی کے عزّ ورود لایا۔ مئی سنہ ۱۸۶۵ کا مشاہرہ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

التفات کا طالب، غالب

۱۵ جون سنہ ۱۸۶۵ عیسوی

(۱) میرزا صاحب نے "اوکھاڑ ڈالے" لکھا ہے۔ (۲) قافیہ شایگاں ہے۔
(۴) اصل: روداد۔

(۴۹/۵)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ روزِ پنجشنبہ ۱۵ جون کو ایک عرضداشت روانہ کرچکا ہوں۔ یقین ہے کہ وہ آج پہنچے گی۔ کل ۱۷ جون کو فرح بخش و روح افزا نوازشنامہ پہنچا[۱]۔ قصیدہ کا پہنچنا اور اوس کا مقبول و منظور ہونا دریافت کرکے، اپنے بخت و قسمت پر میں نازاں ہوا[۲]۔ اب عرض یہ ہے کہ حسب الحکم حضور کے یہ قصیدہ میرے دیوان فارسی میں، جو کتابخانے میں موجود ہے، درج کیا جائے، اور سلام حضرت فردوس مکان کا اون کے دیوانِ اردو میں لکھدیا جائے[۳]۔

حضرت کی خدمت میں نہ آؤں گا تو اور کہاں جاؤں گا؟ وہ آگ برس رہی ہے، کہ طیور کے پر جل رہے ہیں۔ بعد آگ کے پانی برسے گا۔ سفر خصوصاً بوڈھے رنجور آدمی کو دونوں صورت میں متعذر۔ آفتاب میزان میں آیا، اور ہنگامۂ آتش و آب رفع ہوا، اور میں نے احرامِ بیت المعمور را پیور باندھا۔ انشاءاللہ العلیّ العظیم[۴]۔

پیر و مرشد! ازراہِ خیرخواہی ایک امر عرض کرتا ہوں۔ محمد علی خاں ابنِ وزیر محمد خاں[۵]، رئیسِ ٹونک، نے بعدِ مسند نشینی گورمنٹ کو "یمین الدولہ" اور دو جزو "ملک و جنگ" لکھ کر دیئے، اور وہاں سے وہ اون کو عطا ہوئے۔ حضور کے اجدادِ امجاد نے سلاطینِ بابریّہ کا خطاب نہ قبول کیا۔ مگر حضرت کے جدِّ امجد کو احمد شاہِ دُرّانی[۶] نے مخاطب بہ "مخلص الدولہ" فرمایا[۷]۔ حضرت اگر مناسب جانیں، تو اوس خطاب کو مع دو جزو "شمس الملک و بہرام جنگ" جناب ملکۂ معظمہ سے بذریعۂ گورمنٹ اپنے واسطے لیں[۸]۔ ۵

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

ترقیٔ دولت کا طالب، غالب۔ یکشنبہ ۱۸ جون، سنہ ۱۸۶۵ ع۔

(۵۰)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ عطوفت کے ورود نے معزز فرمایا۔ جون ۱۸۶۵ء کی تنخواہ کا سو روپیہ از روی ہنڈوی معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِ ادب۔ ۵

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

عنایت کا طالب، غالب

معروضۂ دہم جولائی، سنہ ۱۸۶۵

(۵۱)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ میری عرضداشت کا جواب آچکا ہے۔ بندہ ہنڈوی کی رسید بھجوا چکا ہے۔ یہاں خلق کو مینھ درکار ہے، اور ہوا شرارہ بار ہے۔ دھوپ کی تیزی سے آدمی کے تیور، اور پہاڑ کے پتھر جلے جاتے ہیں۔ پانی جگر گداز، ہوا جانستاں، امراضِ مختلفہ کا ہجوم جہاں تہاں۔ جز اعضای انسان کے، کہ وہ پسینے میں تر ہیں، طراوت و رطوبت کا کہیں پتا نہیں۔ یا تو جلتی ہے، یا مطلق ہوا نہیں۔ ان سطور کی تحریر سے مدّعا یہ ہے کہ مجھے ہر وقت یہی خیال رہتا ہے کہ حضرت کا مزاج کیسا ہے۔ اس خط کا جواب جس قدر جلد عطا ہوگا، دعا گو پر احسان آپ کا ہوگا۔ زیادہ حدِ ادب۔ ۵

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

آپ کی سلامتِ ذات اور اپنی نجات کا طالب، غالب ۱۲

۲۳ جولائی سنہ ۱۸۶۵ء

(۵۲)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض آں کہ منشورِ عطوفت عزِّ ورود لایا۔ تنخواہِ جولائی ۱۸۶۵ء حال کا ماعدا روپیہ از روی ہنڈوی ملفوفہ معرضِ وصول میں آیا۔

اگرچہ یہاں مینھ اسی قدر برسا ہے کہ جس کے پانی سے زمیندار حاصلِ فصلِ ربیع سے ہاتھ دھولیں، مگر چونکہ بفرمانِ ازلی میرے رزق کی برات آپ پر ہے، اور آپ کے ملک میں بارش خوب ہوئی ہے، ابرِ رحمت کے شکریہ میں ایک قطعہ ملفوف اس عرضی کے بھیجتا ہوں۔ بنظرِ اصلاحِ نظم و اصلاحِ حال ملاحظہ ہو۔ زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

نجات کا طالب، غالب

جمعہ ۱۱ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۵ء

۱ مقامِ شکر ہے، اے ساکنانِ خطۂ خاک
رہا ہے، زور سے ابرِ ستارہ بار، برس

۲ کہاں ہے ساقیٔ مہوش؟ کہاں ہے ابرِ گہربار؟
"بیار" (لا) مئ گلنار گوں، "بیار" (برس)

۳ خدا نے تجھکو عطا کی ہے گوہر افشانی
درِ حضور پر، اے ابر! بار بار برس

۴ ہر ایک قطرہ کے ساتھ آئے جو ملک، وہ کہے
"امیرِ کلبِ علی خاں جئیں ہزار برس"!

۵ فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
کئی ہزار برس، بلکہ بے شمار برس

۶ جنابِ قبلۂ حاجات! اس بلاکش نے

بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس
شفا ہو آپ کو، غالب کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس!

(۵۳)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل برخوردار نوّاب مرزا خاں داغ کی تحریر سے معلوم ہوا کہ حضرت کا مزاجِ اقدس ناساز ہوگیا تھا، اب خدا کے فضل و کرم سے افاقت ہے۔ نوّاب مرزا نے مجھ پر ستم کیا کہ پہلے سے یہ حال نہ رقم کیا۔ جو دعا جب کرتا، اب بھی وردِ شب و روز ہے؛ مگر یہ خیال، کہ حضور کو یہ خیال گزریگا کہ غالب رسمِ عیادت بجا نہ لایا، سخت جگر سوز ہے۔ اب اس خط کے جواب میں نویدِ عافیت کا امیدوار، اور یہ سوچکر[1] کہ آج کے آٹھویں دن جواب آئیگا، بیقرار ہوں۔

ایک عبارت کا ایک جزو بطریقِ خط ایک انصاف دشمن کو لکھ کر چھپوا دیا ہے۔ پارسل اوس کا نوّاب مرزا کو ارسال کیا ہے۔ پانچ رسالے وہ میری طرف سے نذر گزرانیں گے۔ حضرت قبولِ نذر کو میرا عزّ و شرف جانیں گے[2] ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

دعاگو غالب۔ ۱۳ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۵ء۔

(۵۴)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ داستانِ حمزہ قصہ موضوعی ہے۔ شاہ عباس ثانی[3] کے عہد میں ایران کے صاحب طبعوں نے اس کو تالیف کیا ہے۔

(۱) میرزا صاحب نے "سوچکر" لکھا ہے۔

ہندستان میں" امیر حمزہ کی داستان" اس کو کہتے ہیں، اور ایران میں" رموزِ حمزہ" اس کا نام ہے۔ دو سو کئی برس اس کی تالیف کو ہوتے۔ ابتک مشہور ہے، اور ہمیشہ مشہور رہے گا۔

آپ کے اس تکیہ دارِ روزینہ خوار فقیر نے آپ کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا ہے، مشتمل اس التزام[1] پر کہ تشبیب کی ابیات اور مدح کے اشعار میں حمزہ و اولادِ حمزہ و زمرد شاہ وغیرہ یا ان کے معاملات و حالات کا ذکر درمیان آئے۔ سو وہ قصیدہ آج اس خط کے ساتھ ارسال کرتا ہوں۔ امید ہے کہ حضرت اس کو پڑھ کر محظوظ ہوں۔ خدا آپ کو قیامت تک سلامت رکھے! مگر جب تک امیر حمزہ کا قصہ مشہور رہے گا، یہ قصیدہ بھی شہرت پزیر رہے گا[2] ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب۔ ۲۱ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۵ء

یا وہاب!

زہی! دو چشم تو در معرضِ سیہ کاری — چو بختیارک و بختک، بمردم آزاری
زہی! بزور بدیع الزمانِ کشتی گیر — کہ کوہسار، چو نارنجِ تر، بیفشاری
زہی! خیالِ تو آدم ربا، چو تُندک دیو — دماغِ اہلِ نظر قافِ اوست، پنداری
زغمزۂ تو چگویم؟ کہ آن بود زعمر[3] — دلیر دجست و ہنرمندتر بعیاری
اگر تو نیستی از ساحرانِ انتریا[4] — چرا، بلہو، ہمی آتش از ہوا باری؟
بدین جمال کہ داری، عجب مدار، اگر — کند چکیدۂ قدرت ترا پرستاری
بہر رہ روی تو گردیدم آفتاب پرست — نہ ایرجم کہ عبث تن دہم بدین خواری
سپس بمذہبِ تو رخ، کہ بودہ ماہ پرست — ترا پرستم ازین رو کہ ماہ رخساری
توئی بمعنیٔ اصلی و بود نورُ الدّہر — ہمین بنام، کہ معنی نداشت، پنداری
چکد ز زلفِ تو خونِ ولم بدانگونہ — کہ ریزد از لبِ زنگی در آدمی خواری

(۲) اصل میں التزام ہے۔

(۳) میرزا صاحب نے اس نام کا الف اور لفظ دونوں غلط لکھے ہیں۔ یہ نام "عمرد" بسکون میم و زیادۃ دال بعد راء ہے۔ میں نے از راہِ احتیاط اعراب کا اضافہ کر دیا ہے۔ تاکہ "عمر" بضم میم و فتح عین سے التباس دور ہو جائے۔

(۴) "سبد پیما" کے دونوں ایڈیشنوں میں "عنطلیہ" ہے۔

فغان ز بارِ غمِ دهر! کان بسنجیدن — عمو و خسروِ هند است در گرانباری
به پیشِ چرخِ مُشعبد، چه هوشیار و چه مست؟ — که این بعربده، همچون عمر، زطرّاری
زروی، رینِ تراشد همی به بیهوشی — ز فرق، تاج رباید همی بهشیاری
خصومتی بمن افتاده زالِ دنیارا — که "دُم خبیثه" بود در فنونِ مکاری
بجیشِ عشق منم سر برهنه تپشی — که موی سر بسرم کرده است دستاری
نهیبِ فتنه به الجوبِ شش گزی ماند — که بود هر لگدش را جراحتِ کاری
شدست لاغریِ من گلیمِ غیبیِ من — که باشم و توام از حاضران نه انگاری
منم که فکرِ من اندر زمینِ شعر و سخن — همی گزشت ز اشقر به تیز رفتاری
چه اوفتاده؛ که یارب، کنون، چه زائیس — بخاک و خون تپدم تن همی به ناچاری
چنان بخوردنِ غم عادیم که چون عادی — نبوده هیچگهی سیریم ز پُر خواری
نهاده همنفسان نامِ من ملک قاسم — زخون دیده بود بسکه جامه گلناری
رسیده نجل بفکرِ من از عمر میراث — که هیچگه ندهد در سخن مرا یاری
دروغ گفته ام آن فکر نیز زنبیل است — که گم شود ز عمر دردم گرفتاری
چو حمزه را بجهان، بعدِ مرگِ مهرنگار — ز تیغ و تاج و نگین روی داد بیزاری
نماند در نظرِ دزدِ کهنه اسلوبی — جز آن که باز کشاید دکانِ عطاری
دل است حمزه و لب در فسونگریِ عمر است — بدا![1] کسی که ز دل نبودش مددکاری
شد آن که بود کلامم طلسمِ گوهر بار — همارَه[2] نهر ز آبِ گهر دران جاری
چو حمزه، کِش بعقابین در کشید فلک — به دامِ وام، نفس میکشم بدشواری
لقاست قرض منم حمزه و زبرِ منند — چهل خلیفه، تقاضائیانِ بازاری
چو ساحران، همه را شغلِ آتش افشانی — چو اژدها، همه را ذوقِ آدم اوباری[3]
نه زهر مهره نشد زهرِ حمزه به، آن به — که نوشداروی نوشیروان بچنگ آری
مگر بفضلِ وی آیم برون ز بندِ بلا — چنانکه حمزه، به نیروی پیر فرخاری
امیر کلبِ علیخان بهادر، آن که بود — عدیلِ حمزه در ایشهندی و دستاری

(۱) مانند خوشا، بسیار بد (منه). (۲) همارَه بمعنی آدم اوباری او باریدن یعنی ... نزدیک به فرد بودن. او مارِ صیغهٔ امر در آخر تخاطبی، مردم آزاری شده است (منه). (۳) میرزا صاحب نے لفظ تنبیہ ... لیکن یہ تو بسبب بفتح الباء ہے۔

درش نوازشِ طبلِ سکندری دارد — خهی! بلندیٔ آوازهٔ جهانداری
بود پلارکِ افراسیابیش در کف — که هیچگه نشود، چون هلال، زنگاری
چگویم از نمطِ لشکرِ ظفر پیکر! — ق که در شمار نیاید هم زبسیاری
همه مقابلِ مُقبل، به ناوک اندازی — همه مساهم خسرو، به طاقت اظهاری
بیا به بین که در اردوی این امیرِ کبیر — سپرده اند علمشاه را علمداری
چقدر آن که جلودارِ حمزه بود، اینک — رسیده است بخاقانِ چین، جلودارش
سزد که فخر بر اقبالِ خود کند لشکر — ازین که یافته توقیعِ گرز برداری
مپرس بر درش از هستیٔ زمرد شاه — مگر یکی بود از کافرانِ زنهاری
شنیدهٔ که خداوندِ باختر چون بود؟ — کنون به بندگیٔ خواجه گشت اقراری
گزشت آن که "چه تقدیر کرده ام" گفت — بمقتضای غلط فهمی و غلط کاری
کنون بعجز "چه تقصیر کرده ام" گوید — زبندگانِ خدا چون بوی رسد خواری
رموزِ حمزه فرو هل[1] خمش نشین غالب — چرا مرا بسخنهای هرزه آزاری؟
زتست رونقِ گیتی به دانش آرائی — زتست زینتِ معنی به نغز گفتاری
قصیدهٔ تو ولی، کاسهٔ گدائی رتست — ستوه آمده باشی ز رنجِ ناداری
غمین مباش که از گنج خانهٔ نواب — نود آن قدر که بدل داشتی بدست آری
بوقتِ گدیه گدارا دعاست دست آویز — برآر دست بدرگاهِ حضرتِ باری
چراغِ دودهٔ سرور، علی محمد خان — گزین همالِ تمر[2] درفنِ سپهداری
ز روی کلبِ علی خان همیشه روشن باد! — چنانکه تابشِ مهر از سپهرِ زنگاری

(۵۵)

۱۱

حضرت ولی نعمت آیهٔ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم عرض یه ہے۔ فقیرِ تکیه دار، روزینه خوار، غالبِ خاکسار حیران ہے که شکر بجالائے آپ کی عنایت کا، یا ذکر کرے آپ کی کرامت اور ولایت کا۔ آپ بے شبہه رونقِ مسندِ علم و یقین ہیں؛ تکلف برطرف امیر المسلمین

(۱) فرو هل یعنی گزار۔ از بیجا التزام موقوف است۔ (منه)
(۲) گزین بجای گزید مستعمل دهلی زبان قریب همسائی کمبوه و بیم مفهوم در ترکی فولاد را گویند و اسم شاهی است از اولاد آنقوا۔ دانیکه عجمه نویسند، طرز اخافت اعراب با حروف ک و ن۔

ہیں - یہ نہ فقط از روی ارادت ہے، بلکہ یہاں مشاہدۂ خرقِ عادت ہے -
ان دنوں میں متفرقات کے قرضدار[1] سرگرمِ تقاضا، بلکہ آمادۂ شور و غوغا تھے۔
دو سو روپیہ کی ہنڈوی صراحیٔ آبِ حیات ہو گئی، دامِ مرگ سے نجات ہو گئی۔
لطف یہ کہ آج بروزِ دوشنبہ ۲۱ اگست کو نو بجے اوّلِ روز ایک قصیدہ کا
لفافہ بھیجا گیا۔ اوسی دن بارہ پر تین بجے یہ کرشمۂ کرامت دیکھا گیا۔ قصیدہ کے
لفافہ میں ایک عرضداشت ہے۔ اوس سے قصیدہ کی حقیقت، اور خود اوس
نظم سے طرزِ نگارش کی جدّت ظاہر ہو جائیگی۔ حضرت کے انبساطِ خاطر کے واسطے
یہ ایجاد ہے۔ مجھے ہر طرح کی نظم و نثر سے آپ کی خوشی اور خوشنودی مراد ہے۔
انجامِ قصیدہ میں جو قرض کے گلے پائے جائیں، اوس مجموع میں سے اہلِ بازار
منہائی کئے جائیں۔ کوٹھی والے ساہوکار "چہل خلیفہ" گنے جائیں ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

ترقیٔ عمر و دولتِ خداوند کا طالب، غالب
نگاشتہ دوشنبہ ۲۱، اور روان داشتہ
سہ شنبہ ۲۲ اگست سنہ ۱۸۶۵ -

(۵۶)
۱۲
حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے - میں طبیب نہیں، مگر تجربہ کار ہوں - ستّر برس کا
آدمی ہوشیار ہوں - اور سے یہ کہا نہیں جاتا، حضرت پر بغیر ظاہر کئے رہا
نہیں جاتا - خدا جانے، اور طبیب کیا سمجھے ہوں گے کہ کیا تھا - میرے نزدیک
یہ اشتراکِ معدہ و قلب یہ مرض طاری ہوا تھا - اب آپ کو حفظِ صحت کیواسطے
گاہ گاہ نارجیلِ دریائی وجدوار کا استعمال ضرور ہے - اور معجونِ طلائی عنبری
تقویتِ قلب میں مجوزۂ حکیم میر علی خاں[2] مغفور ہے - ورقِ طلا، عنبرِ اشہب،
عرقِ کیوڑہ، قند، کثرتِ اجزا اس ترکیبِ خاص میں ناپسند - کثیر الاجزا اور

(۱) میرزا صاحب نے قربان علی بیگ سالک کے خط میں بھی قرضخواہ کی جگہ قرضدار استعمال کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں یہ غلط استعمال فصحا کی زبان پر بھی تھا۔

معجونیں ہیں: مفرح بوعلی سینا، خمیرۂ مروارید، خمیرۂ گاؤزبانِ عنبری، ما اللحم غیرِ مُنَشّی، جس میں طیور کے گوشت اور ادویۂ مفرح و مقوی حرارت و برودت میں معتدل (۱) گاہ گاہ سکنجبین و گلاب پی لیا کیجے۔ غذا میں گوشتِ طیور اکثر، بیضۂ نیم برشت اکثر لیکن یہ خیال رہے کہ بیضۂ مرغ و لحمِ طیور ایک جلسہ میں تناول نفرمائیے۔ بکری کے گوشت کے ساتھ بیضۂ مرغ جائز اور لذیذ اور مرغوب۔ پودینہ کا عرق، چھوٹی الائچی کا عرق ہمیشہ دواخانے میں موجود رہے۔ عطریات کے استعمال میں مبالغہ، بعدِ غذا مباشرت سے پرہیز۔ شوربای پاچۂ گوسفند مائدۂ خاص پر موجود رہے۔ بحسبِ رغبتِ طبیعت نوشجان فرماتے رہیے ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزون!

سلامت و صحت کا طالب، غالب۔ نگاشتۂ سہ شنبہ، و رواں داشتۂ سہ شنبہ (۲)

(۵۷)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ شرف افزا عطوفت نامہ عزّ ورود لایا۔ اگست ۱۸۶۵ کی تنخواہ کا سو روپیہ از روی ہنڈوئ ملفوفہ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِ ادب ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

دوشنبہ ۱۱ ستمبر سنہ ۱۸۶۵ -

(۵۸)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ چاہتا ہوں کہ کچھ لکھوں؛ مگر نہیں جانتا کہ کیا لکھوں لازم تھا کہ تعزیت نامہ بزبان فارسی و عبارتِ بلیغ لکھوں۔ آپ کے قدموں کی قسم! دل نے قبول نکیا۔ آرائش گفتار، نظماً اور نثراً، واسطے تہنیت کے ہے،

(۱) یہاں کوئی ایک لفظ ساقط معلوم ہوتا ہے۔

کہ دل کثرتِ نشاط سے گل کی طرح کھل رہا ہے، طبیعت راہ دیتی ہے، الفاظ ڈھونڈھے جاتے ہیں، معنی پیدا کئے جاتے ہیں۔ اب میں نیم مردہ، دل پژمردہ، خاطر افسردہ، جس باب میں لفظ و معنی فراہم کیا چاہوں، وہ سراسر طبع کے خلاف جس بات کا تصور ناگوار ہو، اوس کے تذکرہ سے جی کیوں نہ بیقرار ہو؟ یہ میری قسمت کی خوبی ہے کہ ہنوز تہنیت اور مدح کا حق ادا نہوا تھا کہ مرثیہ لکھنا پڑا۔ اگر ایک بات میرے خیال میں نہ آئی ہوتی، تو مجھے زندگی دشوار تھی۔ یعنی، حضور کو ابتدائی جلوس میں وہ رنج پہنچا کہ اوس سے زیادہ تصور میں نہیں آتا۔ پس وسادہ نشینی کی بدایت اور غمگینی کی نہایت یہ چاہتی ہے کہ اب مدّۃ العمر، ابداً موبّداً، حضرت کو کوئی غم نہو۔ ہمیشہ جہاندار و جہانستان و شاد و شادماں رہیں(۱) ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

آپ کے قدیموس کا طالب، غالب۔ ۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۵ء۔

دریغا! کہ ماند تہی قصرِ دولت زخاتونِ نامی، سکندر زمانی
چو "سیّارِ روضہ" بود سالِ فوتش سپس اسم وی باد جنت مکانی
۱۲۸۲

(۵۹)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ ہرچند آبدار خانے کے ساتھ ہونے سے پانی کی طرف سے خاطر جمع ہے، کہ حضور جو پانی ہمیشہ پیتے تھے، وہی پیتے ہوں گے، مگر ہرجِ سفر اور اختلافِ ہوا کا خیال ہے۔ توقع رکھتا ہوں کہ نویدِ صحت واعتدالِ مزاجِ اقدس سے عزِّ اطلاع پاؤں۔ بُعد اگرچہ بہت نہیں، لیکن طبع پر گراں ہے۔ چشمِ شوق ورودِ موکبِ عالی کی نگراں ہے۔ بقولِ استاد بہ تغیّرِ لفظ ؎ جو تم پھر آؤ، تو، حضرت، پھریں ہمارے دن(۲)۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!
دوامِ بقای حضور کا طالب، فقیر غالب
چہار شنبہ ۸ نومبر سنہ ۱۸۶۵ (۱)

(۶۰)
۱۶

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ مراد آباد پہنچنا، بعد پالکی کے اوتر آنے کے پل کا ٹوٹ جانا، گاڈی اسباب، یہانتک کہ رختِ خواب کا مع آدمیوں کے اوسی زمہریر کے میدان میں رہنا، بغیر جاڑے کے کچھ نہ کھانا، خیر جو اون پر گزری، وہ جانیں، میں مراد آباد کی سرا میں ایک چھوٹی سی حویلی میں ٹھہرا۔ بھوکا، پیاسا، مکمل اوڑھکر پڑ رہا۔ یہ شعر اپنا پڑھ پڑھ کر صبح کی ؎

گرمِ فریاد رکھا شکلِ تہائی نے مجھے
تب اماں ہجر میں دی برد لیالی نے مجھے

صبح کو خستہ و بخار اوٹھا۔ صاحبزادہ ممتاز علی خاں بہادر (۲) کے بھیجے ہوئے دو فرشتے آئے۔ اوٹھا کر سعید الدین خاں صاحب (۳) کے ہاں لے گئے۔ صاحبزادہ صاحب نے وہ تعظیم و تکریم اور سعید الدین خاں صاحب نے وہ تکریم و تعظیم کی، کہ میری ارزش سے زیادہ تھی۔ ناگاہ مولوی محمد حسن خاں بہادر صدر الصدور (۴) آئے، اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔ پانچ دن وہاں رہا۔ بھائی نواب مصطفیٰ خاں بہادر (۵) وہیں مجھسے آکر ملے۔ دوسرے دن وہ رہگرای دارالسرورِ رامپور، اور میں جادہ نوردِ ستم آبادِ دہلی ہوا۔ دوشنبہ ۲۰ شعبان ۱۲۸۲، ۸ جنوری ۱۸۶۶ درِ خمکدہ پر پہنچا۔ حضور کے اقبال کی تائید تھی، ورنہ میں اور جیتا دلی پہنچتا! (۶)

۵

مغلوبِ غلبۂ غمِ دل، غالبِ حزین
"کاذر تمش، زضعف، توان گفت جاں نبود"

از رامپور زندہ بدلی رسیدہ است
مارا بدین گیاہِ ضعیف این گمان نبود[۱۱]

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزون!
نجات کا طالب، غالب
چارشنبہ ۲۲ شعبان و ۱۰ جنوری سالِ
جشنِ حضور[۱۲]، ۶۵ھ

(۶۱)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامۂ والا کے مشاہدہ نے مجکو میری حیات پر یقین عنایت کیا۔ اس سفر کا حال کیا عرض کروں؟ دلی سے رامپور تک، ذوقِ قدمبوس میں جوانانہ گیا۔ اختلافاتِ آب و ہوا و تفرقۂ اوقاتِ غذا کو ہرگز نمانا، اور رنج راہ کو ہرگز خیال میں نہ لایا۔ وقتِ معاودت، اندوہِ فراق نے وہ فشار دیا، کہ جوہرِ روح گداز پاکر ہر بُنِ مو سے ٹپک گیا۔ اگر آپ کے اقبال کی تائید ہوتی تو دلی تک میرا زندہ پہنچنا محال تھا۔ جاڑا، میعنہ، قبض و انقباض، نقدانِ جوع، فاقہ ہای متواتر، منزلہای نامانوس، ہاپوڑ تک آفتاب کا نظر نہ آنا، شب و روز ہوای زمہریر کا جانگزا رہنا، بارے ہاپوڑ سے چلکر نیّرِ اعظم کی صورت دکھائی دی۔ دھوپ کھاتا ہوا دلی پہنچا۔ ایک ہفتہ کوفتہ و رنجور رہا۔ اب ویسا پیر و ناتواں ہوں، جیسا کہ اس سفر سے پہلے تھا۔ خدا وہ دن کرے کہ پھر اوس در پر پہنچوں[۱۳]! ۵

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!
نجات کا طالب، غالب۔
۲۱ جنوری سنہ ۱۸۶۶

(۶۲)
۱۹

حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ وقیع مع سو روپیہ کی ہنڈوی کے عزّ ورود لایا۔ جنوری سنہ ۱۸۶۶ کی تنخواہ کا روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔ آپ کے غلامِ نو خرید[1] نے اپنی تنخواہ کا حال پوچھا۔ میں نے حضور کا خط اوسے دکھا دیا۔ ناامیدانہ چُپ ہو رہا۔ اب اِس درویشِ دلریش کا حال سنیئے۔ سامعہ مدت سے کھو بیٹھا۔ اب آنکھوں کو بھی رو بیٹھا۔ دور سے صرف قدو قامت آدمی کا دیکھا جاتا ہے۔ چہرہ اچھی طرح نظر نہیں آتا ہے۔ فُقدانِ طاقت، سقوطِ اُشتہا، ضعفِ بصر، ضعفِ بخت۔ میرا حال بعینہٖ میرے اس شعر کے موافق ہے ؎

در کشاکشِ ضعفم، نگسلد روان از تن — اینکہ من نمی میرم، ہم زنا توانیہاست

زیادہ حدِ ادب ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب۔

۱۵ فروری سنہ ۱۸۶۶۔

(۶۳)
۱۹

حضرت ولی نعمت آیہ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ وقیع کے ورود نے میری آبرو بڑھائی۔ اوس میں سے میں نے سو روپیہ کی ہنڈوی پائی۔ زہے متدرجۂ ہنڈوی معرضِ وصول میں آیا۔ فروری سنہ ۱۸۶۶ کی تنخواہ کا روپیہ میں نے پایا۔ زیادہ حدِّ ادب ؎

تم سلامت رہو قیامت تک
دولت و عزّ و جاہ روز افزوں

معروضہ ۱۵ مارچ سنہ ۱۸۶۶ — عنایت کا طالب، غالب

(۶۴)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ اپنا حال اس سے زیادہ کیا لکھوں کہ آگے ناتواں تھا، اور اب نیمجاں ہوں۔ برخوردار نواب مرزا خاں اپنے مشاہدہ کے مطابق جو میری حقیقت عرض کرے، وہ مسموع و مقبول ہو[۱]۔

حضور اس مطلع کے لفظ و معنی کی جدّت و جدّت کی داد چاہتا ہوں[۵]

ہم در قیام زندہ نیم کز برای خویش آنوقت لای نافیہ ام از دو پای خویش"

ایک غزل نئی طرز کی، نئی بحر میں، عرض کرتا ہوں[۲]۔ یہ جشنِ حال کی نذر ہے۔ خدا کرے، مقبول ہو! زیادہ حدِّ ادب ۱۲

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۲۹ مارچ سنہ ۶۶ ۱۸۔

بحرِ ہزج مثمن سالم

فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلاتن

ای خداوندِ خردمند و جہان داورِ دانا!
دی، بہ نیروی خرد، بر ہمہ کردار توانا!
ای برفتار و بدیدار، بزیبائی و خوبی
سروِ نوخاستہ آسا، مہِ ناکاستہ مانا!
بہ ادا پایہ فزایا، بنظر عقدہ کشایا!
بکرم ابر عطایا، بغضب برق سنانا!
بہ نگہ خستہ نوازا، بسخن بندہ طرازا!
بہ قلم غالیہ سایا، بہ نفس عطر فشانا!
شہ نشان، کلب علیخان کہ توئی یوسفِ ثانی

نبود ثانی و ہمتای تو در دہر، ہمانا!
دانم، از حال و مآلم خبری داشتہ باشی
سر نوشتِ ازلی، گرچہ ندارد خطِ خوانا
دشمنم چرخ و تو بینی و نسوزی بعتابش
بہ عدد صاعقہ ریزا، بہ محب فیضرسانا!
جانشینِ تو کند نامِ ترا زندہ بگیتی
باد فردوسِ برین جای تو، فردوس مکانا!
غالب، از غم چہ خروشی؟ بتو زیباست خموشی
با کریم ہمہ دان ہیچ مگو، ہیچ مدانا![1]

(۶۵)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت، سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ مکرمت ظہور مع ہنڈوی عزّ ورود لایا۔ سو روپیہ تنخواہِ اپریل سنہ ۱۸۶۶ کا معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عنایت کا طالب، غالب
۱۴ مئی سنہ ۱۸۶۶ عیسوی[2]

(۶۶)

حضرت ولی نعمت، آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ جب بادشاہِ دہلی نے مجکو نوکر رکھا، اور خطاب دیا، اور خدمتِ تاریخ نگاریٔ سلاطینِ تیموریہ مجکو تفویض کی، تو میں نے ایک غزل طرزِ تازہ پر لکھی۔ مقطع اوس کا یہ ہے ؎

غالب، وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے جو کہتے تھے: "نوکر نہیں ہوں میں"

اب مقطع کی صورت بدل کر حضور کی نذر کرتا ہوں۔ خدا کرے(۱) کہ حضرت کے پسند آئے! زیادہ حدّ ادب ؎

تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضداشتِ اسداللہ بیدستنگاہ:

۹ جون سنہ ۶۶

دایم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل؟
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب، زمانہ مجھکو مٹاتا ہے کس لئے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟
لعل و زمرّد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم میری آنکھوں سے کیوں دریغ؟
رُتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجکو منعِ قدمبوس کس لئے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں؟

قطعہ

در پر امیرِ کلبِ علی خاں کے ہوں مقیم
شائستۂ گدائی، ہر در نہیں ہوں میں

بوڑھا ہوا ہوں، قابلِ خدمت نہیں اسدؔ
خیرات خوارِ محض ہوں، نوکر نہیں ہوں میں(۲)

(۶۷)
۳۳

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل ایک عرضداشت مع ایک غزل کے ڈاک میں بھیجی گئی۔ شام کو منشورِ عطوفت مع ہنڈوئ تنخواہِ مئی سنہ ۱۸۶۶ عزّ ورود لایا۔ سو روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔ آج صبحدم وقتِ تحریر اس عرضی کے حضرت فردوس مکاں کا دیوان پیشِ نظر تھا۔ اوس میں یہ شعر نظر پڑا۔

(۱) خدا کرے کو سہواً مکرر لکھ دیا ہے۔

اوس کے مضمونِ حکیمانہ و عارفانہ نے بڑا مزا دیا۔ یقین ہے کہ اوس کو پڑھ کر حضرت بھی حظ اوٹھائیں گے ؎

وہ جس طرح سے جسے چاہے اوسطرح پالے
کسی کا کچھ نہیں پروردگار پر لیسنا

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضۂ اسد اللہِ ترقی خواہ

معروضۂ دہم جون سنہ ۱۸۶۶ء۔

(۶۸)

۴۴

حضرت ولی نعمت، آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ وقیع عزِّ ورود لایا۔ غزل کے پسند آنے نے میری سخنوری کا رُتبہ بڑھایا۔ فلک نہیں چاہتا کہ میرا کلام مقبولِ طبایعِ اہلِ کمال ہو۔ حضرت کو خالقِ اکبر نے وہ قوت اور طاقت عطا کی ہے کہ آپ علی الرّغمِ فلک کام کرسکتے ہیں ؎

قسمت بُری سہی، پہ طبیعت بُری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

فلک نے مجھ پر بڑے بڑے اوبھاؤ غم و فکر کے ڈالے، مگر میری طبیعت بدل نسکا۔ میں نے بجنابِ باری بہت تضرّع وزاری کی، مگر اپنی قسمت بدل نسکا۔ زیادہ حدِّ ادب ؎

تم سلامت رہو قیامت تک ! دولت و عزّ و جاہ روزافزوں
تم سلامت رہو ہزار برس ! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

عرضداشتِ اسد اللہِ بیدستگاہ۔ ۲۸ جون سنہ ۱۸۶۶ء

(میرزا صاحب نے اپنے اُس قطعے کی ۱۰ اچھپی ہوئی کاپیاں، جو آغا احمد علی احمد صاحبِ موید برہان کے جواب میں لکھا تھا، نواب خلد آشیاں کو ایک

لفافے میں بند کر کے ۳۱ جولائی سنہ ۱۸۶۶ء کو روانا کی تھیں۔ یہ مطبع اکمل المطابع دہلی میں یکرحی چھپی تھیں، اور آجتک دارالانشا میں محفوظ ہیں]

(۶۹)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت، سلامت! ۲۵

بعد تسلیم معروض ہے۔ آج شنبہ ۱۰ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۶ کی ہے۔ فقیر چشم براہ تھا کہ اب ڈاک کا ہرکارہ آتا ہے، اور ہنڈوی ملفوفۂ نوازشنامہ لاتا ہے ناگاہ اس وقت ڈاک کا آدمی ایک خط برخوردار منشی سیلچند(۱) کا لایا۔ اوس میں مندرج تھا کہ تو نے جون سنۂ حال کی تنخواہ کی رسید کیوں نہ بھیجی، اور بعد اس کے یہ لکھا تھا کہ جولائی کی تنخواہ کی چٹھیاں ہوتی جاتی ہیں۔ اب دو ایکدن میں تیری تنخواہ بھی بھیجی جائیگی۔ متحیّر کہ یارب! میں حسبِ معمول تنخواہِ جون کی رسید ارسال کر چکا ہوں۔ اب دوبارہ رسید کیوں مانگی جاتی ہے؟ پھر یہ تو گویا پیامِ مرگ تھا کہ جولائی کی تنخواہ اب روانا ہوگی۔ یارب! ۱۰ کو وعدہ، ۱۳، ۱۴ کو چلے گی، مینوّیں تک مجھے پہنچیگی، اور میرا حال یہ کہ انگریزی تنخواہ گھر میں اور کچھ قرض کی قسط میں جاتی ہے۔ حضور کے عطیّہ پر میرا اور شاگرد پیشہ کا اور حسین علی کا گزارا ہے۔ عالم الغیب جانتا ہے، جس طرح گزرتی ہے۔ چار سو ساڑھے چار سو کا قرض باقی ہے۔ اب کوئی قرض بھی نہیں دیتا۔

خلاصہ دو عرضیں ہیں: ایک تو یہ کہ میں جون کی تنخواہ کی رسید بھیج چکا ہوں۔ اگر ڈاک میں تلف ہوگئی ہو، تو اور لکھ بھیجوں؛ دوسری یہ کہ اس مہینے کی، یعنی جولائی کی، تو تنخواہ خیر ۲۰ ماہِ اگست تک پہنچ جائیگی، آیندہ کو حکم ہو جاے کہ ہر مہینے کی پہلی دوسری کو فقیر کی تنخواہ، کہ وہ محض صیغۂ خیرات ہے، بھیجی جایا کرے ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

(۷۰)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ پہلے اپنا حال عرض کروں، تب کچھ اور مدعا لکھوں۔ غم نے بشمول بڑھاپے کے پست و مضمحل کر دیا ہے۔ حضرت کے قدموں کی قسم! نہ حواس درست، نہ رای صحیح۔ برسوں سے مکروہات میں مبتلا رہتے رہتے اب طاقت تحمل کی نرہی۔ خدا جانے، کیا ہوتا ہے، کیا سمجھتا ہوں، کیا کرنا چاہئے، کیا کرتا ہوں۔

کل آخرِ روز میر منشیٔ حضور کا خط آیا۔ جون کی تنخواہ کی رسید کے نہ پہنچنے کی اطلاع پائی۔ تہیدستی و قرض کے رنج میں خستہ و آزردہ بیٹھا تھا۔ اسی وقت عرضی لکھی۔ اگرچہ ڈاک کا وقت نہ تھا، مگر بھیجدی۔ آج آخرِ روز توقیع وقیع میر جولائی کی تنخواہ کی ہنڈوی کے پہنچا۔ ہنڈوی مختار کار کو دی، اور یہ عرضی لکھنے بیٹھا۔ لکھ کر لفافہ کر رکھتا ہوں۔ کل صبحدم ڈاک میں بھیجدوں گا۔

اگر عرضیٔ سابق میں کوئی بات گستاخی و دیوانگی و بدحواسی کی ہو، تو فقیر کی خطا معاف ہو۔ میر منشی صاحب کے اگر مخالفِ طبع کوئی لفظ ہو، تو وہ بھی درگزر کریں۔

جون کی تنخواہ کی رسید کا لفافہ ڈاک میں گم ہو گیا ہوگا۔ اگر میں بھی بھول گیا ہوں، تو بعید نہیں؛ بلکہ اغلب ہے کہ غالب کو سہو ہوا ہو۔ ملازمانِ درِ دولت پر ظاہر ہو کہ جون کی تنخواہ جولائی میں، اور جولائی کی اگست میں میں نے پائی۔ آئندہ ہر انگریزی مہینے کی دوسری تیسری کو روانگیٔ ہنڈوی کا متوقع ہوں۔ زیادہ خدِ ادب[1]؛ ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

۱۳ اگست سنہ ۱۸۶۶ء۔ عفو و رحم کا طالب، غالب سم

(۷۱)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت، مُدَّ ظِلُّہُ العَالِی!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ وقیع مع دیباچۂ شرحِ اشعارِ بدرِ چاچی[1] عزِ ورود لایا۔ کیا عرض کروں کہ کیا عالم نظر آیا! واقعی اقتباحِ کلام بطرزِ میرزا طاہرِ وحید[2]، اور پھر نگارشِ مطالب بشیوۂ میرزا جلالای طباطبائی[3] ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں دیباچۂ اعجازِ خسروی[4] کا رنگ جلوہ گر ہے۔ پس ناقدِ بصیر کے نزدیک یہ نگارش، طاہرِ وحید اور جلالا کی عبارت سے بہتر ہے۔ یہ عرضداشت جلد بھیجتا ہوں، تاکہ حضرت پر پہنچنا اوس دیباچہ یا تقریظ کا ظاہر ہو جائے۔

برسات ایسی ہوئی ہے کہ میں باون، ترپن برس سے یہاں رہتا ہوں، عرش آرامگاہ اکبر شاہ[5] کے عہد میں ایکبار ایسی برسات دیکھی تھی، یا امسال نظر آئی ہے۔ اوراقِ مرسلۂ حضور مومیں جامہ میں لپیٹ کر ببیلِ پارسل ارسال کروں گا، یا پرسوں دوشنبہ کو یا سہ شنبہ کو ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

روز شنبہ یکم ستمبر سنہ ۱۸۶۶۔ نجات کا طالب، غالب[6]

(۷۲)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ مکرمت ظہورِ عزِ ورود لایا۔ سو روپیہ بابت تنخواہِ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۶ معرضِ وصول میں آیا۔

نثرِ نثرہ نثار[7] کے اوراق ۳ ستمبر، ماہِ حال، کو ارسال ہوئے ہیں نظرِ انور سے گزرے ہونگے[8]

اردو کا دیوان ایک شخص کو دیا ہے۔ فارسی دیوان کا شیرازہ کھول کر چند شخصوں کے حوالے کیا ہے۔ بعدِ اتمامِ تحریر نذر کیا جائیگا[9]

بھائی ضیاءالدین خاں[1] کا مجموعۂ نثر و نظمِ فارسی وارد ہوا، سراسر دیکھا ہوا میرا، جو اون کے کتابخانہ میں تھا، غدر میں لٹ گیا۔ بعدِ غدر ذوقِ شعر باطل اور دل افسردہ ہوگیا۔ دو تین غزلیں، فارسی، ہندی، جو لکھی ہیں، اوس کا[2] انتخاب بھی پہنچیگا ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

اسد اللہِ بیدستنگاہ۔

دوشنبہ ۱۰ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء۔

(۷۳/۲۹)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ خاطرِ اقدس میں نگزرے کہ غالب تعمیلِ احکام میں کاہل ہے۔ بصارت میں فتور، ہاتھ میں رعشہ، حواس مختل۔ ناچار کاتب کی تلاش کی۔ شہر سراسر ویران ہے کاتب کہاں! بارے ایک دوست نے کاتب نشان دیا۔ اردو کا دیوان، اشعار پر صاد کر کے، اوس کو حوالہ کیا۔ کل وہ اجزای منقولہ آئے۔ آج بطریقِ پارسل مع اس عرضی کے ارسال کئے۔

خطِ کاتب کا مجکو پسند نہیں آیا۔ حضرت کو کیونکر پسند آئیگا! اغلاط اتنے تھے کہ مجکو تحریر کے برابر محنت پڑی۔

فارسی کے کلیات کا شیرازہ کھول کر، اجزا اوس کے احباب پر تقسیم کر دیئے ہیں۔ جابجا اشعار پر صاد کر دیئے ہیں۔ وہ بھی میرے انتخاب کے مطابق نقل ہو رہے ہیں۔ بعدِ اتمام وہ بھی پیشکش کروں گا۔ زیادہ حدِّ ادب۔

(۲) میرزا صاحب نے ازراہ سہو بجائے "اون کا" کے "اوس کا" لکھدیا ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

ترحم کا طالب، غالب۔

سہ شنبہ ۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ -

(میرزا صاحب نے اصلاحِ تقریظِ شرحِ بدیِ چاچی کے سلسلے میں چہار شنبہ ۱۹ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو ایک عریضہ روانا کیا تھا۔ مثل میں اُس کا لفافہ موجود ہے۔ جس کی عبارت اور ٹکٹ وغیرہ مثلِ سابق ہے۔ مگر لفافے کی پشت پر میر منشی صاحب لکھتے ہیں: "اصلِ خط در حضور پرنور، کہ بمقدمۂ تقریظِ شرحِ بدیِ چاچی بود، ماندہ۔ ۲۳ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء)

(۷۴)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ اردو دیوان کا انتخاب بھیج چکا ہوں۔ یقین ہے کہ حضرت کی نظرِ انور سے گزر گیا ہو۔ آج فارسی دیوان کا انتخاب بطریقِ پارسل اس عرضی کے ساتھ بھیجتا ہوں۔ اور بھائی ضیاء الدین خاں بہادر نے جو اوراق میرے پاس بھیجے ہیں، وہ بھی اسی پارسل میں رکھ دیئے ہیں[1]۔ حضرت اس غریب کا مجموعۂ نظم و نثر غدر میں لُٹ گیا۔ بعدِ غدر جو کچھ کہا ہے، وہ یہی ہے جو پہنچتا ہے۔

اس درویش نے صرف غزلیں[2] اور رباعیوں کا انتخاب بھیجا ہے۔ قصاید و قطعات و مثنویات کا انتخاب ابھی نہیں بھیجا۔ اگر حکم ہو، تو وہ بھی بھیجوں۔ زیادہ حد ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عنایت کا طالب، غالب۔

۲۴ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ -

(۲) میرزا صاحب نے اسی طرح لکھا ہے مگر ہونا چاہیے "غزلوں"۔

(۷۵)
۳۱

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ مکرمت ظہورِ عزِ ورود لایا۔ سو روپیہ بابت تنخواہِ ماہِ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ معرضِ وصول میں آیا۔ اشعارِ فارسی وارد پہنچے۔ خدا کرے پسند آئیں! افسوس! کہ برخوردار نواب مرزا خاں نے میرا حال سامعۂ اقدس پر عرض نکیا۔ حضور ملک و مال جس کو جسقدر چاہیں عطا کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے صرف راحت مانگتا ہوں۔ اور راحت منحصر اس میں ہے کہ قرضِ باقیماندہ ادا ہو جاے، اور آیندہ قرض لینے کی حاجت نہ پڑے ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عز و جاہ روز افزوں!

اسد اللہِ بید ستگاہ۔ ششم اکتوبر سنہ ۱۸۶۶۔

(۷۶)
۳۲

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت! بعدِ تسلیم معروض ہے اس عنایت نامے میں ایک فقرہ نظر پڑا کہ جس سے میں کانپ اوٹھا۔ "مرا از آن مشفق واسطۂ تلمذ بودہ است"(۱)۔ یہ ذلیل کو عزت دینی اور دکانِ بے رونق کی خریداری کرنی ہے۔ میں تو حضرت کو اپنا استاد اور اپنا مرشد اور اپنا آقا جانتا ہوں۔

بدوِ فطرت سے میری طبیعت کو زبانِ فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجکو ملے۔ بارے مراد بر آئی، اور اکابرِ پارس میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا، اور اکبرآباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا، اور میں نے اوس سے حقایق و دقایق زبانِ پارسی کے معلوم کیے۔ اب مجھے اس امرِ خاص میں نفس، مطمئنہ حاصل ہے۔ مگر دعوی اجتہاد

نہیں ہے، بحث کا طریق یاد نہیں"۔

میاں رانجو، جامعِ فرہنگِ جہانگیری[۲]، شیخ رشید، راقمِ فرہنگِ رشیدی[۳] عظمای عجم میں سے تھیں۔ ہند ان کا مولد، ماخذ ان کا اشعارِ قدما، ہادی ان کا ان کا قیاس، ٹیک چند[۴] اور سیالکوٹی مل[۵] ان کے پیرو۔ سبحان اللہ ہندی بھی، اور ہندو بھی۔ نورٌ علی نور!

فقیر اشعارِ قدما کا معتقد، اون لوگوں کے کلام کا عاشق۔ مگر جو لغات اون کے کلام میں ہیں، اوس[۶] کے معنی تو اہلِ ہند نے اپنے قیاس سے نکالے ہیں۔ میں ان کے قیاس پر کیونکر تکیہ کروں؟ اب جو پیر و مرشد نے لکھا کہ ارتنگ وارژنگ متحد المعنی اور آشیان ساختن وبستن وچیدن گھونسلا بنانے کے معنی پر ہے، تو میں نے بے تکلف مان لیا؛ لیکن نہ اون صاحبوں کے قیاس کے یموجب، بلکہ اپنے خداوندِ نعمت (کے)[۷] حکم کے مطابق ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت وعز وجاہ روز افزوں! ۲۸

انصاف کا طالب، غالب۔ ۱۷ اکتوبر ۱۸۳۶ء[۸]

(۷۷)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آج سہ شنبہ، ۱۶ ماہِ اکتوبر کی، دن کو بارہ بجے کھانا کھا کر بیٹھا تھا کہ توقیعِ وقیع آیا۔ پڑھتے ہی کانپ اوٹھا، اور عالم نظر میں تیرہ وتار ہوگیا۔ اگر حضور کے ارشادات کو بحث تعبیر کیا ہو، تو مجھے جنابِ الٰہی اور حضرتِ رسالت پناہی کی قسم! اگرچہ فاسق وفاجر ہوں، مگر وحدانیتِ خدا اور نبوتِ خاتم الانبیا کا بدل معتقد اور بزبان معترف ہوں۔ خدا ورسول کی قسم جھوٹی نہ کھاؤں گا۔ انکارِ بحث سے مراد یہ تھی کہ شعرای ہند کے کلام میں جو غلطیاں نظر آتی ہیں، یا ہندی فرہنگ لکھنے

(۶) میرزا صاحب نے "اوس کے" لکھا ہے۔ مگر یہاں ہونا چاہئے "اون کے"۔

(۷) یہاں لفظ "کے" ساقط ہوگیا ہے۔ آئندہ عریضے میں اس عبارت کو دہراتے ہوئے میرزا صاحب نے یہ لفظ لکھا تھا۔

والوں کے بیان میں جو نادرستی، اور باہم جو اون کی عقول میں اختلاف ہیں، اوس میں کلام نہیں کرتا۔ اپنی تحقیق کو مانتے ہوتے ہوں، اوروں سے مجھے بحث نہیں۔ باہمہ ضعف حافظہ یاد ہے کہ آخر میں یہ بھی لکھدیا تھا کہ ان دونوں باتوں کو میں نے مانا، لیکن نہ فرہنگ لکھنے والوں کی رای کے بموجب، بلکہ اپنے خداوند کے حکم کے مطابق۔ یہ کلمہ موجبِ عتاب نہیں ہوسکتا۔ اور اگر اس کو گناہ سمجھا جاتے ہے "آخر گناہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں۔" گناہ معاف کیجے اور نویدِ عفو سے مجھکو تقویت دیجے ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عفو کا طالب، غالب

(۷۸)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت! فتحمنہ

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ حضور کے لشکرِ نصرت اثر کا بسپہ سالاریٔ نوابِ معلی القاب، جناب مہدی علیخاں بہادر[1] اکبرآباد پہنچنا، اور خیامِ فلک احتشام کا وہاں نصب ہونا، اور رامپور سے اکبرآباد تک گھوڑوں کی ڈاک کا بیٹھنا اور حضرت کا سنبھل تک بسبیلِ ڈاک تشریف لیجانا، اور وہاں مزاجِ اقدس کا ناساز ہونا، اور دارالسلطنت کو معاودت فرمانا، یوں فیوں مسموع ہوا۔ غرض اس عرضداشت کی تحریر سے یہ ہے کہ حصولِ جواب سے آبرو، اور خیریت و عافیتِ مزاجِ مبارک سے عزّ و اطلاع پاؤں ؎

اخبار میں مسطور اور شہر میں مشہور ہے کہ حضرت اجلاسِ کونسل کے واسطے حسب الحکم گورمنٹ کلکتہ کو تشریف لیجائیں گے۔ نمکخوار دعاگوئی و مدح گستری میں بہانہ طلب رہتا ہے۔ اس تقریب کا ایک قطعۂ تاریخ سنہ ۱۸۶۶ عیسوی رقم کیا ہے۔ عرض کرتا ہوں۔ اگر پسند آے، تو اجازت ملجاے کہ اس کو کسی اخبار میں چھپوا دوں[2] ؎

قطعہ

چو نوّاب، از بہرِ اجلاسِ کونسل — بہ کلکتہ از رامپور آورد رخ
عدد را بگیر و بکش زود وی را — بجو سالِ اجلاس از "بختِ فرخ"
چو گویند، کز کشتنِ وی چہ خواہی؟ — بگو: حذفِ اعدادِ "وی"، "اینت پانخ!"

"اینت" لغتِ پارسی ہے، مرادف خبی و زشی، اور قتل کا مشارالیہ لفظِ "وی" ہے، جس کے ۱۶ عدد ہیں، اور "وی" کا مشار "عدد" ہے، بختِ فرخ کے ۱۸۸۲۔ جب اس میں سے ۱۶ کم کئے، تو ۱۸۶۶ رہے۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

۱۸ نومبر سنہ ۱۸۶۶ء

(۷۹)

حضرت ولیِّ نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ وقیع مع ہنڈوی تنخواہِ نومبر سنہ ۱۸۶۶ عیسوی عزِّ ورود لایا۔ سورہ پیہ معرضِ وصول میں آیا۔

قطعۂ تاریخ کے باب میں التماس یہ ہے کہ اب قوّتِ ناظمہ پر تصرف اور معنی آفرینی کا زور مطلق باقی نہیں۔ مگر ازراہِ فرطِ ارادت و محبّت ثناو دعا کے واسطے تقریب ڈھونڈھتا ہوں۔ جب موقع پاتا ہوں، کچھ عرض کرتا ہوں تخرجۂ لطیف ہات آگیا۔ اوسی پر مدعا کی بنا رکھی۔

پیرو مرشد، اگر غازی آباد سے حضور ریل پر سوار ہوں، تو فقیر کو تاریخِ ورودِ غازی آباد سے آگہی ہو جائے، تاکہ میں وہاں حاضر ہو کر قدمبوسی کی سعادت حاصل کروں۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضہ نگار اسداللہ

۸ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ عیسوی

(۸۰)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ ایک عرضداشت بھیج چکا ہوں۔ اوس کا جواب نہیں پایا۔ امیدوار ہوں کہ اس عرضداشت کے جواب سے محروم نہ رہوں گا۔ کل دن کو دس بجے سنا کہ عالی جناب نواب مہدیعلیخاں بہادر سواریٔ ریل آئے، اور املی کے محلّے میں ٹھہرے ہیں۔ کھانا کھاکر فوراً سوار ہوا۔ وہاں جاکے سنا کہ نوابصاحب ریل کے اسٹیشن[1] پر گئے ہیں۔ گھنٹا بھر بیٹھا رہا کہ حضرت آئے۔ آگے غازی آباد کے اسٹیشن[1] پر سے سواری ہوتی تھی۔ اب ولی محمد سوداگر کی کوٹھی کے پاس سے[2]، جو بیگم کے باغ کے عقب ہے، نیا اسٹیشن[1] قرار پایا ہے۔ سو صاحبزادہ صاحب نے آپ کے حضور میں اطلاع کی ہے۔ دیکھئے حضرت غازی آباد سے سوار ہوتے ہیں یا شہر میں سے؟

واسطے خدا کے! مجکو اپنے روزِ ورود و وقتِ ورود سے اطلاع بخشیں، اور اس عرضی کا جواب ایسا جلد عنایت ہو کہ فقیر بسر و سامان اپنا سامان درست کر رکھے[3]۔

حضرت کی توجہِ باطنی، جو ہمیشہ میری مصلحِ حال اور افزایشِ عزّ و وقار کی کفیل ہے، بعد ادای شکرِ الٰہی اوس کا سپاس بجالاتا ہوں۔

پیش از عذر گورنمنٹ کے دربار میں ۷ پارچے، اور جیغہ، سرپیچ، مالای مروارید، تین رقمیں جواہر کی مجکو ملتی تھیں۔ بعدِ عذر اگرچہ پنشن اور دربار بحال رہا، لیکن خلعت موقوف ہوگیا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب[4] کا کل ۱۲ پر چار بجے دربار تھا۔ حکم سب دربارداروں کو پہنچ گیا تھا۔ میں نوّاب مہدیعلیخاں صاحب کو رخصت کرکے گھر آیا۔ دو گھنٹے کے بعد دربار میں گیا۔ خیال یہی کہ ملاقات ہوگی، ایک رباعی کاغذِ مذہّب پر لکھی ہوئی نذر کروں گا، کلماتِ

(۱) میرزا صاحب نے اسی طرح لکھا ہے۔

(۲) یہاں لفظ (سے) زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

عنایت سنکر چلا آؤں گا۔ نہ مجھے کچھ احتمال، نہ صاحب کمشنر بہادر شہر کو علم۔ بارے بروقتِ ملاقات تعظیم معمولی اور مصافحہ کرکے لارڈ صاحب نے کھڑے کھڑے جیغہ، سرپیچ میری ٹوپی پر باندھا، اور فرمایا کہ "یہ ہم نے آپ کے واسطے رکھا تھا"۔ مالای مروارید میر منشی نے گلے میں ڈالدی۔ یہ پارچے سات مرحمت ہوئے:

دوشالا ۱، کمخواب کا تھان ۱، بنارسی تھان سنہری بوٹے ۱، بنارسی سیلا ۱، الوان کی چادر کنارہ کلابتون ۱، کناویز کا تھان ۱، الوان کی چادر بے کنارہ ۱۔

میں اس عطیہ کو آپ کی بخشش معنوی سمجھا ہوں، اور دوسری بخشش یعنی اس خط کے جواب کے جلد حاصل ہونے کا متوقع ہوں، زیادہ حدِ ادب ہے

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضداشت کے جواب کا طالب، غالب

روز سہ شنبہ ۱۸ دسمبر سنہ ۱۸۶۶۔

(۸۱/۳۷)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نوازشنامہ مع ہنڈوی صدر روپیہ عزِ ورود لایا۔ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ کی تنخواہ کا روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔

اللہ، اللہ! یہ فرطِ عنایت، یہ ظہورِ مکرمت کہ حضرت ڈاک میں سوار ہونے کو ہیں اور میرے نام خط کا حکم ہو، اور پھر وہ خط دستخط سے مزین ہو، دسمبر کی تنخواہ دسمبر ہی میں جاری ہو، اور جنوری کی تیسری تاریخ میرے پاس پہنچ جاے! ظہورِ آثارِ ربوبیت بوجیہ[1] احسن واکمل[2]

(۱) میرزا صاحب نے اس لفظ کو "بوجہ" لکھا ہے۔

(۲) یہ جریدہ میرزا صاحب نے کلکتے کے پتے سے لکھا تھا۔ چنانچہ لفافے پر تحریر ہے۔ کلکتہ محلہ کاشی پور خانہ نمبر ۱، اور نمبر ۵۔

(۸۲)
۳۸

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ حضرت کا رونق افزای کلکتہ ہونا از روی شمارِ رفتارِ ریل یقینی ہے۔ مگر وہاں کی آب و ہوا کا موافق آنا، اور جناب لاڑ و صاحب بہادر[۱۵] سے ملاقات کا ہونا، اور اجلاسِ کونسل کا وقوع میں آنا، یہ امور جب تک حضرت رقم نفرمائیں گے، دعاگو کے خیال میں کیوں کر آئیں گے؟ ناچار جُرأت بہم پہنچا کر اس عرضداشت کے جواب میں ان حالات کے انکشاف کا امیدوار ہوں[۱۶]۔

پیر و مرشد، حضرت کے تصدق سے قرض ادا ہو گیا۔ تنخواہ تے قسط سے، اور میں نے رنج سے رہائی پائی۔ ہم بدل و ہم زبان ثناخوانِ جُود و نوالِ، و دعاگوی دوامِ دولت و اقبال ہوں۔ آدھا قرض عطیۂ سابق میں، اور آدھا قرض عطیۂ حال میں ادا ہو گیا۔ کہ نہیں سکتا، اور بن کہے بنتی نہیں۔ اگر دونوں لڑکوں کا پچاس روپیے مہینا جنوری سنہ ۱۸۶۷ یعنی ماہِ حال و سالِ حال سے جاری ہو جائیگا، اور ماہ بماہ فقیر کے روزینہ کے ساتھ پہنچا کریگا، تو آپ کا نمکخوار پھر کبھی قرضدار نہوگا۔ زیادہ حدِ ادب[۱۷]!

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

فیض کا طالب، غالب

معروضہ ۸ جنوری سنہ ۱۸۶۷

(۸۳)
۳۹

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ بہت دن تک متردد رہا کہ حضور کلکتے ہیں یا رامپور۔ چنانچہ ایک عرضداشت اوسی تردد میں بھیجی بھی ہے۔ ہنوز جواب کے آنے کی مدت منقضی نہیں ہوئی۔ خیر، اوس کے جواب پر کیا موقوف ہے؟ یہ تو جان لیا کہ حضرت رونق افزای رامپور ہیں[۱۸]، مگر یہ کیونکر جانوں[۱۹] کہ اب

(۵) اصل خط میں سہواً (جاؤں) رقم ہو گیا ہے۔

بہ خجستگی و فرخندگی یہیں رونق افزا رہیں گے، یا پھر کلکتے تشریف لیجائیں گے؟ خیر، اس پہیلی کو سہل سمجھ لیا کہ جو کچھ ہوگا، معلوم ہو جائیگا؛ مگر یہ کیونکر جانوں کہ مزاجِ اقدس کیسا ہے، اور جب تک یہ نہ جانوں تو آرام کیونکر آئے؟ یہاں سے رامپور تک برابر تار برقی بھی نہیں، جو خبر منگواؤں۔ آج ۱۴ فروری کی ہے۔ یہ خط بھیجتا ہوں۔ اگر جواب آئے، تو ۹ دن میں۔ مجھکو اتنے دن صبر کیونکر آئیگا؟ الٰہی! آج یا کل کوئی نوازشنامہ خداوند کا آجائے! زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس!۔ ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

خیر کا طالب، غالب

۱۴ فروری ۱۸۶۷(؟)

(۸۴)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل صبح کو میں نے خط ڈاک میں بھجوادیا۔ دو امروں کے تردد کے رفع کی التماس تھی۔ ایک یہ کہ پھر کلکتے کو تشریف لیجائیگا۔ یا نہیں؛ دوسری یہ کہ مزاجِ اقدس کیسا ہے۔ حسنِ اتفاق یہ کہ کل ہی دوپہر کو اخبار میں دیکھا کہ حضور نے بوجہ ناسازیٔ آب و ہوائے کلکتہ شمولِ کونسل سے انکار کیا۔ بارے اس سے خاطر جمع ہوئی۔ رہی مزاجِ مبارک کی حقیقت، اوس سے بھی فی الجملہ طمانیت ہوگئی، یعنی عنایت نامے میں خیر خواہ کے خلافِ مدعا کوئی بات مندرج نہ تھی۔ اسی عرضی میں یہ بھی عرض کردیتا ہوں کہ سو روپیے بابت تنخواہِ جنوری سنہ ۱۸۶۷ حال میں نے پائے اور شکرِ درویش پروری بجالایا۔

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں

عنایت کا طالب، غالب

۱۵ فروری ۱۸۶۷

(۸۵)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ عطوفت عزّ ورود لایا۔ (سو روپیہ تنخواہ[1]) فروری سنہ ۱۸۶۷ حال کا معرضِ وصول میں آیا۔

اس درویش کا حال اب قابلِ گزارش نہیں۔ امراضِ قدیم بڑھ گئے۔ دورانِ سر، اور رعشہ، اور ضعفِ بصر، تین بیماریاں نئی پیدا ہوئی ہیں۔ قلم نہیں بنا سکتا، لڑکوں سے بنوا لیتا ہوں۔ برسوں کی بات نہیں رہی۔ ہفتوں کی یا مہینوں کی زندگی رہ گئی ہے ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

زیادہ حدِ ادب۔

نجات کا طالب، غالب۔

۱۳ مارچ سنہ ۱۸۶۷ء

(۸۶)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل صبح کو دو گھڑی دن چڑھے نوروز ہے۔ آج یہ قطعہ بات تمام کر لکھ کر حضور کی نذر بھیجتا ہوں ؎

نوروز و دو عید از دو جانب امسال خوب ست زردی وضع و نیک ست بفال

امید کہ این سہ عید نذرِ نوّاب آرند دوامِ عمر، و عزّ، و اقبال

تم سلامت رہو قیامت تک!

دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب۔

چہار شنبہ ۲۰ مارچ سنہ ۱۸۶۷

(۱) بریکٹ کی عبارت میرزا صاحب سے سہواً چھوٹ گئی تھی۔ میں نے دیگر عرائض سے زیادہ کر دی ہے تاکہ کلام تمام ہو جائے۔

(۸۷/۴۳)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم و تعظیم معروض ہے۔ ہنڈوئ ملفوفۂ نوازشنامہ کے ذریعہ سے سو روپیے مارچ کی تنخواہ کے وصول ہوئے ——

ایک رباعی بھیجتا ہوں، اور یہ چاہتا ہوں۔ کہ "دیدۂ سکندری" کے آغاز میں اس کے چھاپنے کا التزام رہے۔

آن کیست کہ جسم ملک را جان باشد؟ آن کیست کہ ہمسرِ سلیمان باشد؟
آن کیست کہ انجمش بفرمان باشد؟ کس نیست، مگر کلب علی خان باشد

تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب۔

۶ اپریل سنہ ۱۸۶۷ -

(۸۸/۴۴)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ نمایشگاہِ سراسر سورِ رامپور کا ذکر اخبار میں دیکھتا ہوں، اور خونِ جگر کھاتا ہوں کہ ہائے! میں وہاں نہیں۔ بالاخانے پر رہتا ہوں، اوتر نہیں سکتا۔ مانا کہ آدمیوں نے گود میں لیکر اوتارا، اور پالکی میں بٹھادیا۔ کہار چلے۔ راہ میں نہ مرا، اور رامپور پہنچ گیا۔ کہاروں نے جاکر "بینظیر" میں میری پالکی رکھدی۔ پالکی قفس، اور میں طائرِ اسیر، وہ بھی بے پر و بال۔ نہ چل سکوں، نہ پھر سکوں۔ جو کچھ اوپر لکھ آیا ہوں، یہ سب بطریقِ فرضِ محال ہے؛ ورنہ ان امور کے وقوع کی کہاں مجال ہے؟ بارے تین بیت کا قطعۂ تاریخ بھیجتا ہوں۔ اگر پسند آئے، تو میں خوشنودئ مزاجِ مبارک سے اطلاع پاؤں[۲]

نمایشگہی در خورِ شانِ خویش　　برآراست نوّابِ عالی جناب
بہ بین، چون طرب را نہایت نماند　　بود سالِ آن "بخششِ بیحساب"
خدایا! پسندد خداوندگار　　کہ از طبعِ غالب رود پیچ و تاب

"بخششِ بیحساب" کے بارہ سو پچاسی ہوتے ہیں۔ "طرب" کی نہایت، بای موحدہ ہے۔ جب وہ نرہی، تو دو عدد گھٹے، اور ۱۲۰۳ رہ گئے۔ فوالمقصود۔ اگر حضرت کی مرضی ہو، تو "دبدبۂ سکندری" میں یہ تاریخ چھاپی جاے ؎

تم سلامت رہو ہزار برس!　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

داد کا طالب، غالب۔

۱۴ ماہِ اپریل سنہ ۱۸۶۷ عیسوی

(۸۹/۴۵)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے، توقیعِ وقیعِ عزِّ ورود لایا۔ اپریل سنہ ۱۸۶۷ کی تنخواہ کا سو روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو قیامت تک!　　دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب

(۱۴ مئی سنہ ۱۸۶۷ء[۱])

(۹۰/۴۶)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ ادای مدارجِ تسلیم سو بنتا[۲] ہوں کہ کیا لکھوں۔ ہے، ہے! میں کیوں جیتا رہا، جو صاحبزادہ محمد حسن خاں[۳] کے مرنے کی خبر سنوں، اور خداوندِ نعمت کو تعزیت کے کلمات لکھوں؟ میں نیم جاں نمروں، اور وہ نوجوان مرجاے ؎

(۲) یہ میرزا صاحب کا اطلاحہ۔

سروِ چمنِ سروری افتادز پاہای!

حضرت کے رنج و اندوہ کا تصور اور مارے ڈالتا ہے۔ دوسری محرم کو علی بخش خاں خانساماں مرے[1]؛ تیسری کو یہ واقعۂ ہوشربا پیش آیا۔ یہ تو آپ کا فرزندِ دلبند تھا۔ جو اس کا غم ہو، وہ بجا ہے۔ پر فقیر جانتا ہے کہ علی بخش خاں کے مرنے کا بھی حضرت کو بڑا رنج ہوا ہوگا۔ ایسے کارگزار، دیانتدار، ہوشمند، مزاجداں کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ بہر حال "رضینا برضاء اللہ" حضرت کے سامنے صبر و ثبات و تسلیم و رضا میں کلام کرنا ادریس کو حکمت پڑھانی، اور خضر کو راہ بتانی ہے ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

غالب۔ ۱۴ مئی سنہ ۱۸۶۷۔

(۹۱)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ ذرودِ توقیعِ وقیع سے فیض پایا۔ سو روپیہ[2] مئی سنہ ۱۸۶۷ کی تنخواہ کا معرضِ وصول میں آیا ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

اسداللہ بیدسنگاہ۔

۱۱ جون سنہ ۱۸۶۷۔

(۹۲)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے کہ توقیعِ وقیعِ عزِ ورود لایا۔ اوس کی ملفوفہ ہنڈوی سے تنخواہِ جون سنہ ۱۸۶۷ کا سو روپیہ میں نے پایا ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

(۲) میرزا صاحب نے روپے لکھا ہے۔

ہوا خواہ، اسد اللہ
۱۵ جولائی سنہ ۱۸۶۷ء۔

(۹۳)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ بموجب تحریر مرزا رحیم الدین بہادر حیا[۱] کے، فاضل شطرنج باز کو خرچ دیگر روانہ کیا۔ ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عز و جاہ روز افزوں!

اسد اللہ بیدستگاہ۔ ۲۲ جولائی سنہ ۱۸۶۷ء

(۹۴)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تقدیم مدارجِ تسلیم نوازشنامہ کے ورود کا شکر اور جولائی مہینے کے سو روپے کے وصول کا سپاس بجا لاتا ہوں ؎

تم سلامت رہو قیامت تک!
دولت و عز و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب۔
۱۳ اگست سنہ ۱۸۶۷ء۔

(۹۵)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آپ کے غلامِ زر خرید، یعنی حسین علی خاں کی منگنی ہو گئی، اور اپنے کنبے میں ہوئی، یعنی نواب احمد بخش خاں مرحوم کے حقیقی بھائی کی پوتی سے[۲]، اور جب کا مہینا قرار پایا۔ اب میرے بڑھاپے اور میری مفلسی کی شرم آپ کے ہاتھ ہے ؎

بگذار تا بگویم روئے کہ سوئے کیستم

دعای... مزوری الاظہار

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۱۹ اگست سنہ ۱۸۶۷ء[1]

(۹۶) ۵۲

آن کیست کہ جسمِ ملک را جان باشد؟ آن کیست کہ ہمسرِ سلیمان باشد؟
آن کیست کہ انجمش بفرمان باشد؟ کس نیست، مگر کلبِ علیخان باشد

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ عزّ ورود لایا۔ اوس میں یہ حکم مندرج پایا کہ حسین علی خاں کی شادی کے باب میں "خلاصۂ مکنونِ خاطر" عرض کروں۔ حکم بجا لاتا ہوں، اور عرض کرتا ہوں۔ مجملاً یہ کہ میں درِ دولت کا گدای خاک نشین، اور وہ آپ کا غلام۔ تفصیل یہ کہ میرے پاس نقد، جنس، اسباب، املاک، اور میرے گھر میں زیورِ زرینہ و سیمینہ کا نام ونشان نہیں۔ ہت اودھار قرض کوئی دیتا نہیں۔ آپ روپیہ عنایت فرمائیں تا یہ کام سر انجام پائے، اور بوڑھے فقیر کی برادری میں شرم رہ جائے۔

دوسری بات یہ کہ سو روپئے ماہ آپ کی سرکار سے بطریقِ خیرات اور ۵۰ مہینا انگریزی سرکار سے بعوضِ جاگیر پاتا ہوں۔ عالم الغیب جانتا ہے کہ اس میں میرا بڑی مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ بہو کو کہاں سے کھلاؤں گا؟ حسین علیخاں کی کچھ تنخواہ مقرر ہو جائے۔ لیکن توقیعِ تنخواہ اوس کے نام جاری نہو، بلکہ اوس کی زوجہ حسن جہاں بیگم[1] بنتِ اکبر علی خاں کے نام وہ تنخواہ مقرر ہو، اور اوس کی مُہری رسید سے ملا کرے۔ زرِ مصرفِ شادی کی مقدار اور تنخواہ کی مقدار، جو خداوند کی ہمت اور اس کنگال اپاہج کی قسمت۔ زیادہ حدِ ادب ہے

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب۔ ۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ء[2]

(۹۷)
۵۳

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ عزِ ورود لایا۔ اللہ اکبر! حضرت نے غمخواری و تفقد و دردیش نوازی کو اوس پایہ پر پہنچایا کہ شاہانِ عجم میں سلطان سنجر[۱] نے اور شاہانِ ہند میں شاہجہاں[۲] نے ملازموں کی اتنی پرسش اور نوازش کی ہوگی۔ باقر علی خاں[۳] کی شادی نواب ضیاء الدین خاں کے ہاں ہوئی۔ اونھوں نے کھانے جوڑے کے دو ہزار روپیہ دیئے، اور میری زوجہ نے پانسو روپئے کا زیور لگا کر پچیس سو روپئے صرف کئے۔ حسین علی خاں کا سُسرا، یعنی اکبر علی خاں، اپنے خاندان کا ہے، لیکن امیر نہیں، نوکری پیشہ ہے۔ اب یہ میں کیونکر عرض کروں کہ مجھے کیا دو؛ سایل ہوں۔ یہ رسم نہیں کہ سایل مقدارِ سوال عرض کرے۔ حالِ مصارفِ شادیٔ خاندان لکھدیا ہے۔ دو ڈھائی ہزار میں شادی اچھی ہوجائیگی؛ لیکن یہ بھی ساتھ عرض کرتا ہے[۴] کہ میرا حقِ خدمت اتنا نہیں کہ اس قدر مانگ سکوں۔ جو کچھ دوگے، اوس میں شادی کردوں گا۔ زیادہ حدِ ادب ۔ص

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

نجات کا طالب، غالب۔ معروضہ ۲۴ جمادی الاول سنہ ۱۲۳۸، مطابق ۲۳ سنہ ۱۸۶۶ فردای ورودِ ہمایوں منشور[۵]۔

(۹۸)
۵۴

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ فرمانِ والا مع ہنڈوئ تنخواہِ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ عزِ ورود لایا۔ سو روپیہ معرضِ وصول میں آیا۔ زیادہ حدِ ادب ۔ص

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

ترحم کا طالب، غالب

۱۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۷۔

(۴) میرزا صاحب نے اسی طرح لکھا ہے۔ لیکن ہونا چاہئے کرتا ہوں۔

(۹۹)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے "دیدۂ سکندری" میں حضرت کے مزاج کی ناسازی کا ذکر دیکھ کر جو مجھ پر گزری، میرا خدا جانتا ہے۔ مگر یہ بڑی بات ہے کہ اوسی ذکر کیساتھ افاقت و رفعِ مرض کی بھی نوید مندرج تھی۔ توقع ہے کہ، حضرت، مفصل حال مرض کے پیدا ہونے کا اور پھر رفع ہونے کا اور فی الحال مزاجِ اقدس کیسا ہے، میر منشی کو حکم ہو جاوے کہ حضور کی زبانی خط میں مجھے لکھ بھیجیں[1]

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

غالب

۱۸ اکتوبر سنہ ۱۸۶۷

(۱۰۰)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ ایک قطعہ ۱۵ شعر کا بھیجتا ہوں۔ حضور ملاحظہ فرمائیں۔ مضامین کی طرز نئی، مدح کا انداز نیا، دعا کا اسلوب نیا۔ زیادہ حدِ ادب[2]

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب غالب

۵ رجب سنہ ۱۲۸۴ ہجری[3]

ہند میں اہلِ سخن کی ہیں دو سلطنتیں
حیدرآبادِ دکن، رشکِ گلستانِ ارم
رامپور اہلِ نظر کی ہے نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آکے ہوئے ہیں باہم
حیدرآباد بہت دور ہے؛ اس ملک کے لوگ
اوسطرف کو نہیں جاتے ہیں، جو جاتے ہیں تو کم

رامپور آج ہے وہ بقعۂ معمور، کہ ہے
مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم
رامپور ایک بڑا باغ ہے از روئے مثال
دلکش و تازہ و شاداب و وسیع و خرّم
جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں[1] برسیں
ہے اسی طور پہ یہاں دجلہ فشاں دستِ کرم
ابرِ دستِ کرمِ کلبِ علی خاں سے مدام
دُرِّ شہوار ہیں، جو گرتے ہیں قطرے پیہم
صبحدم باغ میں آجائے، جسے ہو نہ یقیں
سبزہ و برگِ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم
خیر اب باغِ ہمایونِ تقدس آثار
کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم
مسلکِ شرع کے ہیں راہرو و راہ شناس
خضر بھی یاں اگر آجائے، تو لے ان کے قدم
مدح کے بعد دعا چاہیئے، اور اہلِ سخن
اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے بہ اغراقِ رقم
حق سے کیا مانگئے؟ ان کے لئے جب ہو موجود
ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم
ہم نہ تبلیغ کے مائل، نہ غلو کے قائل
دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نوّاب کو ہم
یا خدا! غالبِ عاصی کے خداوند کو دے
دو وہ چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا عالم
اوّلاً عمرِ طبیعی بہ دوامِ اقبال
ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ امم

[1] میر رضا صاحب نے "گھٹائیں" لکھا ہے۔

(۱۰۱)
۵۷

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

آج روز جمعہ ۱۷ رجب ۱۲۸۴ اور ۱۵ نومبر ۱۸۶۷ء کو والا نامہ مع ہنڈوی تنخواہِ اکتوبر سنہ ۱۸۶۷ آیا۔ سو روپئے کل آئیں گے۔ ۵۰ شاگرد پیشہ اور ۵۰ قرضِ متفرقہ میں جاکر بعہ روپئے بچیں گے۔ اللہ! اللہ!

پیر و مرشد

رجب کا مہینا چلا۔ حسین علی خاں کی سسرال سے شادی کا تقاضا ہے۔ ادھر سے جز سکوت جواب نہیں[1]۔

کئی دن ہوئے کہ ۱۵ شعر کا قطعہ ارسال ہوا ہے۔ اوس کی رسید اس خط میں مندرج نہ تھی۔ خاتمہ کے تین شعر دعائیہ یہاں لکھتا ہوں۔ دعا کا نیا طور ہے:

ہم نہ تبلیغ کے مایل نہ غلو کے قایل
دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم

یا خدا! غالبِ عاصی کے خداوند کو دے
دو وہ چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا عالم

اولاً عمرِ طبیعی بہ دوامِ اقبال
ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ اُمم

نجات کا طالب غالب

(۱۰۲)
۵۸

حضرت آیۂ رحمت ولیِّ نعمت سلامت[2]!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل ۱۶ دسمبر کو نومبر کی تنخواہ کی ہنڈوی پہنچی۔ وہ بھی سعادت مند، منشی سیلچند کے خط میں ملفوف۔ دیر میں ہنڈوی کا پہنچنا ایک طرف، حضرت کے توقیعِ وقیع کے مشاہدہ سے آنکھوں کا روشن نہ ہونا میری سیاہ بختی کی دلیل ہے۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس!
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۶۷

(۲) یہاں میرزا صاحب نے الفاظ کی قدیم ترتیب کو بدل دیا ہے۔

(۱۰۳)
۵۹

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آج روزِ شنبہ یکمِ ماہِ رمضان المبارک سنہ ۱۲۸۴ھ، بہ اتفاقِ حسابِ دوج و نگارشِ جنتری ؎

روزِ روزہ است و روزِ ناپیداست غلظتِ ابر و شدتِ سرماست

چونکہ وھوب تو نظر ہی نہیں آتی، ناچار دن رات آگ تاپتا ہوں، اور ہر وقت کانپتا ہوں مصـ

ماہِ صیام میں سلاطین و اُمرا خیرات کرتے ہیں۔ اگر حسین علی خاں یتیم کی شادی اسی مہینے میں ہو جاے، اور اس بوڑھے اپاہج فقیر کو روپیہ ملجاے، تو اس مہینے میں تیاری ہو رہے، اور شوال میں رسمِ نکاح عمل میں آے۔ اور چونکہ اس ماہِ مبارک میں درِ فیض باز، اور سالِ انگریزی کا بھی آغاز ہے، وہ پچیس روپیے مہینا جو زبانِ مبارک سے نکلا ہے[۱]، جنوری سنہ ۱۸۶۸ سے بنامِ حسین علی خانِ مذکور جاری ہو جاے، تو مجھے گویا دونوں جہان مل گئے ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

لکھا ہوا یکم رمضان اور بھیجا ہوا دوم رمضان کا۔ عطا کا طالب، غالب[۲]

(۱۰۴)
۶۰

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ راقمِ عزِ ورود لایا۔ ہنڈوی، ملفوفہ سے سو روپیہ بابت تنخواہِ دسمبر سنہ ۱۸۶۷ معرضِ وصول میں آیا مصـ

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

توجہ[۳] کا طالب، غالب

۱۴ جنوری سنہ ۱۸۶۸ عیسوی

(۳) میرزا صاحب نے اس لفظ کو توجہ لکھا ہے۔

(۱۰۵/۶۱)

داد و دہشِ تو روز افزون بادا! بر دولتِ تو زمانہ مفتون بادا!
این عید دو صد ہزار عیدِ دیگر بر ذاتِ تو فرخ و ہمایون بادا!

نجات کا طالب، غالب

جمعہ ۲۸ رمضان المبارک سنہ ۱۲۸۴ ہجری

(۱۰۶/۶۲)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ عطوفت ظہور عزِّ ورود لایا، اور اوس کی ملفوفہ ہنڈوی سے جنوری سنہ ۱۸۶۸ حال کا سو روپیہ معرضِ وصول میں آیا ۵

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزون!

نجات کا طالب، غالب۔

۱۳ فروری سنہ ۱۸۶۸۔

(۱۰۷/۶۳)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

عرضِ مدارجِ عجز و نیاز کے بعد نوازشنامہ کے پہنچنے کا اور تنخواہِ فروری ۱۸۶۸ء کے پانے کا شکر بجا لاتا ہوں۔ سُبحانَ اللہ! کیا برکت ہے اس سو روپیے میں کہ سو آدمی روٹی کھاتے ہیں، اور اس فقیر کے بھی سو کام نکل جاتے ہیں ۵

مرزا حسین علی خاں کی شادی رجب کے مہینے میں قرار پائی تھی۔ عطیۂ حضور کے نہ پہنچنے کے سبب ملتوی رہی۔ آج جو ذیقعدہ کی ۱۵ ہے، ۱۵ ون یہ اور مہینا ذی الحجہ کا۔ اگر اسی ذیقعدہ کے مہینے میں کچھ حضرت عطا فرمائیں گے، تو آخرِ ذی الحجہ تک نکاح ہو جائیگا۔ خدا کرے! خداوند کے ضمیر میں یہ بھی گزرے کہ غالب جب بہو بیاہ لائیگا، تو اوس کو روٹی کہاں سے کھلائیگا۔ غرض اس سے یہ کہ حسین علی خاں کی تنخواہ جاری ہو جاے۔ حضرت! کوئی ایسا نہیں کہ

جو میرے مطالب حضور میں عرض کرتا رہے، اور مجھے بار بار لکھتے ہوئے شرم آتی ہے ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

نجات کا طالب، غالب

۹ مارچ سنہ ۶۸ ۱۸ء

(۱۰۸)

۶۴

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ منشورِ عطوفت ظہور عزّ ورود لایا۔ سو روپیہ ماہ کا کاغذ خط کے لفافے میں سے پایا۔ اپریل سنہ ۱۸۶۸ کی تنخواہ کا روپیہ معرضِ وصول میں آیا ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

(دوشنبہ ۱۱ ماہِ مئی سنہ ۱۸۶۸)

(۱۰۹)

۶۵

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ شوقِ قدبوس نے تنگ کیا۔ جب دیکھا کہ کسیطرح جانہیں سکتا، تاچار اپنا نقشا اوتروایا، اور خدمتِ عالی میں روانہ کیا۔ جب تک کہ میں جیتا ہوں، تب تک اس صورت سے حاضر رہوں گا۔ زیادہ حدِ ادب۔ ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عنایت کا طالب، غالب۔

۲۷ مئی سنہ ۱۸۶۸ء

(۱۱۰)

۶۶

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ آج چوتھا دن ہے، کہ توقیعِ وقیعِ عزّ ورود لایا ہے۔

ہنڈوی ملفوفہ کی رو سے تنخواہ مئی سنہ ۱۸۶۸ کا سو روپیہ معرضِ وصول میں آیا ہے۔ جواب کے جلد نہ لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ میں، گرمی کی شدت کے سبب سے اور احتباس ہوا سے کہ جو لازمۂ موسم برسات ہے، بیکارِ محض ہو گیا ہوں، مطلق کچھ لکھ نہیں سکتا، اور کوئی ایسا شخص کہ جس سے کچھ لکھواؤں، اس چار روز میں میرے پاس نہیں آیا۔ آج اس وقت ایک صاحب آ گئے۔ اون سے میں نے یہ عریضہ لکھوا لیا ــــ

پیر و مرشد! سابق کے عریضہ کے ساتھ میں نے اپنی تصویر حضور میں بھیجی ہے۔ اوس کی رسید اس نوازشنامہ میں مرقوم نہ تھی۔ مجھکو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ لفافہ ڈاک میں تلف نہ ہو گیا ہو۔ اگر اوس کی رسید سے شرفِ اطلاع پاؤں، تو دلجمعی ہو جائے[۱]۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

۱۵ جون سنہ ۱۸۶۸ء۔ نجات کا طالب، غالب[۲]۔

(۱۱۱)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعد تسلیم معروض ہے۔ کل منشورِ عطوفت عزّ صدور لایا۔ جولائی سنہ ۱۸۶۸ کا سو روپیہ بذریعۂ ہنڈوی وصول پایا۔

تین التماسیں سابق پیش ہوئی تھیں۔ سو اب پہلے برخوردار نواب مرزا خاں کی تحریر سے، اور پھر جناب مظفر حسین خاں بہادر[۳] کے خط سے اون خواہشوں کے منظور و مقبول ہونے کی نوید پائی۔ اِنشاءَ اللہُ الکریم، حسبِ ارشادِ حضور اسی برس ۶۸ میں آمدِ زمستاں، یعنی نومبر و دسمبر میں، میرا قرض بھی ادا ہو جائیگا، اور حسین علی خاں کی شادی بھی ہو جائیگی، اور اوس کے واسطے اوس کی زندگی تک تنخواہ جداگانہ مقرر ہو جائیگی ؎

با کریماں کار ہا دشوار نیست

عرضداشتِ ہوا خواہ، اسد اللہ۔ معروضۂ ۱۳ ماہِ اگست سنہ ۱۸۶۸ء۔

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں![1]

(۱۱۲)
۶۸

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تقدیمِ مدارجِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ رافت عزّ ورود لایا۔ میں نے ہنڈوی ملفوفہ کے ذریعہ سے بابت تنخواہِ اگست ۱۸۶۸ء سو روپیہ وصول پایا۔ شکریں آپ سے، تو کس سے کہوں؟ مدعای ضروری الاظہار

پیر و مرشد! حسین علی خاں کے سسرال والوں کا بڑا تقاضا ہے۔ زندگی مشکل ہوگئی ہے۔ بطریقِ "شیئاً للہ" سوالِ مختصر یہ ہے کہ جو حضرت کے مزاج میں آوے، وہ عطا کیجیے، اور حسین علی خاں کے نام جداگانہ تنخواہ مقرر کر دیجیے۔ لیکن یہ دونوں امر جلد صورت پکڑ جائیں ؎

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

زیادہ حدِ ادب۔

عرضداشتِ دو تنخواہ، اسد اللہ۔
معروضۂ ۷ ستمبر سنہ ۱۸۶۸ء۔

(۱۱۳)
۶۹

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ مع سو روپیہ کی ہنڈوی کے عزّ ورود لایا۔ تنخواہِ ستمبر ۱۸۶۸ء کا روپیہ میں نے پایا مص ؎

تم سلامت رہو قیامت تک! دولت و عزّ و جاہ روز افزوں!

مشتاقِ مرگِ ناگاہ، اسد اللہ
۱۳ ماہِ اکتوبر ۱۸۶۸ء۔

(۱) اس خط میں خلاف دستور میرزا صاحب نے دعائیہ شعر نام اور تاریخ کے بعد لکھا ہے۔

(۱۱۴)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ توقیعِ رافت شرف ورود لایا۔ ماعدم بابت تنخواہِ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ ازروی ہنڈوی ملفوفہ خط معرضِ وصول میں آیا۔ خدا حضرت کو سلامت رکھے! مجھ سے اپاہج نکمے کو بعوضِ خدمت تنخواہ دیتے ہو۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضداشتِ اسداللہ معروضہ ۱۶ نومبر سنہ ۱۸۶۸۔

(۱۱۵)
(۷۱)

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ کل عریضۂ مشعر رسیدِ تنخواہِ نومبر سنہ ۱۸۶۸ حال ارسال کرچکا ہوں۔ آج ناچار از روی اضطرار و افتقار پھر یہ عرضی لکھتا ہوں۔ حال میرا تباہ ہوتے ہوتے اب یہ نوبت پہنچی کہ اب کے تنخواہ میں سے للعصہ روپئے بچے۔ سد۵ روپئے کا چٹھا ماہوار کا، سُدّ (۱) سہ ماہہ دینا۔ مجملاً آٹھ سو روپئے ہوں، تو میری آبرو بچتی ہے۔ ناچار حسین علی خاں کی شادی اور اوس کے نام کی تنخواہ سے قطعِ نظر کی۔ اب اس باب میں عرض کروں، کیا مجال؟ کبھی نہ کہوں گا۔ آٹھ سو روپئے مجکو اور دیجے۔ شادی کیسی؟ میری آبرو بچ جاے، تو غنیمت ہے۔ برخوردار نواب مرزا خاں کے خط میں یہ حال مفصل لکھا ہے۔ وہ عرض کرے گا۔ مختصر یہ کہ اب میری جان اور آبرو آپ کے ہاتھ ہے۔ مگر حضور جو عطا فرمانا ہے، جلد ارشاد ہو۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو قیامت تک! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضداشتِ گدای یک در، اسداللہ مضطر۔

۱۶ نومبر سنہ ۱۸۶۸۔

(۱) اصل میں سود کی دال ساقط ہے۔

(۱۱۶)
۷۲

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ بہت دن ہوئے کہ برخوردار نواب مرزا خاں نے مجکو مبارکباد لکھی تھی کہ حضور نے تیرے قرض کے ادا کرنے کی نوید دی ہے، اور مقدارِ قرض پوچھی ہے سو میں نے اون کو لکھ بھیجا تھا کہ آٹھ سو روپئے میں میرا قرض تمام ادا ہو جائیگا۔ اس تحریر سے یاد دہی منظور ہے۔ زیادہ حدِ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

کمترین کا طالب، غالب۔

صبح پنجشنبہ ۱۷ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ء[1]

(۱۱۷)
۷۳

حضرت ولی نعمت آیۂ رحمت سلامت!

بعدِ تسلیم معروض ہے۔ عنایت نامہ اور اوس میں تنخواہِ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ کی ہنڈوی ملفوف پہنچی۔ جلد یاد آوری کا شکر بجا لایا۔

حضور قرضخواہوں[2] نے بہت عاجز کر رکھا ہے۔ بس میرا یہی کام ہے کہ یاد دلا دوں۔ آگے حضرت مالک ہیں

تم سلامت رہو ہزار برس! ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار!

عرضداشتِ غالبِ گدا پیشہ خواہ۔ مرقومۂ روزِ یکشنبہ۔

اواخرِ تاریخِ رمضان المقدس سنہ ۱۲۸۵[3]

(۲) اس لفظ کو تکدر حواس اور رعشے کی بنا پر "قرضخواہاں" لکھا ہے۔

"بخدمت نوابصاحب مشفق و مکرم مظہرِ لطف و کرم، نوّاب زین العابدین خاں صاحب بہادر عرف کلّن میاں سلّمہ اللہ تعالیٰ مقبول باد"[1]

(صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر عرف کلن میاں ولدِ صاحبزادہ سید اصغر علی خاں بہادر ولدِ نواب سید عبداللہ خاں بہادر ابنِ نواب سید غلام محمد خاں بہادر نواب فردوس مکاں کے بھائی اور رشتے میں حقیقی چچازاد بھائی کے بیٹے تھے۔ دلی میں پیدا ہوئے، اور وہیں نشو و نما پائی۔ اپنے دادا نواب سید عبداللہ خاں بہادر کی صدر الصدوری میرٹھ کے زمانے میں ان کے ساتھ رہے۔ نواب فردوس مکاں کے عہد میں رامپور آئے۔ ان کے بڑے بھائی صاحبزادہ سید محمد رضا خاں بہادر کو نواب فردوس مکاں کی صاحبزادی منسوب تھیں۔ سو اتفاق سے اُن کا انتقال ہوگیا۔ صاحبزادہ کلن میاں نے سرکار کی اجازت کے بغیر ۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء میں اُن سے عقد کرلیا۔ اور رامپور سے ترکِ وطن کرکے جیپور چلے گئے اور وہیں توطن اختیار کرلیا۔ امیر مینائی نے انتخابِ یادگار (ص ۲۱۲) میں ان کے متعلق لکھا ہے:

"عابد۔ صاحبزادہ محمد زین العابدین خاں عرف کلن خاں ولد صاحبزادہ محمد اصغر علی خاں اصغر..... بیالیس برس کا سن ہے۔ تلمذ کسی سے نہیں بطورِ خود کہتے ہیں۔ یہ ان کا کلام ہے:

تھا جو اوڑنا ہی ہوش کو میرے — بوسۂ گیسوی عنبریں ہوتا
تھا نہ کھلنا جو عقدۂ دل کو — کاش! ابرو کی تیرے چیں ہوتا

ان کے دادا میرزا صاحب کے مخلص دوست تھے۔ اس لیے یہ میرزا صاحب کو

(۱) یہ عبارت میرزا صاحب نے لفافے پر لکھی تھی۔

اپنا بزرگ اور وہ انھیں اپنا فرزند خیال کرتے تھے۔ لیکن نواب فردوس مکاں ان سے ناخوش ہوگئے تو میرزا صاحب نے ان کے کلام پر اصلاح دینے سے انکار کردیا۔ صاحبزادہ سید زین العابدین خاں بہادر نے جیپور میں دسمبر سنہ ۱۸۹۲ء میں انتقال کیا۔ خمخانۂ جاوید کی پانچویں جلد میں بھی ان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

(۱۱۸)

بندہ پرور! مہربانی نامہ پہنچا۔ میں تو سمجھا تھا، آپ مجھکو بھول گئے۔ بارے یاد کیا۔ جناب نواب صاحب میرے محسن اور میرے قدردان اور میری امیدگاہ ہیں۔ میں اگر رامپور نہ آؤں گا، تو کہاں جاؤں گا۔ یہ جو آپ کہتے ہیں کہ تجکو آنے میں تردد کیا ہے، تردد کچھ نہیں، توقف ہے۔ وجہ توقف کی یہ کہ میں نے اپنے پنشن کے باب میں چیف کمشنر بہادر کو درخواست دی تھی۔ وہاں سے صاحب کمشنر شہر کے وہ درخواست حوالہ ہوئی۔ صاحب کمشنر دہلی نے صاحب کلکٹر شہر سے کیفیت طلب کی ہے۔ پس اگر وہ کیفیت پنشن کی ہے، تو یہاں کی کلکٹری کا دفتر اگر نہیں رہا، تو رہے، ریونیو بورڈ[1] کے دفتر، اور لفٹنٹ گورنری آگرہ، اور نواب گورنر جنرل کلکتہ کے دفتر اس پنشن کی کیفیت سے خالی نہیں ہیں اور اگر میری کیفیت مطلوب ہے، تو میرا بیجرم اور بری اور الگ ہونا فساد سے ازروی دفتر قلعہ و اظہار مخبرین ظاہر ہے۔ بہرحال صاحب کمشنر شہر کیفیت صاحب کلکٹر سے طلب کرکر، چیف کمشنر کیا نہ پنجاب کو گئے ہیں۔ دیکھیے کب آویں، اور بعد ملاحظۂ کیفیت کیا حکم دیں؟ مگر تا صدور حکم میں یہاں سے کہیں جا نہیں سکتا۔ ہاں، بعد ملنے حکم کے، خواہی دلنخواہ ہو، خواہی مخالفِ مدعا، دونوں صورت میں رامپور آؤں گا۔ مگر حیران ہوں کہ جب تک یہاں رہوں، کھاؤں کیا، اور جب چلنے کا قصد ہو، تو رامپور کس طرح پہنچوں! کیا خوب ہو کہ تم یہ رقعہ اپنے نام کا حضور کو، یعنی حضرت نواب صاحب کو، پڑھوا کر اس مدعای خاص کا

[1] اس لفظ کو میرزا صاحب نے اسی طرح لکھا ہے۔ لیکن صحیح "بورڈ" ہے۔

جواب، جو وہ فرمائیں، مجکو لکھ بھیجو۔ لیکن تم سے یہ توقع کیونکر پڑے؟ کس واسطے کہ تم نے اردو دیوان کے پہنچنے نہ پہنچنے کا حال جنابِ عالی سے دریافت کرکر کب لکھا ہے، جو اس بات کا جواب لکھو گے۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں۔ از غالب۔ نگاشتہ وروان داشتہ پنجشنبہ، ۲۵ مارچ ۱۸۵۸ء۔ ضروری جواب طلب ۱۲[1]

(۱۱۹)

نواب صاحب، والا قدر، عظیم الشان، سَلَّمَکُمُ اللّٰہُ تعالےٰ!

بعدِ سلامِ مشہودِ خاطرِ عاطر ہو۔ سابق آپ کا خط متضمن اردو کے استفتای روز مرہ کا آیا تھا۔ اوس کا جواب جو مجھے معلوم تھا لکھ بھیجا۔ اب جو دوسرا خط آیا، اوس میں آپ نے اپنے اشعار بتوقعِ اصلاح بھیجے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں خاص خدمتِ اصلاحِ اشعار پر جناب نواب صاحب قبلہ کا نوکر ہوں، اور آپ حضور کے عزیزوں میں اور فرزندوں میں ہیں۔ پس میں بے حکم حضور کے آپ کی خدمت بجا نہیں لاسکتا۔ ناچار کاغذِ اشعار مسترد بھیجتا ہوں۔ یہ امر یقین ہے کہ موجبِ ملالِ خاطرِ اقدس نہوگا۔ بندگی بیچارگی۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں، کہ مدعای ضروری الاظہار اسی قدر تھا۔ والسلام۔ راقم اسد اللہ خاں غالب۔ ۱۴ مارچ سنہ ۱۸۶۵[2]۔

بنام صاحبزادہ سید محمد عباس علی خاں صاحب بہادر

[صاحبزادہ سید محمد عباس علی خاں بہادر، نواب فردوس مکاں کے حقیقی چچازاد بھائی اور نواب خلد آشیاں کے حقیقی ماموں تھے۔ امیر مینائی فرماتے ہیں کہ "یہ صاحبزادے مومن خاں صاحب دہلوی کے شاگردوں میں بہت ممتاز ہمچشموں میں خوش فکری کی بدولت سرفراز ہیں۔ ۶۶ برس کی عمر ہے۔" (انتخاب یادگار: ۶۰) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ۱۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ سنہ ۱۸۶۶ء میں اپنا دیوان، جو مومن خاں مرحوم کے اصلاحی کلام پر بھی مشتمل تھا، میرزا صاحب کے پاس اصلاح کے لیے بھیجا، اور اس کے بعد بھی بذریعۂ مراسلت اصلاح لیتے رہے۔ یہ دیوان کتابخانے کے "ردی گھر" میں سے حقیر عرشی نے نکالا ہے۔ مگر اس کا پہلا ورق ضائع ہو چکا ہے۔

سری رام صاحب نے لکھا ہے کہ ۱۸۳۷ء میں کئی برس سے دہلی میں رہتے تھے۔ نہایت پاکیزہ سرشت اور خوش مقال کمالات ظاہری و باطنی سے پیراستہ تھے۔ عاشقانہ اور معاملے کے شعر خوب کہتے تھے۔

بتاریخ ۲۹ رجب سنہ ۱۳۰۰ھ (مطابق ۶ جون سنہ ۱۸۸۴ء) کو دوپہر کے وقت فوت ہوئے۔ ان کا دیوان گلدستۂ باغِ جناں کے نام سے چھپ چکا ہے کتابخانے میں مطبوعہ کے علاوہ قلمی نسخے بھی محفوظ ہیں۔]

(۱۲۰)

قبلہ، جس شعر پر صاد ہے، وہ بہت خوب ہے؛ اور جس کو کاٹ دیا، وہ معیوب ہے، اور جس پر صاد نہیں وہ بے عیب اور ہموار؛ اور جس کے معنے میں مجھے تامل ہے، اوس پر نظر۔ علامت اوس کی نظر۔ باقی جا بجا منشارِ اصلاح اور حقیقتِ الفاظ لکھدی ہے۔ تین جزو، جس میں سات ورق سادے ہیں، پہنچتے ہیں۔ اور اجزا بھیجدیجے۔ غالب ۱۱

میرے دل بیکی ذرا سی پھانس کیا ہے روبرو اوس کے
اوکھاڑا ایک ہی حملہ میں ہو در جس نے خیبر کا
حملہ میں تھا در۔

~~ہوا یوں دین اصحابِ رسول اللہ سے شائع~~
کہ نکلے چوک میں سے جس طرح بازار چوسر کا
ہوا دین نبی اصحاب سے دنیا میں یوں شائع

اُف رے گرمیٔ تپِ عشق کہ جل کر نکلا — رگ سے جب سوختہ جاں کے تیرے خنجر نکلا
دل سے
پھر مجکو کچھ خبر نہیں، آگاہ ہے خدا — پی لی تھی ایک بار جو ہاں جان کر شراب
ایک بار تو ہاں۔
نہیں آتا ہے شرارت کا گماں بھی اون پر — دیکھنے میں تو ہے اس طرح کی اچھی صورت
اس طور کی
~~شکر کی جا ہے کہ ایک خلق کرے ٹالو~~ — کیا قیامت ہوئی گر ہو گئی اچھی صورت
خلق کے قتل سے کیا فائدہ بس شکر و
~~اللہ صبح تک خمِ گردوں الٹ گیا~~ — ساقی نے کس قدر مئ گلگوں پلائی رات
باقی رہی نہ بوند میوحی کے واسطے
~~بیخود میں اور وہ محوِ خیالِ رقیب تھے~~ — تھی وصل میں بھی وہ ہی جدائی تمام رات
میں بیخود اور
~~قاتل بنا ہے تیری ہی تلوار کے لیے~~ — ~~تھی ورنہ عاشقوں کو نہ کچھ سر کی احتیاج~~
قاتل لگا رکھا ہے تیری تیغ کے لیے — بیتاب کو اگرچہ نہیں سر کی احتیاج

کیا رحم کھا کے میری سفارش کچھ اوس نے کی
برہم جو ہے رقیب سے بھی یار کا مزاج
برہم ہے جو

درماں نے تیرے گور میں پہنچا دیا مجھے! اب چارہ گر بتا میں کروں کیا ترا علاج
اب چارہ گر بتا کہ کروں۔
عادل ہے تو تو، شک نہیں کچھ اس میں، ایزدا
ڈالی ہے کس مراد پہ تو نے بنا ی چرخ؟
مراد پہ لیکن بنا ی چرخ۔
آپ چل کر کہو احوالِ دل اوس سے بتاب کس کی دوات، قلم کیسی، کہاں کا کاغذ؟
آپ چل کر کہو احوالِ دل اوس سے بتاب کیا قلم؟ کیسی دوات؟ اور کہاں کا کاغذ؟
دشمنوں کا اور فلک کا بھی میں اب مشکور ہوں
خوش اگر ہوتا ہے وہ ظالم میرے آزار پہ
میں اب ممنون ہوں
لکھ دیا لکھتے تو، لیکن پھر جو کچھ رحم آگیا
رو دیا اللہ نے میرا مقدر دیکھ کر ۲۹۴
آپ سے پہلے میری سرنوشت پر بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ غالب۔
طبعِ رسا نے اپنی دوبالا کیا اوسے پہنچا تھا مرتبہ کو نہ اپنے سخن ہنوز
طبعِ رسا نے میری۔
سخت جانی، تجھے اللہ کی مار! او ظالم پھر گیا، زندہ مجھے دیکھ کے دلبر مایوس
چھوڑ کے دلبر۔
خدا کرے! ترے پیکانِ تیر کو تو صنم پسند آئے دلِ بیقرار کی آغوش
تیر کو ظالم۔
~~ہے میرے دوست کا بھی دشمنِ جاں وہ ظالم~~
~~میں نے اس واسطے دشمن سے نکالا اخلاص۔~~
دوست یعنی معشوق۔ دشمن یعنی رقیب۔ رقیب معشوق کا عاشق ہوتا ہے، دشمنِ جاں نہیں ہوتا۔ مانا کہ وہ رقیب معشوق کا در پردہ دشمن ہے۔ پھر اس

عاشق نے اپنے معشوق کے عدو سے اخلاص کیوں نکالا؟ خدا جانے، اس شعر کے فکر کے وقت حضرت کا خیال کدھر تھا۔ غالب۔

دوستی اپنی، خدا کے لیئے کہہ کر کیجے
نہیں بھاتا ہے مجھے، ناصحو! اتنا اخلاص
نہ کر کیجے۔

قاصد کی تاب کیا ہے؟ کبوتر کی کیا مجال؟
پہنچا ہے یار تک تو یہی، پر و بال خط
یہ گستاخی ہمزہ ہے ۱۲

دے داد دل۔ وگرنہ یہ دونوں ہیں بدبلا
کرتے ہیں آہ و نالہ ترا، اے خدا، لحاظ
ہاں، اس میں نمک ہے ۱۲

دیوانہ ہے وہ کون، جو دن کو جلائے شمع
خورشید رو کے سامنے کیا کوئی لائے شمع
اوس مہروش کے سامنے۔

پروانہ سماں نہ کیجئے مجھے شرم آتی ہے
میں مبتلا ہوں آپ کا، وہ مبتلائے شمع
پروانہ مجھکو کہتے ہو۔ تم کو حیا نہیں۔

دیکھو یہ چھیڑ ہم سے وہ غیروں کے سامنے
انجان بن کے پوچھتے ہیں ماجرای داغ
ہم سے کہ غیروں

درماں کرے گا دیکھ تو کس کس کا چارہ گر
ہیں نعم و البدل بھی تو دل پر سوای داغ
ہے زخم قابلہ دل پر

وہ بھی تو بھاگ نکلے، یقیں ہے مجھے، اگر
دوڑے مرا گلا تری شمشیر کی طرف
اولٹی وہ بھاگ نکلے۔

اب پوچھتے ہیں آپ کہ ہے تجھ کو کیا قلق
جب قابلِ بیان نہ اپنا رہا قلق
تجکو کیا قلق۔

اتنا کسی سے وصل میں ہوگا نہ عیش بھی
جتنا کہ تیرے ہجر میں ہم نے سہا قلق
اتنا کسی کو۔

دل کو جگر کو پھونکے ہی دیتا ہے، ہائے عشق
اک آگ، کاش! سینہ میں ہوتی بجائے عشق
ہوتی بجائے عشق۔

~~کیا مختیوں سے جان دی بیتاب نے مگر~~ نکلا نہ شکوہ منہ سے کبھی جز ثنائے عشق
دی جان کس عذاب سے بیتاب نے مگر۔

~~ناچیز اوس کو جان کے یہ نالۂ سحر~~ اوٹھا پھرا ادھر نہ گیا آسماں تلک
اوٹھا پھرا ادھر نہ گیا آسماں تلک

~~کیا ہے کسی تو ہی بتادے، محتسب~~ ڈھونڈتے پھرتے ہیں میخانہ کو ہم
ہے کدھر تو ہی۔

قیس و فرہاد کا گو عشق میں کچھ نام ہوا لیک بیتاب کی مانند تو مشہور نہیں
مانند وہ مشہور نہیں۔

جھنجلا کے بولے جان بھی نہیں اب تمھیں عزیز
کہ بیٹھے اون کو جان جو ایک روز پیار میں
جان نہیں کیا۔

بیتاب کا بھی، رندو، معلوم ہے پتا کچھ ~~اوس کو بھی دیکھتے تھے اکثر اس انجمن میں~~
ہم اوس کو دیکھتے تھے۔

شکوہ ہے کیا، قبول گر اپنی دعا نہیں اس درد کی خدا کے یہاں بھی دوا نہیں
خدا کے بھی گھر میں۔

کیا بزم رفتگاں میں خموشی کا رسم ہے ہیں جمع کس قدر، پہ کسی کی صدا نہیں
کی رسم ہے۔

پھر بیٹھے بیٹھے چھیڑ لگائی خدا سے ڈر ظالم، ابھی تو آنکھ کا آنسو تھما نہیں
چھیڑ نکالی۔

لکھے نہ نامہ میں اب کیوں یہ شوقِ حسرتِ وصل
ہم اپنے سر کو تو ہر دم قلم سمجھتے ہیں
لکھے نہ نامہ میں کیوں شوقِ سجدۂ دیرِ دوست۔

اونھیں تو وصل کا ایک دم بھی ہے ہزار برس

ہزار سال کو ہم ایک دم سمجھتے ہیں

وصل کا ہے ایک دم ہزار برس۔

الماس تک نہیں تیرے مرہم میں چارہ گر — پھر کیوں میں زخم دل کو عبث بیزار کروں

ہرگز نمک نہیں۔

~~ہوا شق جلوۂ جاناں سے وہ بھی~~ — کیا گرماہ نے ٹکڑے کتاں کو

ہوا شق وہ بھی انگشتِ نبی سے

مسیحائی نہ دیکھی ہو تو میرے — ~~چلتے پر لے آئے دریا کو~~

ہو گر اوسکی۔ — مری تربت پہ لاؤ

بھاگیا اپنے زبس قتل کا ایما ہم کو — بعدِ مردن بھی تھی مرنے کی تمنا ہم کو

بعد مردن بھی ہے۔

عشق نے دم ہی پہ، بیتاب، بنا دی آخر — کسی صورت سے بھی کافر نے نہ چھوڑا ہمکو

ستمگر نے۔

ننگ عریانی ہو کیوں قطع نظر سودے سے — جبکہ اللہ نے پیدا کیا عریاں مجکو

قطع نظر وحشت سے۔

~~مقتضای بشری صبر بھی تھا، اے اللہ~~ — یہ بھی دینا تھا، بنایا تھا جو انساں مجکو

تقضیات بشریں سے نہ تھا صبر مگر؟

~~دیکھا جس بت کو لگے پڑھنے اوسی کا کلمہ~~ — ~~علما اللہ دیا خوب ہی ایماں مجکو~~

میرے خالق نے دیا ہے عجب ایماں مجکو۔

ہزار صبر کرو، لاکھ بیقرار نہو — مگر وہ چیز ہے الفت کہ آشکار نہو

نہیں وہ چیز محبت کہ آشکار نہ ہو

بڑے ادب سے جسے قیس نے کیا سجدہ — کسی سے پوچھو، اپنا ہی وہ مزار نہو

کہیں یہ حضرتِ بیتاب کا مزار نہ ہو۔

بہاتے ہیں تو دو دریا بہائیں چشم تر دو نو

فغاں و نالہ ہیں تو ہوں۔ مگر ہیں بے اثر دونو

"دونوں" میں نون ضرور چاہیے۔ اس غزل کو نون کی ردیف میں لکھدو ۴

کیونکہ منہ رکھے وہ میرے سینۂ پرداغ پر — بوی گل سے خاطرِ نازک پہ جس کی بار ہو

بوی گل بھی۔

حق تو یہ ہے خوب ہی دی غیر کو رونق مگر — باد فا کیونکر بناتے اوس کو تم لاچار ہو

لاچار غلط محض ہے۔ ناچار بہ نون صحیح ہے ۱۲

آواز اوس کا سُن کے شبِ وصل مر گئے — گویا ہماری موت تھی مرغِ سحر کے ہاتھ

آواز اوس کی۔

خانۂ آئینہ میں ہوتی ہے کیسی چاندنی! — دیکھ رکھدیتا ہے جب وہ مہ نمایاں آئینہ

دیکھ کر رکھتا ہے۔

مجموعہ کا سا عطر ہے اوس کا سینہ (—) — بوی بدن ملی ہے جو بوی بدن کیا تھ

اوس کے گلے کا ہار۔

جان کنی ہی ہوے تبتک اس تو ٹوٹی نہیں — حشر میں ہوویگی اوس سے ایک صحبت اور بھی

جانکنی ہی ہو پر ابتک۔

گریہ و زاری کو جب رد کا تو سودا ہو گیا — ہو گئے ہم ضبط کرنے سے نصیحت اور بھی

میں نے اس شعر کو ناحق کاٹا۔ "جو رد کا" یہ لفظ مکروہ تھا۔ جو کی جگہ جب لکھدیتے

شعر صاف اور بے عیب ہو جاتا۔ غالب

گریہ و زاری کو جب رد کا تو سودا ہو گیا — ہو گئے ہم ضبط کرنے سے نصیحت اور بھی

قتل میں اپنے خدا! اب کونسی تاخیر ہے — خم یہاں گردن، علم وہاں ہاتھ میں شمشیر ہے

اب کس لئے تاخیر ہے۔

ہے غزلخواں مثلِ بلبل، کہتے ہیں، وہ برگِ گل

پر ہمارے سامنے تو غنچہ، تصویر ہے نظم

(۱۲۱)

قبلہ، قصاید و غزلیات و رباعیات کو بقدر اپنی فہم و فراست کے درست کرکے خدمت میں گزرانتا ہوں۔ چونکہ جانتا ہوں کہ آپ اکبرآباد نہیں گئے، اس لفافہ کو آپ کے پاس رامپور کے پتے سے بھیجتا ہوں۔ توقع یہ کہ مجھکو اپنا خادم سمجھیئے، اور جو خدمت میرے لایق ہو، بے تکلف ارشاد کیجے۔ راقم اسداللہ خاں۔
مرقومہ ۱۵ نومبر سنہ ۱۸۶۶ء[1]

ایک ذرا سی اور بھی تاخیر کرنا، اے اجل — سنتے ہیں کچھ وہاں بھی اپنے قتل کی تدبیر ہے
وہاں ہمارے قتل کی

ہم قتل کرتے ہیں گمانِ داد خواہی پر نہیں — دیکھو تو تقصیر سے پہلے یہاں تعزیر ہے
ہنسیں۔

گزری اپنی عمر تیکھیں چین سے! شکرِ خدا — دیکھیئے بیتاب، اب کیا خواہشِ تقدیر ہے
گزری ابتک عمر اپنی چین۔

فرماتے ہیں بالیں پہ وہ بیمار کے اپنے — کیا درد ہے؟ کیوں اسکا دوا نہیں کرتے؟
بیمار کے آکر۔

ہمیں کرنا تھا جو، وہ کر بیٹھے — اب تم سراوٹھاؤ گھر بیٹھے
آپ باتیں بنائیں۔

اپنے ہاتھوں سے کرکے کام تمام — نوحے کرنے کو چارہ گر بیٹھے
نوحہ۔

وفادار، ناصح، مبارک ہوں تمکو — ہمیں تو وہی بیوفا چاہیے
مبارک تمھیں۔

مقابل میں تیرے تو اے پندِ خدا — تجھی سا کوئی بیوفا چاہیے
پندگو۔

خدا نے دیا ہے عجب دل یہ مجھکو — اب ایسا ہی ایک دلربا چاہیئے
دل ہمیں۔

بجا ہیں تمھارے سب ارشاد لیکن زرا اور کی بھی سنا چاہیے

سب ارشاد، پر۔

زبان پر نام اوس کا دمبدم ناصح یو آتا ہے خدا کیواسطے چپ رہ۔ کلیجا منہ کو آتا ہے

زباں سے۔

نیاز و ناز میں ہے ربط۔ گر مند ہے تو ظاہر میں

میں پڑھتا ہوں درود اوس پر وہ صلواتیں سناتا ہے

درود اوسپر پڑھوں میں، اور وہ صلواتیں سناتا ہے۔

م خوشی سے میری، اللہ! کیا مسرور ہے دل میں!

کہے جا، ناصحِ نادان، مجھے یہ ذکر بھاتا ہے

(مطلع) غنیمت ہے کہ نام اوس کا زبان پر تیری آتا ہے

کہے جا، ناصحِ مشفق۔ مجھے یہ ذکر بھاتا ہے

کشادہ زلف کا دستِ عدو سے وہم آفت ہے

غش آیا جب ہوا نے نکہتِ مشکِ تتار آئی

بکھرنا۔

تسلی بخش ہوگی سادگی حوروں کی، اے واعظ

ہمیں جب یاد یہ آرائشِ روی نگار آئی

تسلی بخش کیا ہو سادگی۔

مل گئے خاک میں، لڑتے ہی تیرے بن گئی جی پہ، بگڑتے ہی تیرے

ہم ملے۔

خدا کو پاتے ہیں عشقِ بتاں سے میں وصلِ صنم مانگتا ہوں خدا سے

یہ میں ہوں کہ بتا۔

اگر چشم بد ہے، تو کچھ زلف کم ہے یہ سچ ہے بچائے خدا ہر بلا سے

تو کیا۔

پاس رکھنے کا جو بتاب وہ وعدہ کرلے
صحبتِ غیر بھی واللہ گوارا ہو جائے
کریں وہ وعدہ۔ ناچار گوارا۔

کیا کہے جاتے ہو، کچھ وصل کی تدبیر بتاؤ
کچھ تم عقبیٰ میں تو ناصح، رہے کام آنے سے
آپ عقبیٰ میں۔

کروں کیا جان سے تنگ آکر دعا کی — تو منت ہی کروائی خدا کی
کریں کیا مرگ کی آخر دعا کی

ڈراتا تھا کہ اوسکا دل دکھانا! — خدنگِ آہ نے، ہے ہے، خطا کی
نہ۔

گئے وہ تو ہوا ہم کو بتاکر — خوشامد ہے یہاں کیا کیا صبا کی!
بتاکر۔

۴ عیادت سے بڑھی خواہش مرض کی — ہمارے درد کی اچھی دوا کی
عیادت سے مرض کا ہوگیا ذوق۔

نہ پہنچے قیس کی دیوانگی پر — خبر تو لیجے اپنے مبتلا کی
نہ دو بیلے کو تم مجنوں کا طعنہ — جو دیکھو صورت اپنے مبتلا کی

زلف بکھری جو مُنہ پہ یہاں دل بکھرا
خود پریشاں ہوئے ہم اوس کو پریشاں کرکے
زلف خود بخود بکھرتی ہے۔ ہم نے کب پریشان کیا، جواب کہیں ؟

آہ جس طرح ہوئے سب عاشق — وہی اپنی بھی حقیقت ہوگی
جس طرح آہ۔ طَرَح اور ہے اور طَرْح اور ہے۔ فقیر "طَرَح" بہ حرکت کے معنے میں طرح بسکون نہیں لکھتا ہے

دیکھ ایمان سے کہدے واعظ — ایسی ہی حوروں کی صورت ہوگی
حور۔

(اس غزل میں مقطع سے پہلے یہ شعر اضافہ کیا ہے۔)

بوسہ لیتے ہی، پھر آجائے گی — جان کیا بوسہ کی قیمت ہو گی

بیقراری سے مرا ہے کوئی لطف — مانگ لاتے ایک ذرا سا صبر اپنے نام سے

حضرت ایوب گر جیتے ہوں، تو اے ہمدمو

مانگ لاؤ ایک ذرا سا صبر میرے نام سے

حشر میں اللہ کے آگے یونہی لیجاؤں گا — کام لینا ہے مجھے اپنے دلِ ناکام سے

مجھے یہ مصرع پڑھا نہیں گیا۔

تو دیے جا گالیاں۔ دے لینگے ہم بھی کچھ جواب

ہوش میں آئے کبھی گو لذتِ دشنام سے

آجائیں گے جب۔

تھا نہ بس شوقِ طپیدن، پر ادب مانع ہوا

بچ گئے ہم ذبح کے بھی وقت اس الزام سے

بہت۔

دیر دیکھا، میکدہ دیکھا، حرم بھی دیکھ لیں

آج نکلے ہیں یہاں بھی گردشِ ایام سے

ہم۔

ذکر اوسی کا ہے، کچھ بھی فرمائے — کاش! ناصح ہی دل کو بہلائے

ہو۔

پھر بلایں پھنسا دیا کس نے — دی صدا نعش پر کہ وہ آئے

خوابِ خوش سے جگا دیا۔

جو لب اون کا ہوا گلہ اوٹا — کر کے شکوہ بھی اون سے پچھتائے

اور۔ بجائے۔

مارے خدا کہ چھوڑے۔ پہ ایماں کی تو یہ ہے

الفت بتوں سے اپنے تئیں لا کلام ہے
(اس بیت کو قلم زد کر کے لکھا ہے) "دو کو" کی جگہ "تئیں" نہ لکھا کرو مہ

~~جبروت یہ تئیں ہے، نہ لاہوت، نہ ناسوت~~ یہ عشق ہے۔ کچھ اور ہی اس کا مقام ہے
لاہوت ہے نہ یہ جبروت۔ اے خدا پرست۔ جبروت بحرکت موحدہ اور ملکوت بحرکت لام صحیح ہے ۱۲

پا کر نجات نزع سے، آرام کرتے ہیں ۔ ہم رہروِ فنا ہیں، یہ غربت کی شام ہے
سوتے ہیں بیخبر۔

۴ معمور ہے خدا کی عنایت سے میکدہ ساقی اگر نہیں تو مہ و مے سے کام ہے
۴ بیتاب پی، خدا نے دیے ہیں تجھے بھی ہاتھ
۴ یہ خم ہے، یہ سبو ہے، یہ شیشہ، یہ جام ہے
ان دونوں شعروں کے ہر مصرع پر صاد بنا کے دائیں گوشے میں لکھا ہے) واللہ کیا ذوق انگیز قطعہ ہے۔ غالب ۱۲ (پھر بائیں گوشے میں لکھتے ہیں) خم سے بھر سبو میں، سبو سے شیشے میں، شیشے سے جام میں، اس تقدیم و تاخیر کا مزا میں ہی جانتا ہوں۔ غالب۔

ہر روز اگر وہ ستم ایجاد کرینگے ~~آخر تو دینے کو کبھی یاد کرینگے~~
ہر روز کئی بار مجھے یاد کرینگے

~~پروانہ کی ہے گرچہ ہوس دل میں اگر ہم~~ آزردہ نہ خاطر تیری، صیاد کرینگے
پرواز کی طاقت بھی موجود ہے لیکن
آزردہ نہ ہم خاطرِ صیاد کریں گے

اس طرح مرینگے کہ ہر ایک کو عبرت معدوم ہم الفت ہی کی بنیاد کریں گے
اس دکھ سے۔

~~خاکستر آگے ہمیں پونچھ جائیں گے پہلے میری وفیہ ضلالت ہی رہتا ہوگا~~
"پونچھنا" امد ہے۔ پوسیدن کا ترجمہ پونچھنا بے نون کیے ہے۔ یہ آگہی کے واسطے

لکھا ہے۔ شعر غلط پڑھا کیا اسطے نہیں کہا۔ بلکہ ناقص تھا ؎

فلک بھاگا آنکھوں کی راہ اور سکون بھی ——— جو خونِ دل تیرے غم میں میری غذا ہوگی

خون ذکر۔ غذا البتہ مونث ہے۔ مگر ذرا غور کیجیے، خون غذا ہوگا، یا خون غذا ہوگی ؎

نہیں ٹھہرا ہے آشک عرشِ اعظم دعا کی تھی یہ کس نے بلبلا کے

دعا کی ہے۔

۴ بن اوس کے خونِ جگر ہم پئیں، یہ مے ساقی خدا کرے! تیرے ساغر میں بھی لہو ہو جائے

خدا کرے کہ تیرے جام میں لہو ہو جائے۔ (اس شعر پر صاد بنا کے حاشیہ پر لکھا ہے) شعر اچھا ہے۔ مگر بھی کا لفظ بموقع اور بے محل ہے۔

ہوئے ہیں گرچہ تایب، پر ہوا ابر دہ باراں میں

رہے مے، ساقیا، میخانہ میں تیار تھوڑی سی

پر ہوای ابر۔

میں سب سمجھے ہوئے ہوں، بات کا جو ڈھب تمہارا ہے

نہ چاہوں خامحا میں اوس کو یہ مطلب تمہارا ہے

نامحو۔

کہاں ہیں قیس اور فرہاد، اب یہ ہو ہے اپنا

کہاں ہیں لیلی و شیریں، زمانہ اب تمہارا ہے

دور۔

خرگاں کا تیری صید یہ کس طرح سے ہو دل

اس تیر کے لیے بھی تو نخچیر چاہیے

صید یہ ہو کس طرح سے دل

نیکوں کے بھی جھکے رہیں سر کچھ تو، دیر کی

مسجد کی چوب و خشت سے تعمیر چاہیے

۔مصرع مجھ سے پڑھا نہیں گیا۔

بلا میں آپ پڑتا ہے تو ناصح — ترے اوپر تو کچھ آفت نہیں ہے
آپ تو۔

خدا کیونکر ملائے دلربا سے — نہ کہئے تو کہ یہ قدرت نہیں ہے
معاذ اللہ مگر۔

یہی کہ کہکے ٹالو حق ستانا سو! — کرے جو چاہے، پر عادت نہیں ہے
بہلاتا ہوں دل کو۔

ذرا بیتاب کو باہر تو دیکھو — تمہارے آگے گو غیرت نہیں ہے
غربت۔

آج پیغام بر نہ کچھ کہنا — ہیں بہت ہم پہ وہ خفا بیٹھے
ہیں وہ ہم پر بہت۔ جہاں پورا لفظ آسکے، یعنی پر، وہاں ادھورا لفظ کیوں لکھیے۔ البتہ جہاں گنجایش نہ ہو، وہاں قاعدہ کے موافق جائز ہے۔ اور اس قاعدہ کا نام تخفیف ہے۔

یہ بھی قدرت خدا کی اے بیتاب — تم بھی اب بنکے پارسا بیٹھے
آپ بھی۔

تیغ کھینچے ہوئے جس وقت وہ قاتل آئے — کون ہے میرے سوا، جو کہ مقابل آئے
کون ہے۔

کیوں یک بیک زمانے کا نقشہ بدل گیا — یہ رنگ تو ہوا نہ تھا دنیا میں آشکار
ناگاہ کیوں زمانے کا۔

تزئیں کچھ آج کل ہے وہ اس غلکماں کی — خلدِ بریں بھی رد ہو دے جس کے سرسار
یہ مصرع مجھ سے پڑھا نہیں گیا۔ رضوان چین کے ہے

گل نے کیا ہے شاخ کے ہر جزو سے سرہیدہ — اب کونسی جگہ ہے کہ مجھے جہاں سے خار
ہر جزو سے ظہور۔

بیٹھے ہیں مطمئن سبھی بزمِ نشاط میں — ہاں ایک صبا تو پھرتی ہے گلشن میں بیقرار
نسیم۔

کثرت سے لبکہ جمع ہوے شاہدانِ گل کس کس مزے سے ہو کے آپس میں ہمکنار

ہوتے ہیں۔

دن عید ہے زمانے میں اور رات شب برات ہر سمت راگ و رنگ ہے قانون اور ستار

اور شب شب برات۔

وہ دن ہے آج جس پہ کروں جان تک نثار ہے جشنِ غسلِ صحتِ نوابِ نامدار

جان تک فدا۔ اگر یہ مطلع ہے تو چاہیے اس سے پہلے ایک شعر میں اطلاع دیجائے

ممکن نہیں جو کر سکے ممدوح کی صفت بیتاب اب دعا ہی پہ بہتر ہے اختصار

ثنا۔

بات یہ ہے وقت پر خوب سجا ہی مجھے فکرِ رسا کا بڑا مجھ پہ یہ احساں ہوا

نفلق پہ۔

دھوم ہے سرکار میں جشن کا ساماں ہوا عرش سے لے فرش تک عیش کا طغیان ہوا

دھوم ہے سرکار میں جشن کا ساماں ہے آج۔

رنگ محل کا سماں، ہو نہیں سکتا بیاں جس کی نظر پڑ گئی شکوہ و حیراں ہوا

والہ و حیراں ہوا۔

کثرتِ مقیش سے مثلِ جبینِ عروس روی زمیں پہ عجب طرح کا افشاں ہوا

عجب طرز کا۔

بزم منور ہوئی مقدمِ نواب سے جب سے کہ رونق فزا وہ مہ کنعاں ہوا

جب سے کہ رونق فزا وہ مہ کنعاں ہوا۔ جوں یعنی مثل و مانند اب متروک ہے

اور چوں لفظ فارسی الاصل تو آگے بھی متروک رہا ہے ۔

دور میں اوس کے بجز ابر نہ رویا کوئی اور جس کے سوا کوئی نہ نالاں ہوا

اور بجز رعد کے۔

مسندِ اقبال پر یوں وہ نمایاں ہوا صفحۂ گردوں پہ جوں مہرِ تاباں ہوا

(میرزا صاحب نے اسے قلمزد کر کے یہ مطلع لکھا تھا۔)

دودۂ چنگیز میں جیسا کہ تھا آں ہوا ویسا ہی اس قوم میں کلب علی خاں ہوا

(اس پر بیتاب نے لکھ دیا ہے "قصیدۂ ہذا در شان یوسف علی خاں بہادر مرحوم بود ازین سبب شعر ہذا نوشتنی نیست۔

ہو رہی ہے عجب آراستگی کہنہ سرا سب فرشتے اسی خدمت پہ ہوتے ہیں مامور

آراستگی دنیا کی۔

تہ کھڑے کرتے ہیں سجادۂ طاعت جبریل ایک طرف ہاتھ میں رکھتے ہیں سرافیل بھی صور

ہاتھ سے

قبضِ ارواح سے معذور ہوئے عزرائیل موت کا غم ہی کسی کو نہیں، سب ہیں مسرور

موت کی فکر۔

زیب و زینت کا اب اس دہر میں کیا کہنا ہے

صانعِ گل کی بجز تعلیم، ملائک کا شعور

اس دہر کی۔ تو تعلیم۔

~~چاندنی رات کا تو ذکر ہی کیا صل علی~~ لیلۃ القدر پہ فائق ہے شبِ تار کا نور

چاندنی رات کا کیا ذکر ہے! اللہ، اللہ!

کوبکو ڈھونڈھتے پھرتے ہیں، کہ دیں کس کو زکات

تھے جو محتاج جہاں میں وہی ہیں ذی مقدور

وہ ایسے ہوئے ہیں۔

کوئی دعوت سے مسافر بھی نہ محروم رہا

~~بادشاہوں کے یہاں بھی تو نہ تھا یہ دستور~~

بادشاہان جہاں کا بھی نہ تھا یہ دستور۔

اس قدر کھانے کی افراط ہے اور پانی کا قحط

دیکھو جس چاہ کو، شربت سے ہے منہ تک معمور

چاہ کو ہے قند سے۔

کس سلیقے سے ہے آراستگی ہر ہر شی کی — مہتمم بزم کے آج اپنا دکھاتے ہیں شعور
آراستگی ہر شی کی۔
تھاپ طبلوں کی بجتی ہے فلک پر پیہم — لہر سارنگیوں کی سن کے ملک ہیں مسرور
لہرے۔
تھاپ طبلوں پہ پڑی آئے پریوں کے جھگٹ
شادیانے کی صدا پہنچی فلک سے بھی دور
پریوں کے آئے جھگٹ۔
گھونگرو کے وہ چھما کے، وہ صدا نغمہ کی — اہلِ محفل کو کیا عشوہ گروں نے مسحور
گھونگروؤں کے۔
~~چل اسطرح سواری کہ دیکھی نہ سُنی — رشک کھانے لگے مرقد میں امیر طیمور~~
یہ لفظ "لُوی" سے نہیں، "تے" سے ہے۔ اور پھر تیمور بوزنِ طنبور نہیں،
دراصل تِمُر بوزنِ سیہ دُر ہے۔ لکھتے ہیں تیمور اور پڑھتے ہیں تِمُر۔ اور تمر ترکی
میں فولاد کو کہتے ہیں مہ
~~سنگینیں تاش تامی کی ہیں باندھے سقے~~ — ہیں ہرارے چڑھے اور عطرسے مشکیں معمور
لنگیاں۔
کرد این فخرِ قصائد چو رقم خامۂ من — وجد کردند چہ خاقانی و عرفی درگور
خامۂ قصیدۂ ہندی بشعر فارسی، خصوصاً وقتے کہ لفظ گور قافیہ باشد مناسب
نیست۔
شکر اللہ کہ اب چرخ ہوا نیک خصال — ترک اسنے کیے وہ اپنے قدیمی افعال
اپنے وہ قدیمی۔
راہ میں ٹھوکریں کھاتے ہیں پڑے لعل و گہر
خفت و سنگ سے بے قدر ہیں دینار و ریال

خزف یعنی ٹھیکری کے لغتِ فارسی اور املا اس کی زے سے ہے۔

ہے کسی جا پہ بھگت، رسلیں کہیں، سانگ کہیں
کہیں کنچن، کہیں کشکت ہیں، کہیں ہیں قوال

رہس کہیں۔

کوئی باعث بھی تو ایسا ہی قوی ہے ورنہ
البتہ محال۔

اس کی عادت سے تو یہ بات تھی اول ہی محال

اپنے اسرار سے واقف ہے تو اے پرفن
آگاہ ہے تو اے پرفن

بھید تیرے کوئی پہچانے یہ ہے کس کی مجال
۔کس کی ہے مجال۔

بن پڑے صانع قدرت سے بھی دو ایک نقشے
دو ہی نقشے۔

کھینچتا اور بھی کچھ سکتیں گر ایسی اشکال
کچھ۔

اور شجاعت کا یہ عالم ہے کہ زہرہ ہو آب
دیکھ لیں حضرتِ رستم اگر اوسکی تمثال
دیکھ لے رستمِ دستاں۔

~~ہو یہ حیرت کہ میں یہیں تھا کہ زمیں پڑ اللہ~~
ہو یہ حیرت کہ میں یہاں تھا کہ زمیں پڑ یا رب!

~~وعدہ کیسا تھ وفا ایک جزِ لاینفک ہے ۔۔۔۔ عہد کا نقض ہوا عہد میں ہو سکے ہے محال~~
جزِ لاینفک غلط۔ جزوِ لاینفک صحیح۔

بھوکے پیاسوں کے خورد و نوش کے کیوں آتے نہ دن
یہ مسلم ہے کہ بعدِ رمضاں ہے شوال

بعد از رمضاں۔

فلک پر کوئی اوڑ جائے، یہ وہی
پہ آخر۔

نصیبوں میں سوا دو گز زمیں ہے

یہ سچ، تحسین کے قابل ہیں عشوق
کو بھی۔

مگر عشاق پر بھی آفریں ہے

جانبِ غالبِ دوراں کا بیتاب — خلوصِ طبع سے اب خوشہ چیں ہے

کلام حضرتِ غالب۔ غالبِ دوراں لفظ نا مانوس ہے مہ

ایدل، تو اوس کو دیکھ کے ایسا پھسل گیا — حیراں ہوں میں کہ پہلے سے کیوں کر نکل گیا

سینہ۔

دل پر بنی ہوئی تھی اجل کے نہ آنے سے — اب جاں پہ آبنی، تو ذرا دل سنبھل گیا

جو۔

کیسا مزا دیکھاتے ہیں ہم بھی، تو ٹھیر جا — تقریریں کر کے روز یہ، ناصح تو ہل گیا

ٹھہر تو جا۔

پھاہا ہے وہ تیزاب کا، کیوں ہوتے ہو برہم — ہم نے دلِ پر داغ پہ رکھا ہے جو مرہم

رکھا نہیں مرہم۔

کہوں کیا، یوں بتانے کی نہیں ہے — رقیبوں کے سنانے کی نہیں ہے

وہ بات ایسی چھپانے۔ — پہ غیروں کے۔

تمھیں پیچ لو آنے کی نہیں ہے — پہ الفت بھی دکھانے کی نہیں ہے

نہ کہ مجھ سے کہ لے میری بلائیں۔ — مری الفت

وہاں رقیبوں سے گرمِ صحبت، یہاں امیدِ وفا کی دعدہ

ہے ایک طرفہ یہ تماشا، تم اپنے گھر خوش، ہم اپنے گھر خوش

ہے ایک یہ طرفہ تر تماشا۔

محبت تری، نفرت اوس کی بڑھی — یہ کیا پڑ لب دلِ زار بیچ

اے دلِ زار۔

مسرور ہوں اغیار خدا کی قدرت — اون سے ہو ترا پیار، خدا کی قدرت

اور بیٹھے رہیں بزم میں تیری ظالم — ہم مثلِ گنہ گار، خدا کی قدرت

بزم میں تیری چپکے۔ — ہم مثلِ گنہ گار۔

غافل نکر اپنی زندگی کو تو خراب — دنیا کا یہ کارخانہ ہے مثلِ سراب

آنکھیں کھل جائیں گی، جب آنکھیں ہوئی بند بیداری کا عالم یہ نظر آئے گا خواب
اپنی زندگانی کو۔

یا الٰہی، یونہی وہ پر سرِ بیداد رہے!
مر چکے ہم تو، نہ غیروں کی بھی بنیاد رہے
مٹ چکے۔

اوس کے مظلومین پہ رحم آئے نہ کیوں کر بتاب
قتل کے بعد بھی خوش جسے نہ جلاد رہے
جسے

مقتولوں پہ[1]
دیکھنے کو جو ہم عشاق کی محفل آئے سب پکار اوٹھے کہ لو مرشدِ کامل آئے
ہم "جو مل دیکھنے" "جو ہم عشاق" میں عین تقطیع سے گر جاتا ہے۔

بدنصیبوں کی نہ تھا وصل کی خوبی دیکھو کہ وہ آئے بھی تو اغیار کے شامل آئے
شبِ وصل۔

(۱) یہاں میرزا صاحب کو دھوکا ہوا۔ بتاب نے مظلوی کہا تھا کاتب نے اُسے "مظلومین" لکھا، جسے میرزا صاحب مظلوم کی جمع سمجھے اور بجائے اس کے "مقتولوں" بنا دیا۔

"بمطالعۂ منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی سیلچند
صاحب میر منشی سَلَّمَہُ اللہُ تعالیٰ مفتوح باد" (۱)

(منشی سیلچند راجہ کنور سین کی اولاد میں ہیں۔ کنور سین قوم کے کایستھ اور نواب سید علی محمد خاں بہادر فاتح روہیلکھنڈ کے معتمد سردار تھے۔ قلعۂ سرہند کی فتح میں اپنے ولی نعمت کے ہمرکاب خدمات شایستہ انجام دیکر بادشاہ دہلی کے دربار سے راجہ کا خطاب حاصل کیا۔ روہیلہ سلطنت کے ٹکڑے ہوئے، اور نواب سید فیض اللہ خاں بہادر ریاست رامپور کے والی بنکر اس خطے میں تشریف لائے، تو ان کے ہمرکاب تمام وفادار سرداران روہیلہ کے ساتھ منشی صاحب کا خاندان بھی تھا۔ منشی سیلچند کی تاریخ ولادت اور جائے پیدائش کا صحیح حال معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ ۲۹ دسمبر سنہ ۱۸۹۴ء کو ان کی عمر اکیاسی سال کی تھی۔ اس حساب سے سنہ ولادت ۱۸۱۳ء قرار پاتا ہے۔ ان کا ابتدائی تقرر نواب سید احمد علی خاں بہادر کے عہد حکومت میں بعہدۂ ناظر نظامت ہوا بعد ازاں عامل (تحصیلدار) مقرر ہوئی۔ ۱۸۴۴ء میں ان کے والد نے وفات پائی، تو اُن کی اسامی پر محکمۂ عالیۂ دارالانشا میں بدلدیے گئے۔ غدر سنہ ۱۸۵۷ء میں ریاست کی طرف سے خبر رسانی و فراہمی رسد وغیرہ کا کام انجام دیا، اور نواب گورنر جنرل بہادر سے بصلۂ خدمات دربار فتح گڑھ میں دوشالہ انعام پایا۔ نواب فردوس مکاں، نے بھی ان کی خدمات کی تعریف میں روبکار جاری فرمایا، اور ایک تلوار عطا کی۔ نواب صاحب کی وفات کے بعد نواب خلد آشیاں اور نواب عرش آشیاں نے بھی ان کی بہت قدر و منزلت فرمائی۔ بالآخر پانچ والیان ریاست کی خدمت کر کے ۲۹ دسمبر سنہ ۱۸۹۴ء کو اکیاسی سال کی عمر میں رامپور میں انتقال کیا۔ منشی سیلچند کو فارسی میں دستگاہ کامل حاصل تھی اور ملا غیاث الدین رامپوری مولف غیاث اللغات سے شرف تلمذ رکھتا۔ شعر بھی کہتے تھے اور منشی تخلص تھا

(۱) یہ عبارت میرزا صاحب نے مکتوب مورخہ ۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء کے لفافہ پر لکھی تھی۔

(۱۲۱)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان، منشی سیلچند صاحب میر منشی سلمہ اللہ تعالیٰ!
بعد دعای دوامِ حیات و ترقی، درجات معلوم فرمائیں۔ اگرچہ از روی خطوطِ حضور، صحت و عافیتِ حضور معلوم ہوئی ہے، لیکن یہ کہیں سے نہیں سنا کہ غسلِ صحت کیا، یا کس دن کریں گے۔ آپ سے یہ فقیر کا سوال ہے کہ مجھکو لکھیئے کہ حضرت غسل کس دن فرمائیں گے۔ اور اگر موافق میری آرزو کے نہاچکے ہوں، تو غسل کی تاریخ سے اطلاع دیجے بس

خیر و عافیت کا طالب، غالب۔ ۲۵ دسمبر ۱۸۶۴ء

(۱۲۲)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان، منشی سیلچند صاحب میر منشی کو خدا سلامت رکھے!

مادّۂ تاریخِ غسلِ صحت کو تم نے غور نہیں کیا۔ ۱۸۶۶ عدد ہوتے ہیں۔ پھر کیا حضور سالِ آیندہ غسلِ صحت فرمائیں گے؟ یہ تو جنوری سال ۱۸۶۵ء میں اس تاریخ کا قطعہ کیونکر لکھوں؟

یہ جو میں نے قصیدۂ تہنیت لکھ کر بھیجا ہے، منشا اس کا یہ ہے کہ شاہ کبیر الدین صاحب رامپور سے آئے، اور انھوں نے کہا کہ نواب صاحب جمعہ کے دن ساتویں تاریخِ شعبان کو نہائیں گے۔ اب تمہاری تحریر سے معلوم ہوا کہ ماہِ آئندہ، یعنی رجب میں نہائیں گے۔ خیر، وہ کاغذ تو حضور کی نظر سے گزریگا اگر موقع پاؤ، تو حضور میں یہ ماجرا عرض کر دینا کہ میں نے بموجب روایتِ شاہ کبیر الدین کے اس کے ارسال میں جلدی کی ہے۔ غالب۔

۱۹ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء۔

(۱۲۳)

منشی صاحب! عجب اتفاق ہے کہ حضور اپنے خط میں اپنے مزاجِ مبارک کا

حال کچھ نہیں لکھتے، اور میرا دھیان لگا ہوا ہے۔ خدا کے واسطے! تم مفصل حال لکھو کہ کیا عارضہ باقی ہے، اور صورت کیا ہے؟ دربار بدستور ہوتا ہے یا نہیں؟ سوار ہوتے ہیں یا نہیں ۱۲

زین العابدین خاں نے جیپور سے اپنے اشعار اصلاح کیواسطے میرے پاس بھیجے۔ میں نے اصلاح دینے سے انکار کیا، اور اشعار مترد کر دئے۔ اون کا خط اور اوس کی پشت پر اوس کے جواب کا مسوّدہ اس خط میں لپیٹ کر تم کو بھیجتا ہوں۔ پڑھ لو، بلکہ اگر موقع اور محل پاؤ، تو حضور کو بھی پڑھوا دو[۲]۔ والدعا اسداللہ خاں غالب۔ ۱۴ مارچ سنہ ۱۸۶۵۔

(۱۲۴)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان، منشی سیلچند صاحب میر منشی کو فقیر غالب کی دعا پہنچے۔ یہ خط[۲] میں نے ایک شبانہ روز کی فکر میں حضور کو لکھا ہے مگر مسوّدہ جو ہر بار کچھ کا کچھ ہوتا رہا، اس سبب سے میرے پاس نہیں رہا۔ اور خدا کی قسم! کہ میں اب بہت ناتوان ہو گیا ہوں۔ یہ خط لیٹے لیٹے صاف کیا ہے اور اس تحریر کو مجموعۂ نثر میں رکھا چاہتا ہوں۔ آپ اس کی نقل کر کے مقرّر مجکو بھیجدیجے گا۔ بڑا احسان مجھ پہ ہوگا[۳]۔ اسداللہ

(۱۲۵)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان، منشی سیلچند صاحب، طال عمرہٗ!

تین صاحبوں نے اطراف و جوانب سے تین قصیدے میرے پاس بھیجے ہیں۔ حیران ہوں کہ کیا کروں! اگر حضور میں نہ گزرانوں اور اون کو لکھوں کہ میں نے گزران دیئے، تو جھوٹ بولنا ہوتا ہے اور میں جھوٹ سے بیزار ہوں۔ گزرانتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے، ادب رخصت نہیں دیتا۔ ناچار وہ تینوں قصیدے تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔ یہی اُن صاحبوں کو لکھوں گا کہ میں نے میر منشی کو حوالے کر دیئے[۱]

سید فرزند احمد بلگرامی صغیر تخلص۔ یہ سید نورالحسن خاں بلگرامی کا پوتا اور صاحب عالم، پیرزادۂ ماڑہرہ، کا نواسا ہے[۱]۔

حالی تخلص، مولوی الطاف حسین، سُن پت کے رئیس، عالم، شاعر، نواب مصطفیٰ خاں کے رفیق۔ قصیدہ عربی[۲]۔

تیسرے قصیدے کے خاتمہ پر شاعر کا نام و نشان مرقوم[۳]۔

(۱۲۶)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان، عزیز تر از جان، منشی سیلچند کو فقیر غالب کی دعا پہنچے[۴]۔ کیوں صاحب؟ ہم تو تم کو اپنا فرزند سمجھیں، اور تمھارا یہ حال کہ مراسم فرزندی بجا نہیں لاتے۔ خط لکھنا تم نے یک قلم موقوف کر دیا۔ اور بھائی، بے تکلف لکھتا ہوں کہ مجھ میں اب دم نہیں ہے۔ نہ طاقت باقی ہے، نہ حواس درست ہیں[۵]۔ آج کے نوابصاحب کے خط میں دو جگہ غلطیاں ہوئیں مجھ سے۔ لکھنا کچھ چاہتا ہوں، لکھ کچھ جاتا ہوں۔ بس اب تو یہ نوبت پہنچی ہے[۶] کہ آج بچا کل مرا، کل بچا پرسوں مرا۔ اس خط کا (جواب)[۷] مجکو جلد لکھو۔ اور اوس میں یہ لکھو کہ احسان حسین خاں اور اون کے بھائی مظفر حسین خاں جو لکھنؤ سے آئے ہیں، نوابصاحب کی سرکار سے اون کا کیا دماہہ مقرر ہوا ہے، اور تعظیم و توقیر کا کیا رنگ ہے؟ دربار میں جو آتے ہیں، تو بیٹھتے کہاں ہیں[۸]؟ اس خط کے جواب کا طالب، غالب۔ ۱۱ جون[۹]۔

(۱۲۷)

برخوردار، نورچشم، منشی سیلچند میر منشی کو بعد دعا کے یہ معلوم ہو کہ اگلے مہینے

(۵) کاتب نے دونوں جگہ "پونچھے" لکھا ہے۔ لیکن میرزا صاحب نے اسے متن میں علی حالہ باقی رکھ کر بائیں خط میں اپنے قلم سے "پہنچے" بنا دیا ہے، اس لیے میں نے متن میں صحیح املا لکھنا مناسب خیال کیا۔

(۶) حواس کا املا کاتب نے پای ہوز سے لکھا تھا۔ میرزا صاحب نے اسکو قلمزد کر کے حای حطی سے لکھا ہے۔

(۷) میرزا صاحب کے خط میں یہ لفظ موجود نہیں ہے، لیکن سیاق چاہتا تھا، اس لیے میں نے اسکو سہو کاتب و مکتوب الیہ خیال کر کے بریکٹ میں اضافہ کر دیا ہے۔

(۸) اصل خط میں (ہے) بصیغۂ مفرد تحریر ہے۔ لیکن اصل زبان کی رو سے (ہیں) بصیغۂ جمع ہونا چاہیے میں نے یہ خیال کر کے کہ اسپر میرزا صاحب کی نظر نہیں پڑی، متن میں (ہیں) لکھدیا ہے۔

یعنی اگست سنہ ۱۸۶۸ (کی)[1] تنخواہ کی ہنڈوی جو تم نے بھیجی تھی، اوس کا روپیہ ابتک نہیں پٹا۔ میں تو جس دن ہنڈوی آتی ہے، اوسی دن یا دوسرے دن اپنے مختار کار کے ہات، کہ وہ بھی مہاجن ہے، بیچ ڈالتا ہوں۔ مگر اوس مختار کار کو، جس کے ہاں ہنڈوی آئی ہے، اوس نے روپیہ ابتک نہیں دیا۔ ۸ ستمبر کو وہ ہنڈوی بیچکر روپیہ میں نے لے لیا تھا، اور آج ۱۸ ہے۔ مختار کار کو روپیہ اوس نے ابتک نہیں دیا۔ جس سے تم نے ہنڈوی لکھوائی ہے، اوس کو تم تاکید کرو کہ یہاں کے مہاجن کو روپیہ دینے کی تاکید لکھے تاکہ[2] مختار کار کا روپیہ پٹ جاوے۔ (مہر: غالب ۸، ۱۲)[3]۔

(۱) یہ لفظ اصل میں ساقط تھا۔ میں نے بریکٹ میں اس لیے اضافہ کر دیا ہے، کہ جملہ با محاورہ ہو جائے۔

(۲) یہ عریضہ بھی میرزا صاحب کے اپنے قلم کا نوشتہ نہیں ہے۔ البتہ خط کشیدہ عبارت اُنھوں نے اپنے قلم سے بڑھائی ہے۔

بنام خلیفہ احمد علی صاحب احمد رامپوری

(خلیفہ شیخ احمد علی صاحب احمد تخلص ولد شیخ نادر علی، تقریباً سنہ ۱۲۱۹ھ (۱۸۰۵ء) میں پیدا ہوئے۔ فارسی کتابیں مولوی عنبر شاہ خاں عنبر اور کبیر خاں تسلیم سے پڑھیں، اور عربی علوم و فنون و دیگر علمای شہر سے حاصل کیے۔ لیکن ادبیات فارسی کے ذوق نے خلیفہ صاحب کو عربی علوم کے لطائف کی طرف متوجہ ہونے دیا، اور انکی ساری عمر شیراز و شروان ہی کے مرغزاروں کی سیر میں گزر گئی۔ رامپور کے اکثر فارسی ادب کے علما کا سلسلہ ان تک منتہی ہوتا ہے۔ نواب خلد آشیاں اور نواب عرش آشیاں، طاب ثراہما، کی استادی کا بھی شرف حاصل تھا۔ خلیفہ صاحب نے جمعرات کے دن ۲۹ رمضان سنہ ۱۳۰۹ھ (۲۸ اپریل سنہ ۱۸۹۲ء) کو نوے سال کی عمر میں اپنے مکان واقع محلہ بنگلۂ آزاد خاں (رامپور) میں انتقال کیا۔ ان کی فارسی نظم و نثر کا ایک چھوٹا سا مجموعہ کتابخانۂ عالیۂ رامپور میں محفوظ ہے۔

مرزا صاحب رامپور تشریف لائے، اور خلیفہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو موخر الذکر نے اثنای گفتگو میں عرفی کے کلام پر نکتہ چینی کی اور شالاً یہ دو شعر پیش کیے:

ساکتم، این نغمہ تا در نیم شب، ہمرہ مرغ سحر خوان می زنم
شاہدی کو کہ یک نفس گوشے بدل درد پرور اندازد

میرزا صاحب نے عرفی کی حمایت کی، لیکن اُس وقت بحث تا تمام رہی، اور یہ طے پایا کہ خلیفہ صاحب شب کو آکر گفتگو کریں گے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس رات کو نہ سر انجام نہ لیجا سکے، اس لیے میرزا صاحب نے اپنے دلائل لکھ کر انکی خدمت میں بھیجدیے۔

تذکرۂ کاملان رامپور (ص ۲۴) میں اختلافی شعر یہ لکھا ہے:

من کہ باشم عقل کل را ناوک انداز ادب مرغ توصیف تو از اوج بیان انداختہ

مگر میرزا صاحب کی آیندہ تحریر کی روشنی میں اسکی صرف یہ تاویل کیجا سکتی ہے کہ مذکورۂ بالا دو شعروں کے ساتھ یہ بھی معرض بحث میں آیا ہوگا، ورنہ میرزا صاحب خط میں اسکا ذکر کرتے)

(۱۲۹)

جناب مولوی صاحب مخدوم احمد علی صاحب کی خدمت میں بعد سلامِ مسنون الاسلام عرض یہ ہے کہ فقیر شب کو آپ کا منتظر رہا، آپ تشریف نہ لائے۔ ناچار تقریر کو تحریر کا پیرایہ دیکر آپ کی جناب میں بھیجتا ہوں۔ سنینِ فارسیہ کا حال بسبیلِ اجمال ایک دو ورقہ پر مندرج ہے نظرِ اصلاح مشاہدہ ہو(۱)۔

بعد اوس کے میری یہ عرض ہے کہ ہر چند "سحر" اور "صبح" مرادف بالمعنی ہیں، اور وہ انجامِ لیل اور آغازِ نہار ہے، مگر بخلافِ صبح، "سحر" بطریقِ مجاز بعدِ نصفِ شب سے صبح تک مستعمل ہے۔ طعامِ آخرِ شب کو "سحری" اور "سحر گہی" کہتے ہیں، اور مرغانِ خوش آواز، کہ بلبل بھی اون میں ہے، اکثر پہر سوا پہر رات سے بولتے ہیں۔ نصفِ شب کو مرغِ سحر خواں کا ہم آواز ہونا محلِ اعتراض نہیں ہے۔

"گوش" کا استعمال "انداختن" کے ساتھ، اگر شعرای ہند کے کلام میں آیا ہوتا، تو ہم اوس کی سند اہلِ زبان کے کلام سے ڈھونڈھتے۔ جب وہ خود عرفی نے لکھا ہے، تو ہم سند اور کہاں سے لائیں؟ قواعدِ زبانِ فارسی کا ماخذ تو ان حضرات کا کلام ہے۔ جب ہم انھیں کے قول پر اعتراض کریں گے، تو اوس اعتراض کے واسطے قاعدہ کہاں سے لائیں گے؟ ان سب باتوں کو جانے دیجے۔ اس کو ملاحظہ کیجے کہ عرفی اکبر شاہ کے عہد میں تھا اور اوس عہد میں قطعِ نظر اور اہلِ کمال سے ابوالفضل اور فیضی یہ دونوں(۲) شخص کیسے فاضل تھے۔ اور پھر عرفی کا ممدوح حکیم ابوالفتح، اس کا وہ پایہ علم میں تھا کہ فیضی اور ابوالفضل کو بھی خیال میں نہ لاتا تھا۔ اگر یہ دونوں(۲) شعرِ عرفی کے غلط ہوتے، تو یہ تینوں آدمی اوس کی دھجیاں اوڑا ڈالتے، حالانکہ فیضی و ابوالفضل اوس کے دشمن تھے۔ پس جب ان دونوں نے باوجودِ عداوت اعتراض نکیا، تو اب عرفی پر کون اعتراض کر سکتا ہے؟ عرفی کی زبان سے جو نکل جائے، وہ سند ہے۔ ہمارے واسطے وہ ایک قاعدۂ محکم ہے۔ وہ مطاع ہے، اور ہم اوس کے مقلد اور مطیع ہیں۔ غالب۔

(۲) اصل میں نون ساقط ہے چونکہ میرزا صاحب نے ہمیشہ اس لفظ کو نون کے ساتھ لکھا ہے، اسلیے اضافہ کر دیا گیا۔

بنام مولوی محمد حسن خاں مالکِ مطبع

(مولوی محمد حسن خاں، ابن شاہ محمد خاں بہند افغان رامپور کے ایک شریف و با عزت خاندان کے فرد تھے۔ ان کے دادا شاہ محمد خاں نواب سید محمد فیض اللہ خاں بہادر کے ہمراہ افغانستان سے تشریف لائے، اور فوج میں بعہدۂ جمعداری مقرر ہوئے۔ مولوی محمد حسن خاں نے تیغ نیاگان کو قلم سے تبدیل کر لیا، اور اوس زمانے کی مروج تعلیم حاصل کر کے نواب فردوس مکاں کے حسب ایما سنہ ۱۸۵۶ء میں "مطبع حسنی" قائم کیا۔ بعد ازاں نواب خلد آشیاں کے حسب الحکم ۱۲ جمادی الثانیہ سنہ ۱۲۸۳ھ (۱۵ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء) کو اخبارِ "دبدبۂ سکندری" کا پہلا پرچہ شائع کیا، جو اس وقت تک اپنی عمر کے ۷۷ سال پورے کر چکا ہے، اور ہنوز اپنی روایتی وفاداری حکومت ہند و رامپور پر قائم ہے۔ سنہ ۱۸۷۷ء کے دربار قیصری میں صوبجات متحدہ کی حکومت نے انھیں اپنے صوبے کے مدیران اخبارات و رسائل کا نمایندہ بنا کر بھیجا۔ نواب خلد آشیاں نے ایام ولیعہدی میں اپنا مصاحب منتخب کیا، اور عہد حکومت میں متعدد اہم سفارتی خدمات تفویض فرمائیں۔ ان کے بعد نواب سید محمد مشتاق علی خاں بہادر عرش آشیاں نے آنریری مجسٹریٹ مقرر فرمایا۔ مولوی صاحب نے ۱۷ شوال سنہ ۱۳۱۴ھ (۱۸۹۶ء) کو ۹۰ سال کی عمر میں انتقال فرمایا۔ آپ کے بعد چند سال تک آپ کے خلف الرشید مولانا شاہ فاروق حسن خاں صاحب صابری رحمہ اللہ نے اپنے مشاغل طریقت کے ساتھ "دبدبۂ سکندری" کو بھی مرتب کیا، لیکن سنہ ۱۹۰۳ء سے فرائض ادارت اپنے فرزند اکبر مولانا فضل حسن خاں صابری کو سپرد کر دیے، جو آجتک اسے انجام دیرہے ہیں۔ موخر الذکر بزرگ نے اپنے گرامی نامۂ موسومۂ عرشی میں تحریر فرمایا ہے: "اخبار دبدبۂ سکندری کی ہندوستان بھر کے اخبارات میں یہ نمایاں خصوصیت ہے کہ ۷۴ سال کی مدت مدید میں برٹش گورنمنٹ اور لوکل گورنمنٹ نے کبھی اس کے ایک حرف پر نہ کوئی اعتراض کیا، نہ اس سے کبھی ضمانت طلب ہوئی، نہ اس پر کسی نے آجتک کوئی مقدمہ چلایا۔")

(۱۳۰)

مشفقی اور مکرمی محمد حسن خانصاحب[۱] کو غالبِ آزردہ دل کا سلام پہنچے۔ آج بھی آپ کا ایک خط آیا۔ کئی اخبار آپ کے پھیرے، کئی خط آپ کے پھیرے اور آپ اخبار بھیجے جاتے ہیں۔ الٰہی! آپ کا خط خط تھا، یا کوئی جھوٹ کی پوٹ۔ بیشتر مجذوبوں کی سی بڑ۔ اور جو کچھ سمجھ میں آیا، وہ غلط اور دروغ اور جھوٹ۔ یہ غلطِ محض ہے کہ مطبع[۲] حضور کا ہے، اور تم مہتمم ہو حضور کیطرف سے۔ اللہ! اللہ! دبگجے سنگھ[۳] کی تعریف میں کہیں سارا ایک صفحہ کہیں سارا ایک ورق سیاہ کرتے ہو، اور اپنے والیٔ ملک اور اپنے بادشاہ یعنی، امیر المسلمین نواب کلب علی خاں بہادر کے نام (کے)[۴] آگے یا نام سے پہلے کوئی دو تین لفظ تعظیم کے لکھتے ہو، بس، اور اس قباحت کو نہیں سمجھتے کہ اگر یہ اخبار حضور کی طرف سے ہے، تو گویا دبگجے سنگھ[۵] کی تعریف بھی حضور کی طرف سے ہوگی۔ ہندستانی عملداری[۶] میں وہ ایک زمیندار اور مالگزار تھا۔ اب گورمنٹِ ہند نے اوس کو جاگیردارِ مستقل کردیا۔ اور نواب محمد علی خاں، رئیسِ ٹونک[۷] کا ہر اخبار میں ایک مرثیہ لکھتے ہو۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ تم طرح طرح سے اطراف و جوانب کے رئیسوں سے بھیک مانگتے ہو۔ بھائی! "یک در گیر و محکم گیر"۔ اگر حضور کے نوکر بھی نہیں ہو تم، تو آخر رعیت تو ہو۔ یہ کیا ہے کہ اپنے بادشاہ کا ذکر سب سے پیچھے لکھتے ہو، کبھی صفحہ پر کبھی حاشیہ پر؟ ہم نے ان باتوں سے بیزار ہو کر تمہارا اخبار موقوف کیا ہے، اور اب پھر تمہیں لکھتے ہیں کہ دوہائی خدا کی! میں یکم جنوری سنہ ۱۸۶۸ سے "دبدبۂ سکندری" کا خریدار نہیں ہوں۔ نہ بھیجا کرو۔ واسطے خدا کے! نہ بھیجا کرو۔ اس سے زیادہ کیا لکھوں۔

(مہر: غالب، ۱۲۷۸)" (۲۵ فروری سنہ ۱۸۶۸ع)

تم بالخیر۔ والحمد للہ اوّلاً و آخراً۔

(۱) میرزا صاحب نے مکتوب الیہ کا نام، القاب اور سرنامہ دونوں مقامات پر محمد حسین خاں لکھا ہے۔ چونکہ صحیح نام محمد حسن خاں تھا، اس لیے متن میں صحیح کر دی گئی ہے۔

(۲) یہ لفظ اصل میں ساقط تھا۔ میں نے سیاق کلام کے حسب اقتضا بڑھا دیا ہے۔

(۳) اصل میں "عملداری" کے بجائے "علداری" ہے چونکہ یہ خط میرزا صاحب کے قلم کا نہیں ہے، اس لیے سہو کاتب پر محمول کر کے متن میں تصحیح کی گئی ہے۔

حواشی

ص ۳

(۱) میرزا صاحب کے اس قطعۂ تاریخ کا پتا نہیں چلا۔

(۲) مولانا فضل حق، مولانا فضل امام صاحب کے صاحبزادے اور خیرآباد کے رہنے والے تھے۔ سنہ ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) میں پیدا ہوئے اور ۲ صفر سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء) کو انڈمان میں وفات پائی۔ موصوف نے علوم عقلیہ نقلیہ اپنے والد ماجد سے اور حدیث مولانا شاہ عبدالقادر دہلوی سے حاصل کی تھی۔ امیر مینائی "انتخاب یادگار" (۲۹۱) میں لکھتے ہیں: "فنون حکمیہ میں مرتبۂ اجتہاد، بڑے ادیب، بڑے منطقی، نہایت ذہین، نہایت ذکی طبیع و ذلیق، انتہا کے صاحب تدقیق و تحقیق، ... جس شہر میں آپ رونق افروز ہوئے، صدہا آدمی بہرہ اندوز ہوئے۔ شاہجہاں آباد میں اگرچہ عدالتین کے سررشتہ دار تھے، مگر بڑے ذی اقتدار و صاحب اختیار تھے جھجھر میں مشاہرۂ جلیلہ پر نوکر رہے۔ الور اور سہارنپور اور ٹونک سب جگہ معزز و موقر رہے لکھنؤ میں صدرالصدور تھے، اور اس دارالریاست (رامپور) میں پہلے محکمۂ نظامت اور پھر مرافعۂ عدالتین پر مامور تھے۔ جناب مستطاب نواب فردوس مکاں کو بھی آپ سے تلمذ رہا ہے، اور بندگان حضور (نواب خلد آشیاں) نے بھی کچھ پڑھا ہے۔ آٹھ برس بہت اعزاز و اکرام کے ساتھ رہے۔ پھر یہاں سے تشریف لے گئے۔ آپ نے متعدد تصنیفات چھوڑی ہیں۔ ان میں سے ہدیۂ سعیدیہ، جو نواب سید محمد سعید خاں بہادر کے نام معنون ہے، نواب فردوس مکاں کیلئے لکھی گئی تھی۔ میرزا غالب ان کے مخلص، دوست اور معتقد خاص تھے۔ جب مولانا نے سررشتہ داری عدالت دہلی سے استعفا دیا اور نواب فیض محمد خاں کی دعوت پر جھجھر تشریف لے جانے لگے، تو میرزا صاحب اور دیگر اہل دہلی کو بیحد قلق تھا۔ حتی کہ شاہ ظفر بھی جو اوس وقت ولی عہد تھے، اسپر متاسف تھے۔ میرزا صاحب نے مولوی سراج الدین احمد کے نام ایک مکتوب میں یہ تمام واقعہ لکھ کر خواہش کی ہے کہ اس کو اخبار آئینۂ سکندر میں شائع کریں، اسی مکتوب میں مولانا کی علمی منزلت کے بارے میں تحریر کرتے ہیں: "نہفتہ میاد کہ بے تمیزی و قدرشناسی حکام رنگ آن دارد کہ فاضل بے نظیر و کاملی یگانہ، مولوی حافظ محمد فضل حق از سررشتہ داری عدالت دہلی استعفا کردہ خود را از ننگ و عار وا رہانید۔ حقا کہ اگر پایۂ علم و فضل و دانش و کنش مولوی فضل حق آن مایہ بکار بندد کہ از صد یک وا ماند، و باز آن پایہ را بسررشتہ داری عدالت دیوانی سنجند، ہنوز این عمدہ دون مرتبۂ وی خواہد بود" (کلیات نثر: ۱۴۷)۔

(۳) اس عریضے میں میرزا صاحب نے جس سابق تعلق کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ رشتۂ استادی تھا۔ نواب فردوس مکاں اپنے والد ماجد کی تخت نشینی سے پہلے دہلی میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ ان کے چچا نواب سید عبداللہ خاں بہادر صدرالصدور میرٹھ اور نواب سید عبدالرحمن خاں بہادر میرزا صاحب کے محب تھے۔ ان دونوں کے حسب ارشاد نواب صاحب نے میرزا صاحب سے فارسی کی تعلیم پائی۔

اس عریضے کے جواب میں نواب صاحب نے ۵ فروری سنہ ۶۵ء کو ارقام فرمایا: "نسخۂ ابیقۂ بلاغت آگین مشعر رسید خط مولوی صاحب مخدوم مولوی محمد فضل حق صاحب با دیگر مراتب محبت و اشفاق بعبارت رنگین

دو قتی در عین انتظار سرکشی عیون وصول نشاط شمول گردیده، باطلاع خیر تہیا سرمایۂ سرور نامحصور افزودہ، از مژدۂ شفقت و ایثار قلبی مشعور شد۔ شفقا! ہر چند کہ کاتب را اتفاق موزونیت یک مصرعہ ہم نشدہ بود، لیکن بعض بجہت سماعت کلام سامی زبانی مولوی صاحب صدر الوصف دلم خواست کہ طریقۂ رسل و رسائل جاری شود۔ چون سبیلی بہ ازین بنظر نرسید، لہذا چند ابیات واہیات موزون نمودہ، بترصد اصلاح پیش آن یگانۂ آفاق مرسل گشت۔ چشم داشت کہ بعد اصلاح، غزلہای مذکور بہ کدام طرح جدید لطف فرمودہ شوند۔ از آنجا کہ استحقاق شیرینی ہم درین خصوص از دستور است، لہذا ہنڈوی مبلغ دو صد و پنجاہ روپیہ بتقریب شیرینی لف رقعۂ الوداع ہذا میرود۔ بمقتضای الطاف منظور فرمودہ از رسید آن مطلع زمایند۔ و مخلص را قبیل و دہا رستمی اخبار اخیار تصور فرمودہ، اکثر با بصال نمائی نائل خیریت و نائی بعبارت سلیس، کہ در خواندنش تأملی بوقوع نیاید، مسرور و مطمئن میفرمودہ باشند۔"

ص ۵

(۱) اس قصیدہ کا عرف لفافہ مثل میں موجود ہے، جس پر اصل قصیدے کے متعلق میر منشی صاحب لکھتے ہیں: "قصیدۂ (بہانا اگر گوہر جان فرستم) بتاریخ ۱۹ شعبان سنہ ۱۲۷۶ھ بواجہۂ میرزا نوشہ صاحب بحضور پر نور گزرانیدہ شد۔" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کے قیام رامپور کے زمانے میں نواب صاحب نے قصیدہ دار الانشا سے منگا کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ چونکہ اس کا شامل مثل ہونا متحقق تھا، اس لیے کلیات فارسی (۳۲۵) سے یہاں نقل کر دیا گیا ہے۔ قصیدے کے متعلق نواب صاحب کی رائے جو تحت عریضے کے حاشیے میں درج ہوگی پتے کے نیچے میرزا صاحب نے لکھا ہے: "از غالب بکرنگ بہرنگ از روی احتیاط چارشنبہ، یازدہم فروری سنہ ۱۸۵۷ء روانگی" قصیدہ کی یہی تاریخ تیسرے عریضے میں بھی مذکور ہے۔

(۲) مولانا فضل حق خیر آبادی مراد ہیں۔

ص ۶

(۱) تیسرے اور چوتھے عریضے کے جواب میں نواب فرودس مکاں نے ۳ رجب سنہ ۱۲۷۳ھ (یکم مارچ سنہ ۱۸۵۷ء) کو تحریر فرمایا: "... دو قطعۂ صحیفۂ شریفہ، یکی سفر ترسیل قصیدہ بمضمون انتظار و دیگر در جواب رقعۃ الوداع و رسید اشعار و سفتۂ مرسلۂ اینجا، و ثانی بیع اشعار مذکور بعد نظر اصلاح و تجویز چند الفاظ جہت تخلص مخلص بایمای پسند از آنجا بمضامین برجستہ و عبارات دلپسند متواتر بسبیل ڈاک گلگونہ آرای چہرۂ وصول فرحت شمول گردیدہ ... و مطالعۂ قصیدۂ نادرۂ فصاحت تضمین، کہ اگر ہر شعر نغزش را گنجینۂ معانی، و معدن آلی شمندانی خوانند بجا، و یا گلدستۂ پر رعنائی جنستان علوم و کمال نامند زیبا، خواص نگر در بجز خار استعارات و نکات تنیش مستغرق گرداب نارسائی، و ادہام عقلاء زمان بدریافت خوبی و بلاغت آن خزینۂ اسرار معترف بہ کوتاہی، قصائد عرفی و خاقانی بمقابلۂ متانت برجستگی مضامین نزہت آگینش ہیچ، و معانی فیض قرین در الفاظ نادرش چون زلف ماہرویان پیچ در پیچ، ایواب افادہ و انشراح بے اندازہ بر روی دل صفا منزل کشود و زنگ کثافت طبعی از صیقل خواطر مستفیضان زدود۔ و غزلیات کہ بنظر اصلاح آمدہ بود پیراہن آراستہ فی الفور بصورت طلا شد، فائز گشتہ لطف شدند، مخلص سیم منکور الطاف و دل توجہات بیغایات آن مستغنی الصفات گردید۔ الحمد للہ! تغیر و تبدل الفاظ نادرہ در اشعار مذکور چون نقش بر نگین زینت تازہ گرفت، و طلای طبع خام بر محک فیض عام جلوہ پذیرفت ... و منجملہ الفاظ تخلص لفظ "نائم" مطبوع طبع نیاز گشت۔"

(۲) اس عریضے کے جواب میں نواب صاحب نے ۲۵ رجب سنہ ۱۲۷۳ھ (۲۳ مارچ سنہ ۱۸۵۷ء) کو تحریر فرمایا: "صحیفۂ مہر آگین ... مشعر رسید رقعۃ الوداع و اینکہ مخالف شرائف عبارت اردو بعد ملاحظہ چاک شدہ باشند ... و صول

نقاط شمول گردیدہ ... مشفقا! حسب الارقام سامی صحیفۂ موصونہ را بعد استفاضۂ مضمون پاک نمودہ شد۔ در آیندہ ہم دربارۂ ہیچ مکاتیب تعمیل ایمای سامی ملحوظ خواہد ماند۔" اس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ میرزا صاحب کی یہ خط و کتابت بصیغۂ راز تھی؛ ورنہ ۱۵ فروری سنہ ۵۷ء کا خط بھی زبان اردو ہی میں تھا۔ اُس کے چاک کرنے کی ہدایت کیوں کی؟ اور کی تھی، تو یہاں تعمیل کیوں نہ ہوئی؟ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

ص ۷

(۱) نواب فردوس مکاں نے اس عریضے کے جواب میں ۴ رمضان سنہ ۷۳ھ (۹ مئی سنہ ۵۷ء) کو تحریر فرمایا: "... مشفقا! این مرتبہ کہ توقف در تسطیر رقیمۂ اخلاص بظہور آمدہ، باعث آن عدم فرصتی تصور توان فرمود۔ حالاکہ فرصت دست داد، بہ ترقیم مانی الضمیر اتفاق افتادہ"۔

(۲) میرزا صاحب کے دیوان اردو کا یہ نسخہ کتاب خانے میں موجود ہے۔ سائز ۱۱ ½ × ۷ ¾ انچ، اوراق ۳۰۰، اور فی صفحہ ۱۱ سطریں ہیں۔ خط صاف اور روشن نستعلیق اور ابتدائی دو صفحے طلاکار ہیں۔ ہر غزل کے خاتمے پر رنگین بیل بوٹے اور تمام صفحات کی جدولیں رنگ آمیز ہیں۔ آخر میں نیر کی تفریظ ہے۔ اس نسخۂ دیوان کے متعلق میرزا صاحب نے منشی شیونرائن کو لکھا ہے: "اب تم سنو۔ دیوان ریختۂ اتم و اکمل کہاں تھا؟ مگر ہاں، میں نے غدر سے پہلے لکھکر نواب یوسف علی خاں بہادر کو رامپور بھیجدیا تھا۔ اب جو میں دلی سے رامپور جانے لگا، تو بھائی ضیاء الدین خاں صاحب نے مجکو تاکید کر دی تھی کہ تم نواب صاحب کی سرکار سے دیوان اردو لیکر کسی کاتب سے لکھوا کر مجکو بھیجدینا میں نے رامپور میں کاتب سے لکھوا کر بسبیل ڈاک ضیاء الدین خاں کو دلی بھیجدیا تھا۔ (اردوی: ۳۸۱) بعد ازاں ۳ جولائی سنہ ۶۰ء کو اس کے مکمل ہونے کے بارے میں لکھا ہے: "میاں نثاری! باتوں پر ہنسی آتی ہے۔ یہ دیوان، جو میں نے تم کو بھیجا ہے، اتم و اکمل ہے۔ وہ اور کونسی دو چار غزلیں ہیں جو مرزا یوسف علی خاں عزیز کے پاس ہیں، اور اس دیوان میں نہیں۔ اسطرف سے آپ اپنی خاطر جمع رکھیں کہ کوئی مصرع میرا اس دیوان سے باہر نہیں ہے۔ معہذا ان سے بھی کہوں گا، اور وہ غزلیں ان سے منگا کر دیکھوں گا" (ایضاً: ۳۸۴) اس نقل سے منشی شیونرائن نے اپنے مطبع: اقبال شہر آگرہ میں دیوان کی طباعت کا انتظام کیا تو اس کے متعلق میرزا صاحب نے علائی کو لکھا: "اردو کا دیوان رامپور سے لایا ہوں، اور وہ آگرہ گیا ہے۔ وہاں مطبع ہوگا۔ ایک نسخہ تمہارے پاس بھی پہنچ جائے گا" (ایضاً: ۴۳۶) لیکن بعد ازاں آگرے میں انطباع سے قبل ہی میرزا صاحب نے نیر کے نسخے سے مطبع احمدی، دہلی میں طبع کرا لیا۔ بہرحال یہ یقینی امر ہے کہ اس وقت تک دیوان غالب کے جس قدر ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، وہ سب کے سب اپنی تکمیل میں نسخۂ رامپور کے رہین منت ہیں۔

ص ۸

(۱) یہاں سے آگے کے الفاظ حاشیے پر لکھے ہیں اور حوالے کے لیے (۱۵) کا ہندسہ متن کی عبارت کے خاتمے اور حاشیے کی عبارت کے آغاز میں لکھا ہے۔

(۲) فردوس مکاں کے محولۂ بالا فرمان کی نقل شمل میں شامل ہے۔ اس میں سے قابل نقل حصہ یہ ہے: "مکرر آن کہ خط مولوی وجیہ الزماں خاں صاحب معتمد این سرکار بنام منشی شہاب الدین، کہ بہمراہی؛ بریلی در اینجا رفتہ آنہا ملفوف میرسد۔ براو نوازش نزد مکتوب الیہ فرستادہ، جواب طلب فرمودہ بدست قاصد روانۂ رامپور باید فرمود و قاصد مذکور اجرت از سرکار خواہد یافت۔ و چون دریں ایام شورش سبیل ترسیل سایر نجز ہندوی بہیچ مکس ہست و احتمال ورود ضرور تحمیل لہذا در صورت وصول و عدم وصول زرش مطلع باید فرمود۔" میرزا صاحب کے اس خط کے جواب میں سرکار نے ۱۵ ذیحجہ سنہ ۱۲۷۳ھ کو ہنڈوی کا پتہ اور پہلے خط کی نقل روانہ فرمادی تھی۔

(۳) نصر اللہ بیگ خاں ابتداءً مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے صوبیدار تھے۔ بعد فتح آگرہ اپنے برادر نسبتی، نواب احمد بخش خاں والیٔ لوہارو و فیروز پور جھرکہ، کی سفارش سے انگریزی فوج میں رسالدار ہو گئے، اور مڈ سمتھا

کے لیے نواحیٔ اکبرآباد میں پرگنہ سونک سونک مرحمت ہوا۔ انھوں نے سنہ ۱۸۰۶ء میں انتقال کیا۔

(۵) لارڈ لیک سنہ ۱۷۴۴ء میں پیدا ہوئے، سنہ ۱۷۵۸ء میں پیدل فوج میں نام لکھایا، اور مختلف عہدوں پر ممتاز رہ کر سنہ ۱۸۰۲ء میں جنرل مقرر ہوئے۔ سنہ ۱۸۰۱ء سے سنہ ۱۸۰۵ء تک ہندوستان کی افواج کے کمانڈر انچیف اور کونسل کے ممبر رہے۔ انھوں نے مرہٹوں سے کامیاب جنگ کر کے اُن کی قوت کو توڑا، اور انگلستان واپس جا کر ۲ فروری سنہ ۱۸۰۸ء کو انتقال کیا۔ لیک اپنے عہد کے نامور اور ہر دلعزیز سپہ سالار مانے جاتے تھے۔

(۶) نواب احمد بخش خاں فیروز پور جھرکہ کے رئیس اور لوہارو کے جاگیر دار تھے۔ حکومت انگریزی میں ان کی بڑی عزت اور منزلت تھی۔ انھوں نے آخر عمر میں حکومت سے کنارہ کش ہو کر اپنے بڑے بیٹے نواب شمس الدین احمد خاں کو فیروز پور جھرکہ کی ریاست اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر و نواب امین الدین احمد خاں کو لوہارو کی جاگیر عطا کر دی تھی۔ ۱۸۲۴ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ میرزا غالب کے خسر نواب الٰہی بخش خاں معروف ان کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔

ص ۹

(۱) احمد بخش خاں کے جانشین سے نواب شمس الدین احمد خاں والیٔ فیروز پور مراد ہیں۔ یہ مزاج کے درشت اور قساوت پیشہ تھے، اس لیے نواب ہو کر اہل خاندان سے تعلقات درست نہ رکھ سکے۔ میرزا غالب بھی ان سے ناراض تھے۔ خطوں ان کا نام نہ لینے کی یہی وجہ ہے۔ مسٹر ولیم فریزر ریزیڈنٹ دہلی، کے قتل کے الزام میں اکتوبر سنہ ۱۸۳۵ء کو انھیں پھانسی دیدی گئی، اور ریاست فیروز پور ضبط ہو گئی۔

(۲) بہادر شاہ، ہندوستان کے مغل فرمانرواؤں کے آخری چشم و چراغ تھے۔ یہ سنہ ۱۸۳۷ء میں تخت نشین ہوئے تھے مگر صرف نام کے بادشاہ تھے اور لال قلعے کے اندر ہی حکم چلاتے تھے۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں دلی والوں نے انھیں اپنا مطلق العنان بادشاہ بنایا۔ بعد فتح دہلی الزام بغاوت میں رنگون کو جلا وطن کیے گئے، اور وہیں ۷ نومبر سنہ ۱۸۶۲ء کو فوت ہوئے۔ میرزا صاحب نے ایک خط میں مجروح کو لکھا ہے: "۷ نومبر، ۱۴ جمادی الاول سال حال جمعہ کے دن ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ قید فرنگ و قید جسم سے رہا ہوئے" (اردو دی: ۱۶۳)

(۴) مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اردو دی: ۳۵۔

(۵) زین العابدین خاں بہادر کے لیے وہ نوٹ ملاحظہ ہو جو اُن کے نام کے خطوط سے قبل مندرج ہے۔

(۶) نواب سید عبداللہ خاں بہادر ابن نواب سید غلام محمد خاں بہادر، نواب فردوس مکاں کے چچا تھے۔ شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے تھے۔ زود گوئی کا بھی شوق تھا۔ دہلی میں عرصے تک مقیم رہے۔ میرزا صاحب اور ان میں بہت ارتباط و خلوص تھا۔ پنج آہنگ میں میرزا صاحب کا ایک خط ان کے نام بھی درج ہے۔ (کلیات نثر غالب: ۲۱۸) یہ عرصے تک میرٹھ کے صدر الصدور رہے، اور وہیں ستر برس کی عمر میں بعارضۂ تپ سنہ ۱۲۷۴ھ کو رحلت فرمائی، اور درگاہ چشتی پہلوان میں مدفون ہوئے۔ ان کا ایک شعر امیر مینائی مرحوم نے تذکرۂ انتخاب یادگار (ص ۲۱۱) میں درج کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

منحصر تجھ پر شفاعت ہے، بھلا جائیں کہاں؟ اے شفیعِ عاصیاں! ہم تیرا واماں چھوڑ کر

ص ۱۰

(۱) سید اصغر علی خاں مرحوم نواب سید عبداللہ خاں بہادر کے صاحبزادے اور نواب فردوس مکاں کے چچازاد بھائی تھے، امیر مینائی تذکرۂ مذکور (ص ۲۵) میں لکھتے ہیں: "شاعر خوش مذاق ہیں، آفرینش مضامین عاشقانہ میں طاق ہیں۔ مومن خاں صاحب دہلوی کے شاگرد رشید، کلام ان کا لائق دید و قابل شنید۔ ۳۰ برس کی عمر پائی۔ بارھویں رجب کو بارہ سو بہتر ہجری تھے کہ عارضۂ خناق میں مبتلا ہو کر میرٹھ میں رحلت فرمائی۔ وہاں سے جنازہ

اون کا دہلی کو گیا، اور درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ میں دفن ہوے"۔ غالباً کاتب نے بجاے بہتر کے بتر لکھ دیا ہے صحیح یہ ہے کہ انھوں نے ۱۲۷۲ھ میں انتقال کیا ہے۔ چنانچہ دارالانشا میں وہ تمام مراسلت جو ان کی والدہ اور دیگر اعزہ اور سرکار فردوس مکاں کے نام ہوئی ہے، اسی سنہ کے ماتحت رکھی ہوئی ہے۔ ان کا دیوان شائع ہو گیا ہے۔

(۲) نواب سید عبدالرحمن خاں بہادر، نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے صاحبزادے اور نواب فردوس مکاں کے چچا تھے۔ جنگ دوجٹہ کے بعد اپنے بھائیوں کے ساتھ یہ بھی رامپور چھوڑنے پر مجبور ہوے اور نواب سید محمد سعید خاں بہادر کی تخت نشینی تک دہلی اور میرٹھ وغیرہ مقامات پر رہے۔ بعد ازاں نواب صاحب کے ساتھ رامپور آگئے۔ سرکار نے ان کی قدیم تنخواہ میں معقول اضافہ فرما دیا اور یہیں مقیم ہو گئے۔ نواب فردوس مکاں کے عہد حکومت میں ۱۱ اگست سنہ ۱۸۵۶ء کو رامپور میں انتقال کیا۔

(۳) اگر میرزا صاحب کے تخمینے کو صحیح مانا جائے، تو انھیں سنہ ۱۸۴۹ء یا سنہ ۱۸۵۰ء سے محلہ بلی ماران میں مقیم ہونا چاہیے۔ میرروح کے نام کے خط میں سنہ ۱۸۵۰ء کی تصریح موجود ہے، اس لیے یہی سنہ درست معلوم ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں: "... یہ لکھ کہ اسد اللہ خاں پنشنار سنہ ۱۸۵۰ء سے حکیم پیارے والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے" (عود: ۸۳؛ اردو ی: ۱۹۴)۔

ص۱۱

(۱) اس چار جزو کے رسالے سے "دستنبو" مراد ہے۔ چنانچہ عریضے کے آخر میں اس کے نام کی تصریح کر دی گئی ہے۔

(۲) نواب فردوس مکاں نے عرائض بورخہ نومبر ۱۸۵۷ء کے جواب میں تحریر فرمایا: "... وہ قطعۂ صحیفۂ تلطف طراز، اولین ہادی حالات نہ ملنے زرپتن آپ کے، اور دوسرا امور خاطر داریں ماہ نومبر سنہ حال شعر نوید خیر بیت مزاج وہاج کے، سوانح رنگ افزوز چہرۂ وصول نشاط شمول کا ہوا، اور اوپر مراتب مندرجہ کے مسرور۔ اور مطلع فرمایا۔ مشفقا! چونکہ مخلص کو اشتیاق حصول معانقہ اور مکالمہ آپ کا بدرجۂ کمال ہے، اور اب تشریف آوری آپ کی اس بگ مناسب ہے، اسواسطے حوالہ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ دیدار فائض الانوار اپنے سے مخلص کو مسرور فرمائیے، اور قطعۂ ہنڈوی مبلغ دوسو پچاس روپیہ کا واسطے مصارف خدام آپ کے بلف رقیمۂ اردا ہذا کے مرسل ہے۔ قبول فرمائیے۔ مکرر آن کہ چند غزل نیز برائے اصلاح مرسل ہیں۔ بعد طاحظہ کے واپس ہوں فقط ۱۸ ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۵ھ مطابق ۲۵ نومبر سنہ ۱۸۵۸ء"۔ عریضۂ نمبر ۱۰ ہنڈوی کی رسید اور آنے کے عندیہ پر مشتمل ہے

ص۱۲

(۱) نواب فردوس مکاں کے مسودۂ فرمان میں یہ مضمون تحریر نہیں۔ ممکن ہے کہ میعضے میں اپنے قلم سے اضافہ کر دیا ہو یا کوئی اور تحریر اس کے علاوہ بھیجی گئی ہو۔

(۲) نواب مرزا خاں داغ تخلص خلف نواب شمس الدین احمد خاں والی فیروز پور جھرکہ مراد ہیں۔ نواب فردوس مکاں کے عہد میں ان کی بھی بہت عمدہ خاصہ ریاست سے وظیفہ پاتی تھیں۔ اُن کے توسط سے ابتدا میں ورود انعام وغیرہ رہا ہے۔ بعد ازاں تعلق خدمت بھی ہو گیا۔ چنانچہ نواب خلد آشیاں کے عہد میں اصطبل اور فراش خانے کے داروغہ تھے اور سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتے تھے۔ نواب صاحب کے انتقال کے بعد بزم علم و ادب منتشر ہوئی، تو مرزا داغ حیدرآباد چلے گئے، اور وہاں حضور نظام مرحوم کے استاد مقرر ہوے، اور وہیں سنہ ۱۳۲۲ھ (۱۹۰۵ء) میں انتقال کیا۔ مرزا داغ، شیخ ابراہیم ذوق دہلوی کے شاگرد تھے، اور رامپور میں شعراے دہلی کے کامیاب نمایندے شمار ہوتے تھے۔

(۳) جناب عالیہ نواب فردوس مکاں کی والدۂ محترمہ فخر النسا بیگم کا لقب تھا۔ یہ محمد نور خاں ولد محمد شاہ خاں بڑیچ کی صاحبزادی تھیں، اور محمد نور خاں نواب سید فیض اللہ خاں بہادر کے ہمشیرزاد ے تھے (گلشن خو

گلی، ذکر نواب فردوس مکاں، اخبار الصنادید: ۲، ۷۱)

ص ۱۳

(۱) یہ عریضہ ۱۶ فروری سنہ ۱۸۵۹ء سے قبل لکھا گیا ہوگا، کیونکہ اس تاریخ کے فرمان میں سرکار نے لکھا ہے: "لطف صیغۂ آپ کا حادی... نہ ہونے حکم نسبت مقدمہ فتن کے پنگا: نظام سے... عین انتظار میں سرمہ کش حیرانی و مول فرحت شغول کا ہوا۔"

(۲) لفافے پر ۱۷-اپریل ۱۸۵۹ء تحریر ہے۔

(۳) نواب فردوس مکاں کا محولۂ بالا خط حسب ذیل ہے: "... حال تشریف آوری آپ کا اس طرف کو ابھی تک سامعہ نواز نہیں ہوا، اور دل صفا منزل مشتاق اور منتظر دریافت سرور طلقات کا ہے۔ اس واسطے حوالہ خامۂ اتحاد و نگار کے ہوتا ہے کہ آپ براہ عنایت کے نوید تشریف فرمائی اس سمت سے، کہ کب تک ممکن الوقوع ہے، مطلع اور مطمئن فرمائیے... ۹ رمضان سنہ ۱۲۷۵ھ، ۱۳ اپریل سنہ ۱۸۵۹ء"۔

ص ۱۴

(۱) لارڈ کیننگ بہادر سنہ ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۸۵۶ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل اور سنہ ۱۸۵۸ء میں پہلے وائسرائے بنائے گئے۔ غدر انھیں کے عہد حکومت میں رونما ہوا۔ حکومت اودھ کی مکمل ضبطی بھی اسی عہد کا واقعہ ہے۔ مارچ ۱۸۶۲ء میں انگلستان واپس گئے، اور ۱۷ جون سنہ ۱۸۶۲ء کو وہیں فوت ہوئے۔ اپنے عزم و استقلال، تدبر، اور خوبی انتظام کی بدولت انھوں نے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔

(۲) اس عریضے کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے تحریر فرمایا: "سابق اس سے دو قطعہ تلطف صحیفۂ طرب افزا آپ کے، اول مشعر مراتب تعزیت رحلت جناب والدہ صاحبہ معظمہ کے اس جہان فانی سے، اور دوسرا بانتظار جواب اور قطعۂ تاریخ رحلت جناب مرحومہ کے سوانح و حلول ہوئے... سبحان اللہ! کیا عمدہ تاریخ آپ نے تصنیف فرمائی ہے، کہ الفاظ جامع مختصر ہیں، اور تعمیہ بطرز نادر اور بے تکلف ہے"۔

ص ۱۵

(۱) نواب صاحب کے ۲۹ صفر سنہ ۱۲۷۶ھ (۸ ستمبر سنہ ۱۸۵۹ء) کے فرمان سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے سفر انگلستان کے بارے میں استفسار کیا تھا، جس کے جواب میں نواب صاحب نے مذکورۂ بالا تاریخ کو لکھا: "مشفقا! جو آپ نے نسبت عزیمت مخلص کے بسمت انگلستان استفسار فرمایا ہے، حال یہ ہے کہ فی الحقیقت ارادہ مخلص کا جانے انگلستان کو مصمم ہے۔ لیکن ابھی تک کوئی زمانہ جانے کا مقرر نہیں ہوا ہے۔ اسواسطے حوالہ خامۂ اتحاد نگار کے ہوتا ہے کہ جس وقت زمانہ جانے ولایت کا اقرار پا دیگا، آپ کو بمشیرے اس مضمون میں اطلاع دی جاوے گی۔" میرزا صاحب کا عریضہ (ص ۱۴) اس فرمان کا جواب ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہے کہ نواب صاحب کا یہ سفر ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے دست مبارک سے خلعۂ خدمات عذر پانے کے سلسلے میں ہونے والا تھا۔ لیکن بعد ازاں کسی وجہ سے سفر ملتوی ہو گیا، اور گورنر جنرل کے دربار خلع گڑھ میں خلعت وغیرہ عطا ہوا۔ دربار کی تفصیل عریضہ ۱۷ کے حاشیے میں ملاحظہ ہو۔

(۲) میرزا صاحب کے اس عریضے کا آخری حصہ چھپ گیا ہے۔ آخر میں جو تاریخ درج ہے وہ لفافے سے نقل کر دی گئی ہے۔

(۳) لارڈ ہارڈنگ صاحب ہندوستان کے گورنر جنرل تھے۔ سنہ ۱۷۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ جولائی سنہ ۱۸۴۴ء سے جنوری سنہ ۱۸۴۸ء تک گورنر جنرل رہے۔ سکھوں کی لڑائی میں بہت نمایاں خدمات انجام دیں۔ انتظام مملکت میں بھی مفید اصلاحات نافذ کیں۔ جگہ جگہ اسکول قائم کیے، ریلوے اور آبپاشی کے محکموں میں

اضافہ کیا، اور اتوار کی عام تعطیل مقرر کی۔ آخر میں سنہ ۱۸۵۲ء سے سنہ ۱۸۵۶ء تک کمانڈر انچیف رہے اور اسی سال ۵ ستمبر میں انتقال کیا۔

(۴) لارڈ ڈلہوسی سنہ ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۸۴۷ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل مقرر کیے گئے، اور ۱۲ جنوری سنہ ۱۸۴۸ء کو آفس کا چارج لیا۔ انھوں نے سکھوں کو زیر کر کے سنہ ۱۸۴۹ء میں پنجاب کا الحاق کیا۔ ان کا اندرونی انتظام نہایت عمدہ اور مضبوط مانا جاتا ہے۔ محکمۂ ریلوے میں نئے قاعدے نافذ کیے، اور صوبوں کے درمیان ٹیلیگراف سسٹم قائم کیا۔ شاہی ڈاک خانے کا نظم بھی انھیں کا رہین منت ہے۔ پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ، جیل، جنگلات، سروے، اور محکمۂ تعلیمات قائم کیا۔ لیجسلیٹو کونسل کا از سر نو انتظام کر کے اسے وسعت دی، برما پر حملہ کیا، اور خان قلات اور امیر افغانستان سے معاہدے مرتب کیے۔ صوبۂ برار فوجی مصارف کے لیے حاصل کیا۔ ان کے ہاتھوں بہت سی دیسی ریاستوں کا خاتمہ ہوا۔ حادثۂ غدر کی تمام تر ذمہ داری بھی انھیں کے کاندھوں پر رکھی جاتی ہے۔ یہ بڑے جفاکش کارکن تھے، چنانچہ ان کے سوانح کا خلاصہ فتح، استحکام، اور ترقی ہے۔ انھوں نے لندن واپس جا کر سنہ ۱۸۶۰ء میں انتقال کیا۔

(۵) لارڈ کیننگ بہادر وائسرائے مراد ہیں۔

(۶) ایڈمنسٹن صاحب سنہ ۱۸۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۸۳۱ء میں اضلاع شمال و غرب میں تقرر ہوا۔ سکھ کی فتح کے بعد وہاں کی ریاستوں کے کمشنر بنائے گئے۔ سنہ ۱۸۵۳ء میں پنجاب کے کمشنر مالیات ہوئے۔ سنہ ۱۸۵۵ء سے سنہ ۱۸۵۸ء تک گورنمنٹ آف انڈیا کے فارن سیکریٹری رہے۔ بعد ازاں جنوری سنہ ۱۸۵۹ء میں ممالک مغربی و شمالی کے گورنر ہو گئے، اور فروری سنہ ۱۸۶۳ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ انھوں نے ۲۴ ستمبر سنہ ۱۸۷۴ء کو انتقال کیا۔

ص ۱۶

(۱) یہ فارسی کے محاورہ "برہم زدن" کا ترجمہ ہے۔

(۲) نواب فردوس مکاں نے جواباً تحریر فرمایا "مشفقا! ہنگام ملاقات کے اکثر بعضے صاحبان بہادر ذیشان سے تذکار محامد و اوصاف ذاتی اور صفاتی آپ کا عمل میں آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل اور قدردانی سرکار دولتمدار سے یقین واثق ہے کہ جو مدارج شریف آپ کے قدیم سے ہیں، پیشگاہ گورنمنٹ بہادر سے بھی اسی مطابق ظہور میں آوے گا، کس واسطے کہ اہالی سرکار ابد قرار قدردان و قدرشناس ہیں۔"

(۳) کورٹ آف ڈائرکٹرز مراد ہے۔

(۴) میرزا صاحب نے اس عریضے میں جس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ اخبار الصنادید (۲، ۹۷-۱۱۰) کے بیان کے مطابق حسب ذیل ہے: "لارڈ کیننگ صاحب بہادر گورنر جنرل نے ۱۵ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء مطابق ۲۳ ربیع الثانی سنہ ۱۲۷۶ھ کو مقام فتح گڑھ میں ایک عالی شان دربار منعقد فرمایا... اس دربار میں بہت سے دیسی رؤسا اور بہت سے یورپین معزز حکام، خصوصاً کمانڈر انچیف صاحب، شریک تھے... اس دربار عام میں گورنر جنرل نے نواب فردوس مکاں سے مخاطب ہو کر کہا، "ہمکو بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ ان خدمات کے عوض جو آپ نے ملکۂ معظمہ کی کیں، آج آپ کا شکر ہو ادا کرنے کا موقع ملا۔ آپ اپنی ذات سے زمانۂ غدر میں نہایت مستعد اور صادق رہے، اور آپ نے باوجود خوف جان و ریاست کے، گرد و نواح میں نہایت مشقت اور مستعدی سے حکومت برقرار رکھی، اور ملکۂ معظمہ کے افسروں کی مدد بقدر امکان بخوبی کی۔ سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ آپ نے ایک مجمع کثیر ہم قوم ملکۂ معظمہ کی جانیں بچائیں، ان کو سب آفتوں سے محفوظ رکھا، اور ان کو ہر طرح کی آسایش دی، حالانکہ وہ زمانہ چاروں طرف خوف سے

گھرا ہوا تھا۔ میں بڑی خوشی سے روبرو سپہ سالار افواج ہند ملکہ معظمہ اور بہت سے معزز افسران ممالک مکی کے، جو گروہ نواح اور دیگر مقامات ہندوستان میں عہدہ ہای جلیلہ پر منصوب ہیں، آپ کے حسن خدمات کا اقرار کرتا ہوں۔ مجھکو تبصرح ہے کہ آپ کی کارگزاریوں کو یہ لوگ ہرگز نہ بھولیں گے۔ اس دربار میں گورنر جنرل نے نواب فردوس مکاں کو خلعت فینی میں ہزار روپیہ کا عطا کیا، اور سلامی کے فیر گیارہ کے بجائے تیرہ مقرر ہوئے۔ علاوہ اس کے "فرزند دلپذیر" کا خطاب عنایت ہوا، القاب و آداب ان الفاظ کے ساتھ قرار پایا: "نواب صاحب مشفق لبیار مہربان کرمفرمای مخلصان سلامت"۔

بعد ازاں ۲۵ نومبر ۱۸۵۹ء کو گورنر جنرل بہادر کے سکریٹری نے گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی کے سکریٹری کے نام حسب ارشاد گورنر جنرل بہادر ایک خط لکھا۔ اس خط کی دفعہ ۵ میں تحریر تھا: "گورنر جنرل نے.... نواب صاحب کو مطلع کیا کہ ان کی مستحکم وفاداری اور اعلیٰ درجے کی امداد کے سبب سے، جو انھوں نے گورنمنٹ کو دی ہے، ان کو پرگنہ کاشی پور ضلع مراد آباد جس کی جمع ایک لاکھ چار ہزار چار سو روپیہ سالانہ ہے، معافی میں بخشا ہے، جس کو وہ اور ان کے وارث اپنی جاگیر کے ایک ٹکڑے کے طور پر اپنے قبضے میں رکھیں"۔

اس عطیۂ شاہی کی تہنیت میں میرزا صاحب نے یہ قطعہ فارسی نظم کیا:

ای آنکہ خود بہر ہمی پروری مرا ؛ از غیب، مزد کار تو اجر عظیم باد
رای تو در زمانہ بامضای کارہا ؛ با اہتمام سہم سعادت سہیم باد
در صبح دولت تو، ز گلہای رنگ رنگ ؛ دائم، مشام دہر، رہین شمیم باد
آن دم، کہ مردہ را باذن زندہ ساختی ؛ در باغ طالع تو، بجای شمیم باد
پاشند آب گر، برہت بہر دقیقہ گرد ؛ ہر قطرہ زان، لمعۂ دُرِّ یتیم باد
ہر صبغۂ، کہ دہی ای از بہر امرتست ؛ فارغ ز ننگ زحمت تقدیم میم باد
گر بہر خویش نیز دعائی کنم، چہ باک ؛ این نغمہ ہم گزیدۂ طبع سلیم باد
آزادہ ام، خلوص دفا شیوۂ من ست ؛ راہم درای مسلک امید و بیم باد
چون رہروی کہ بر نمط جادہ رہ رود ؛ پیوست سیر من بخط مستقیم باد
مانند فکر من، رخ بختت تو دلفروز ؛ مانند کلک من، دل دشمن دو نیم باد
پابستۂ زمان و مکان نیست دولتمند ؛ گر خود رود بکعبہ، برین در مقیم باد
شادم بگنج امن و نگویم کہ بندہ را ؛ خشتی ز ذرِّ خالص و خشتی ز سیم باد
مقصود از لباس ہمان پوشش تنست ؛ پوشش گر از حریر نباشد، گلیم باد
بالجملہ این سہ بیت کہ سرجوش فکرتست ؛ در خور لطف خاص و عطای عمیم باد
"نواب مہر مہر سپہر چہر را ؛ حاصل جمال یوسف و قربت کلیم باد
چون غنچہ کہ پہلوی گل بشگفد بباغ ؛ ملک جدید، شامل ملک قدیم باد
ہردم ترا بخلوت و جلوت ندیم انس ؛ روح الامین مصاحب و غالب ندیم باد

(کلیات غالب فارسی: ۱۰۱۱)

اس قطعے کے متعلق یہ بتانا کہ کس تاریخ لکھا گیا اور کب راجپور پہنچا، سخت دشوار ہے، اس لیے کہ مثل میں ایسا کوئی خط شامل نہیں، جس میں اس کا ذکر ہو۔ لیکن ۲۰ نومبر کے مکتوب میں اس کا مذکور نہ ہونے کے باعث قیاس یہ ہے کہ اس تاریخ کے بعد لکھا گیا ہوگا، اور اسی مہینے کی کسی آخری تاریخ کو راجپور کے ڈاک خانے میں نواب فردوس مکاں کی خدمت میں ارسال ہوا ہوگا۔ نواب صاحب کی تاریخ روانگی و آمد صاحب

اخبار الصنادید نے ذکر نہیں کی۔ خود غالب صاحب نے ۱۱ دسمبر ۱۸۵۰ء (۸ نومبر سنہ ۱۲۶۷ھ) کو لکھا ہے: "مخلص بتاریخ ۱۰ اس مہینے کے طرف فرخ آباد کے روانہ ہوگا ۱۱ بتاریخ ۱۰ اس مہینے کے صاحبزادت کر کے رامپور پہنچے گا..... (مثل نمبر ۷۵) بعد ازاں ۲۵ دسمبر ثانی مطابق ۲۲ نومبر کو تحریر فرمایا ہے کہ "بتاریخ ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۵۹ء مخلص بخیریت تمام فایز اینجا گردید۔" (مثل نمبر ۷۶)

ص ۱۷

(۲) میرزا صاحب کے اس عریضے کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے ۲۰ جمادی الاولیٰ ۱۲۷۶ھ (۱۶ دسمبر ۱۸۵۹ء) کو تحریر فرمایا "مشفقا! بیاس ارقام سامی کے، کہ مخلص کو آپ کی ذات ستودہ صفات سے محبت اور موانست قلبی ہے، ہنڈوی مبلغ دو سو روپیہ کی سوائے مشاہرۂ معینہ معطوف رقیمۂ الوداد ہذا کے مرسل ہے، اور چشم داشت آپ کی لطف فرمائی سے یہ ہے۔ کہ رسید ہنڈوی مذکور سے مطلع اور مطمئن فرمائیں۔ اور سابق میں چند مرتبہ در باب تشریف فرمائی یہاں کے متکلف ہوا ہوں، لیکن ابتک آپ نے سوء ملاقات بہجت آیات سے مسرور نہیں فرمایا۔ اب لازم اشتیاق کا یہ ہے کہ آپ تشریف شریف باسرع ازمنہ ارزانی فرماویں اور مخلص کو منکور الطاف کا کریں۔"

اس ارشاد کی تعمیل میں میرزا صاحب صبح پنجشنبہ ۱۹ جنوری سنہ ۱۸۶۰ء کو دلی سے روانا ہو کر شام کو مراد نگر اور جمعہ ۲۰ جنوری کو میرٹھ پہنچے۔ وہاں ۲۱ کو قیام کر کے دوسرے دن شاہجہانپور، گڑھ مکتیسر اور مراد آباد ہوتے ہوئے اجمعہ کے دن ۲۷ جنوری کو دارد رامپور ہوئے۔ "یہاں متوجب ریاست مہمانداری کا انتظام کیا گیا اور محلۂ راجدوارہ میں ایک مکان قیام کے لیے عطا ہوا۔ نواب فردوس مکاں نے تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، اور چند دن کے بعد نہ دعوت کے نام سے سو روپے ماہوار مقرر فرما دیئے رامپور کی آب و ہوا میرزا صاحب کے مزاج کے موافق تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ یہاں زیادہ عرصے رہیں، لیکن یاقر علیخاں اور حسین علی خاں ساتھ آئے تھے۔ انھوں نے دلی واپس چلنے کی ضد کی۔ چونکہ یہ دونوں کم عمر تھے، اس لیے ان کا تنہا دلی بھیجنا مناسب نہ تھا۔ مجبوراً میرزا صاحب نے رخصت مراجعت کی درخواست کی۔ نواب فردوس مکاں نے اولاً قیام پر اصرار کیا۔ آخر کار اجازت عطا فرمادی اور میرزا صاحب رامپور سے ۱۷ مارچ سنہ ۱۸۶۰ء کو روانا ہو کر ۲۲ ماہ مذکور کو دلی پہنچے۔ سفر کی تفصیلات کے لیے دیباچہ ملاحظہ ہو۔

(۳) اس عریضے کے لفافے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ میرزا صاحب کے قیام رامپور کے زمانے میں نواب فردوس مکاں کی لکھا گیا، اور فتح محمد خاں صاحب کے توسط سے کیمپ میں پیش ہوا۔ مقام کا نام لفافے پر درج نہیں۔ لیکن جوابی فرمان کے مسودے میں "از مقام کھریا" تحریر ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس وقت سرکار بسلسلۂ دورۂ ریاست، موضع کھریا تحصیل سوار میں فروکش تھے۔

ص ۱۸

(۱) یہ عریضہ اُس فرمان کا جواب ہے، جو ۲۸ رمضان سنہ ۱۲۷۶ھ (۲۰ اپریل سنہ ۱۸۶۰ء) کو نواب صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ: "مشفقا! جب کوئی مسرت پیش آنیوالی ہوتی ہے، تو آغاز ہی سے مقدمات سرور پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے سامان نظر آتے ہیں کہ بے اختیار دل گواہ نشاط و طبیعت کو نشاط ہو۔ حسن اتفاق دیکھیے، کہ ۱۹ تاریخ اپریل سنہ حال چلے تو ایک لاکھ بیس ہزار کی جاگیر پر دخلدہانی کا خریطہ آیا۔ میں اوسے پڑھ ہی رہا تھا کہ آپ کا نامۂ سرور افزا آیا۔ اوس سے آپ کی پنشن کی بحالی کا مژدہ پایا۔ نشۂ سرور دوبالا ہو گیا، اور اس قدر بالیدگی اور خوشی حاصل ہوئی کہ زبان بیان اوس کا بجا لی زبان و قلم نہیں۔ بارخدایا مبارک ہو!

مباس سنم حقیقی ادا نہیں ہو سکتا۔ اس وقت میں بلا نقصان پنشن کا جاری ہونا محض شان قدرت یاری ہے شکر اوس کے احسانات کا کہانتک ادا کیجے! عجب قدرت نمائی فرمائی ہے۔ دل کو طرفہ مسرت ہاتھ آئی ہے۔" تفتہ کے نام کے ۹ مئی سنہ ۱۸۶۰ء کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴ مئی سنہ ۱۸۶۰ء کو زر پنشن وصول کیا گیا تھا (اردوی: ۹۰)۔ وصول شدہ رقم، دو ہزار دو سو پچاس روپیہ کے خرچ کی پوری تفصیل کے لیے اردوی: ۱۸۲، خط بنام مجروح ملاحظہ ہو۔

(۲) یہ خط حال میں خریدا گیا ہے۔ چونکہ یہ اصل مکتوب کی بغیر تاریخ کی نقل ہے، اس لیے تاریخ تحریر کا صحیح علم نہیں ہو سکا۔ البتہ اس میں برپلی کا علاقہ ملنے کا ذکر ہے، جو اپریل سنہ ۱۸۶۰ء میں فردوس مکاں کو ملا تھا، اس لیے قیاس یہ ہے کہ سرکار کے مکتوب مورخہ ۲۰ اپریل سنہ ۱۸۶۰ء کے جواب میں میرزا صاحب نے اپریل یا مئی سنہ ۱۸۶۰ء کی کسی تاریخ کو لکھا ہوگا۔

۲۰۵

(۱) کلیات غالب: ۳۲۷ میں بھی یہ قصیدہ چھپ چکا ہے۔

(۲) ۷ محرم سنہ ۱۲۷۷ھ (۲۶ جولائی سنہ ۱۸۶۰ء) کو سرکار نے تحریر فرمایا ہے کہ میر منشی کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ آئندہ سے آپ کے حسب ایما ہنڈوی روانا کی جایا کرے۔ (مثل منیر، صیغۂ احباب، عہد فردوس مکاں)

(۳) میرزا صاحب کا یہ نسخہ "کلمات فارسی حسب تصریح فرمان مورخہ ۱۸ رمضان سنہ ۱۲۷۷ھ (۳۰ مارچ سنہ ۱۸۶۱ء) ڈاک کے ذریعے حضور میں پیش ہوا۔ نواب صاحب نے اس کو مذکورہ فرمان میں "آئینۂ جہاں نما بل مخزن نکات مسرت افزا" اور فرمان مورخہ ۲۱ رمضان و ۲ اپریل میں "ایک دریای سواج ہے جلو ہزاران لآلی معنی سے" تحریر کیا ہے۔ یہ نسخہ کتب خانۂ سرکاری میں محفوظ ہے؛ خط نہایت صاف کاغذ نیلا اور متعدد مقامات پر میرزا صاحب کی تحریر سے مزین ہے۔ اس کے کاتب کے بارے میں میرزا صاحب نے نواب ضیاء الدین خاں بہادر کو لکھا تھا: "آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے؟ روز آپ کے مطالعہ میں نہیں رہتا۔ بغیر آپ کے دیکھے آپ کو کچھ کہنا نہ ہمدم ہوتا ہو، یہ بھی نہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں دیتے؟ رہا کتاب کے تلف ہو جانے کا اندیشہ، یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہوگی؟ احیاناً اگر ایسا ہوا، اور دلی لکھنؤ کے عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی، تو میں فوراً قبسیل ڈاک رامپور جاؤں گا، اور نواب فخر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔" (اردوی: ۲۸۹)

۲۱

(۱) اس عریضے میں نواب فردوس مکاں کے منجھلے صاحبزادے سید حیدر علی خاں بہادر کی شادی کا حوالہ ہے۔ یہ شادی نواب سید احمد علی خاں بہادر ابن نواب سید محمد علی خاں بہادر ابن نواب سید فیض اللہ خاں بہادر کی نواسی کے ساتھ ۱۵ ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۷ھ (۲۷ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء) کو قرار پائی تھی۔ مہینوں قبل سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ملازمان ریاست کو خلعت اور عام باشندگان شہر کو کھانا تقسیم ہوا تھا۔ سارے شہر میں جا بجا رقص و سرود کی محفلیں آراستہ کی گئی تھیں۔ ریاست کے بیرونی متوسلین اور احباب کے نام دعوتنامے جاری ہوئے تھے۔ میرزا صاحب کو بھی دعوت شرکت دی گئی تھی، لیکن وہ ضعف طبع کے سبب سے نہ آ سکے تھے۔ چنانچہ ۲۷ ستمبر سنہ ۱۸۶۱ء کو لکھا ہے: "والی رامپور نے بھی تو مرشد زادہ کی شادی میں بلایا تھا۔ یہی لکھا گیا کہ میں معدوم محض ہو گیا ہوں۔ تمہارا اقبال تمہارے کلام کو اصلاح دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر مجھ سے خدمت نہ چاہو۔" (اردوی: ۳۰۴ و ۳۰۵)

میرزا صاحب نے نورہ و خلعت کا عطیہ پا کر ایک تہنیت نامہ اور دو قطعات میارکباد نواب صاحب کی خدمت میں روانا کیے تھے۔ قطعات مثل میں شامل نہیں؛ لیکن کلیات فارسی (نولکشور ی ایڈیشن ۳۱)

میں شائع ہو چکے ہیں۔ فرماتے ہیں:

(۱)

دیدہ ور یوسف علیخان، کز فروغ رای او
صبح تابان بود قسط فیض و من هیچم یافتم

از دلیعهدش سخن رانم کہ چون ماہ منیر
طلعتش را مژدہ روشن سازِ عالم یافتم

دان دگر فرخندہ فرزندِ فرہمندش کہ ہست
کوکبی کش دودمانی مفخر مسلم یافتم

خواست تا سازد بآئینِ بہینش کد خدا
شادگشتم، چون خبر زین حشمِ اعظم یافتم

بہرہ بردم در تصور زان ہمایون انجمن
لیک در خود طاقتِ ریخ سفر کم یافتم

بزمِ طوی فرخِ حیدر علی خان را بدہر
خوشتر و خرم تر از بزم کی و جم یافتم

سالِ این دولت فزا شادی باسمانِ نظر
"مشتری" با "ماہ زہرہ" در "طالع" فراہم یافتم

اس قطعے میں مصرعِ آخر کے الفاظ (زہرہ، مشتری، اور طالع) سے سالِ جشن کے اعداد ۱۲۷۷ نکلتے ہیں۔

(۲)

بہارِ ہند کہ نامند بر نگال آنرا
پس از دو سال بر اہلِ جہان مبارکباد

بباغ و کشت و بیابان و کوہ، سرتاسر
سحاب و سبزہ و آبِ روان مبارکباد

گزشت عہدِ سوم از دزیدِ بادِ خنک
زبان بر تن، دگر از تن بجان مبارکباد

اگرچہ رحمتِ عامست، لیک باتخصیص
برامپور کران تا کران مبارکباد

ز برگ برگِ نیستان کہ گردِ آن شہرست
رسد بگوش چنان کز زبان مبارکباد

ز انبساط نژادست آنچنان کہ از رگِ ابر
بجای قطرہ تراود ہمان مبارکباد

سپس بیاد گر آیم کہ اہلِ دانش را
شود ہر آئینہ خاطر نشان مبارکباد

خود ابر و باد گہی زد یار نبود
علیہ آنیت کہ بر ہنگان مبارکباد

معاف باشم، اگر خود ز خویشتن پرسم:
"برامپور خصوصاً چہان مبارکباد"

چو با سپہر بود وجہِ تازہ روئی دہر
ز ہر چہ این ہمہ گل کرد آن مبارکباد

ز نیضِ ہمتِ فرمانروای آن شہرست
کہ ورد خلق بود ہر زمان مبارکباد

ظہورِ میمنتِ کہ خدائی را فرزند
بر آن رئیسِ سپہر آستان مبارکباد

کہ مہمانِ حق است آن و ما طفیلی اند
بسیب و دامنِ مردم ز بخشش نواب

کشائشی در گنجینہ و آنگ از مدگ
متاعِ خانہ دریا و کان مبارکباد

بطالبانِ زر و سیم، سیم و زر فرخ
بدرِ شتافتنِ پاسبان مبارکباد

بمن کہ نشئہ لبِ بادہ ہای پرزورم،
بسائلانِ مئی کاسہ نان مبارکباد

نگو ز شادیِ اہلِ زمین کہ می گویند
ازان میان دو سہ دلگران مبارکباد

چمن ترانہ کہ "ہان" ای امیرِ شاہ نشان
فرشتگانِ بلند آسمان مبارکباد

بشہریار و ولیعہد و شاہزادۂ عہد
خوید نسرخیِ جاودان مبارکباد

ازان جہت کہ ستایشِ نگارِ نوابی
خوشی و خوبی دامن و امان مبارکباد

تراہم، ای اسداللہ خان، مبارکباد

نواب فردوس مکان نے غرۂ محرم الحرام سنہ ۱۲۷۸ھ (۱۱ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء) کو ان قطعات کے متعلق تحریر فرمایا: "..... قطعات مبارکباد اور نہنیت نامۂ شادی کہ خدائی برخوردار کامگار محمد حیدر علیخان بہادر

ایام فرحت التیام میں سرور افزای خاطر نیاز ہوئے، اور سرمایۂ ہزاراں مسرت اور شادمانی کا ارزانی کیا سبحان اللہ ہر یک فقرہ طوطی اور تہنیت نامہ کا مضامین بہجت آگیں اور معانی لطافت تضمین سے ایسا مملو تھا کہ دعوا اس کا احاطۂ تحریر و تقریر سے متزاید ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ابدالدہر سلامت باجمعیت رکھے۔" (مثل نمبر ۲، صفحۂ احباب، عہد فردوس مکاں)

اب صرف تہنیت نامہ باقی رہ جاتا ہے۔ بظاہر عریضۂ ۲ تہنیت نامہ معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کو مذکورۂ فرمان تہنیت نامہ قرار نہیں دے سکتے، اس لیے کہ فرمان سے مترشح ہے کہ تہنیت نامہ بھی منظوم تھا، اور یہ عریضہ منثور ہے۔ علاوہ بریں اس کو تہنیت نامہ قرار دینا اس لیے بھی ناممکن ہے، کہ یہ لفافے کی انگریزی تاریخ کے مطابق ۱۵ جولائی کو لکھا گیا تھا، اور تہنیت نامہ کا ذکر نواب صاحب کے ۱۱ جولائی کے فرمان میں آچکا ہے۔

(۲) علی بخش خاں شیخ محبوب بخش بن شیخ امان اللہ کے بیٹے تھے۔ یہ ۱۴ شوال سنہ ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) کو نجیب آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا اور نانا اس ریاست کے پرانے نوکر اور خدمت گزار تھے۔ انھوں نے ایام غدر میں بڑی جانفشانی اور خیر خواہی سے کام کیا، اور اس صلے میں گورنمنٹ سے پانچ ہزار روپیہ کا خلعت، تلوار طلائی گھڑی اور تین ہزار جو مہ روپیہ سالانہ کی جاگیر ضلع مراد آباد میں انعام پائی۔ نواب خلد آشیاں نے تخت نشینی کے ایک سال بعد انھیں چالیس ہزار روپے کا نقد بخشش عطا کیے، اور جب یہ بیمار ہوئے، تو وہ بار بار نفیس ان کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ انھوں نے ۲ محرم سنہ ۱۲۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ء کو رامپور میں انتقال کیا اور مولانا جمال الدین کے مزار میں دفن ہوئے۔ ان کی اولاد میں مولانا محمد علی مرحوم بین الاسلامی شہرت کے دعوی رہتا ہوئے ہیں (اخبار الصنادید، ۱۴۱، و تذکرۂ کاملان رامپور: ۴۲۶)۔

(۳) میر سرفراز حسین، میر مہدی مجروح کے بھائی اور میر افضل علی عرف میرن صاحب ان کے دوست تھے۔ میرزا صاحب سے بھی ان دونوں کے خورد انہ تعلقات تھے۔ اردو کی معلی اور عود ہندی میں ان کے نام متعدد خطوط درج ہیں۔ میرزا صاحب نے ان کی پریشان روزگاری کا حال دیکھا، تو غالباً ان صاحب کے نام تعارفی خط دیکر رامپور بھیجا۔ شومئی بخت سے اُس وقت یہاں ملازمت نہ مل سکی، اور یہ دونوں سو روپے کے زیر باری کے بعد واپس چلے گئے۔ اس سلسلے میں میرزا صاحب نے میر مہدی کو لکھا ہے: "سید صاحب کل پرسوں رہے، تمھارا خط پہنچا۔ یقین ہے کہ اوسی وقت یا شام کو میر سرفراز حسین تمھارے پاس پہنچ گئے ہوں حال سفر کا، جو کچھ ہے، اون کی زبانی سن لوگے، میں کیا لکھوں؟ میں نے بھی جو کچھ سنا ہے، اونھیں سے سنا ہے اون کا اس طرح ناکام پھرنا میری تمنا اور میری مقصود کے خلاف ہے، لیکن میرے عقیدے اور میرے تصور کے مطابق ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں کچھ نہ ہوگا۔ سو روپیہ کی تاحق زیر باری ہوئی۔ چونکہ یہ زیر باری میرے بھروسے پر ہوئی، تو مجھے خرسماری ہوئی۔ لیکن میں نے اس چھپا سٹھ برس میں اس طرح کی شرمساریاں اور رو سیاہیاں بہت اوٹھائی ہیں۔ جہاں ہزار واقع ہیں، ایک ہزار ایک سہی۔ میر سرفراز حسین کی زیر باری سے دل کڑھتا ہے" (اردوی معلی: ۱۸۵)۔ لیکن اناں ۱۸ اگست سنہ ۱۸۶۱ء کو پھر لکھتے ہیں: "بھائی تم سچ کہتے ہو۔ بر سر فرزند آدم ہر چہ آید بگزرد۔ لیکن مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ یہ زیر باری میری تحریر کے بھروسہ پر ہوئی اور خلاف میری مرضی کے ہوئی۔ جس طرح سے یہ آئے ہیں، اگرچہ میری طبیعت اور میری خواہش کے منافی ہے، لیکن واللہ میرے عقیدہ اور تصور اور قیاس کے مطابق ہے، یعنی میں یہی سمجھا تھا کہ البتہ یونہی ہوگا۔" (ایضاً: ۱۵۴)

نواب فردوس مکاں کے ایک فرمان مورخہ ۱۰ اگست سے پتا چلتا ہے کہ میرزا صاحب کی ہدایت کے مطابق ان کی جولائی کی تنخواہ میں سے پچیس روپے نقد میر سرفراز حسین صاحب کو (غالباً زادِ راہ کے لیے) منشی سلیچند کی معرفت دیے گئے تھے (مثل نمبر ۱۹، صفحۂ احباب، عہد فردوس مکاں)

ص ۲۲

(۱) نواب صاحب کے مذکورہ سفر کی تفصیل یہ ہے، کہ "..... جناب ملکۂ معظمہ وکٹوریہ آنجہانی کا ایک فرمان ۲۰ جولائی سنہ ۱۸۶۱ء کو صادر ہوا، جس کا خلاصہ یہ تھا:

[مابدولت نے اپنی مرضیٔ خاص اور علم کامل اور عزم مبارک سے ایک رتبۂ جدید بہادری، جو آج سے دوام کیلیے خطاب 'موسٹ اگزالٹڈ آرڈر آف دی اسٹار آف انڈیا' سے موسوم ہو کر مشہور ہوگا، تجویز اور ایجاد کیا ہے، اور مابدولت کا ارشاد ہوتا ہے کہ رتبۂ مذکور میں ایک شخص 'سا درن' (سردار اعلیٰ) ایک 'گرانڈ ماسٹر' (سردار) اور کچھ 'نائٹ' (بہادر) شریک رہیں، اور رؤسائے ہند اور سرداران ہندوستانی اور ہماری رعایا میں سے وہ اشخاص، جو اس قسم کی لیاقت رکھتے ہوں، اس رتبۂ عالی سے محروم نہ کیے جائیں۔ مابدولت کی تجویز اقدس سے مابدولت کے عزیز مشیر اکبر چارلس جان ارل کیننگ گورنر جنرل ہندوستان اس..... رتبہ کے اول سردار مقرر ہوئے۔ اور یہ مقتضائے دانشمندی اور مصلحت ہے کہ رتبۂ مذکور کا سردار ایسے اشخاص کو، جو وقتاً فوقتاً مابدولت کی تجویز اقدس سے نامزد ہو کر اس رتبہ کے بہادر مقرر کیے جائیں، عہدۂ موسومۂ 'نائٹ بیچلر' عطا کرنے کا مجاز ہے.....] اس کام کے واسطے لارڈ کیننگ صاحب نے ایک دربار الہ آباد میں مقرر کرنے کی تجویز کی، اور نواب سید یوسف علی خاں بہادر کو بھی بلایا۔ نواب صاحب مع خدم وحشم الہ آباد گئے۔ یکم نومبر سنہ ۱۸۶۱ء کو ایک شاہانہ دربار منعقد ہوا۔ جب تمام اہالی مجلس اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے، تو نواب صاحب بہادر تخت شاہی کے محاذی تشریف لے گئے، اور گورنر جنرل نے اپنے ہاتھ سے اس رتبہ کے تمغے عطا فرمائے، اور کھڑے ہو کر بیان کیا:... چونکہ یہ رتبہ سب سے پہلے آپ صاحبوں کو عطا ہوا ہے، امید ہے کہ آپ ہند کے باشندوں میں ایسا طرز اختیار کریں گے کہ آپ کا طرز عمل دیکھنے سے ہند کے سرداروں یا جاگیرداروں کو ملکۂ معظمہ کے ساتھ محبت دلی اور اتحاد قلبی پیدا ہو۔ بعد اس تقریر کے دربار برخاست ہوا، اور نواب صاحب، گورنر جنرل سے رخصت ہو کر اپنے کارگاہ ریاست کو واپس تشریف لائے۔" (اخبار الصنادید: ۲، ۱۱۳-۱۱۶)

نواب صاحب کے فرمان بنام غالب مورخہ ۲ ربیع الثانی سنہ ۷۸ھ (۱۰ اکتوبر سنہ ۶۱ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳ اکتوبر سنہ ۶۱ء کو الہ آباد روانہ ہونے کا ارادہ اور طرز تاراد تجویز بے عمل ہے۔"

(۲) نورالدین ظہوری، ترشیز (ایران) کا باشندہ تھا۔ سنہ ۹۸۰ھ (۱۵۸۰ء) میں دکن آیا، اور ابراہیم عادل شاہ کے دربار میں تقرب حاصل کیا، اور سنہ ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) میں فوت ہو گیا۔ اس کی مثنوی اور کلیات مشہور ہے۔

(۳) خدا جانے کس بات سے میرزا صاحب کو یہ شک گزرا کہ سرکار کچھ کشیدہ ہیں۔ ورنہ مثنوں میں سرکار کے ۶۲ء کے لکھے ہوئے خیریت جوئی کے فرمان خاصی تعداد میں موجود ہیں۔

(۴) یہ عبارت عریضے کے آخر میں مہر کے بعد تحریر ہے۔

۲۴

(۱) لفافے پر یوم جمعہ ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۲ لکھا ہے۔

(۲) میر رابرٹ منٹگمری صاحب مراد ہیں۔ یہ فروری سنہ ۱۸۵۹ء سے جنوری سنہ ۱۸۶۵ء تک پنجاب کے لفٹنٹ گورنر رہے تھے۔ قدر بلگرامی کے نام کے مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب ان کے دربار میں شریک نہیں ہوئے۔ دربار کے بعد منٹگمری صاحب نے بلا کر اپنی طرف سے خلعت عطا کیا، اور وہیں دربار انبالہ کے متعلق گفتگو ہوئی۔ فرماتے ہیں: "... رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ بہادر پنجاب یہاں (دلی) آئے، دربار کیا، میں گیا۔ دربار کے بعد ایک دن بارہ بجے چپراسی آکر مجھکو بلا لے گیا۔ بہت عنایت فرمائی اور اپنی طرف سے خلعت عطا کیا۔" (اردو دی: ۴۰۶، لاہور ایڈیشن ۱۹۷۶ء)۔ شیو نرائن کے نام کے خط میں فرماتے ہیں: "... بڑے لاٹ صاحب کے ورود کے زمانے میں نواب لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب بھی دلی میں آئے۔ دربار کیا، خیر کرو، مجھ کو کیا؟ ناگاہ دربار کے تیسرے دن بارہ بجے چپراسی آیا، اور کہا کہ نواب لفٹنٹ گورنر نے یاد کیا ہے۔ بھائی یہ آخر فروری ہے، اور میرا حال یہ ہے کہ علاوہ اوس دائیں بات کے زخم کے سیدھی ران میں اور بائیں بات میں ایک ایک پھوڑا جدا ہے، حاجتی میں پیشاب کرتا ہوں، اوٹھنا دشوار ہے۔ بہرحال سوار ہو گیا۔ پہلے صاحب سکرٹر بہادر سے ملا۔ پھر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تصور میں کیا بلکہ تمنا میں بھی جو بات نہ تھی وہ حاصل ہوئی، یعنی عنایت سی عنایت، اخلاق سے اخلاق۔ وقت رخصت خلعت دیا، اور فرمایا کہ یہ ہم تجھ کو اپنی طرف سے ازراہ محبت دیتے ہیں، اور مژدہ دیتے ہیں کہ لاٹ صاحب کے دربار میں بھی تیرا لمبرادر خلعت کھل گیا۔ انبالے جا، دربار میں شریک ہو، خلعت پہن۔ حال عرض کیا گیا۔ فرمایا: "خیر اور کبھی کے دربار میں شریک ہونا۔" اس پھوڑے کا بُرا ہو انبالے نہ جا سکا۔" (اردو دی: ۴۰۳، ۴۰۴)

(۳) لارڈ الگن بہادر مراد ہیں۔ یہ لارڈ کیننگ کے بعد ہندوستان کے وائسرائے ہوئے۔ جنوری سنہ ۱۸۶۲ء میں چارج لیا اور ۲۰ نومبر سنہ ۱۸۶۳ء کو فوت ہو گئے۔ میرزا صاحب ایک مکتوب کے آخر میں لکھتے ہیں: "۲۱ جمادی الثانی سال غضب مطابق ۳ دسمبر سال کیا غضب ہے ہے، یہ گویا تاریخ وفات جناب نواب گورنر جنرل لارڈ الگن صاحب بہادر کی ہے۔" (اردو دی: ۴۰۵)

۲۵

(۱) میرزا صاحب نے ۱۳ رمضان مطابق ۴ مارچ (سنہ ۶۴) کو تفتہ کے نام حسب ذیل خط لکھا ہے: "... ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھکو ۷ بار جے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار اور خلعت بند کر گئے ہیں۔ ناامید ہو کر بیٹھ رہا، اور مدۃ العمر کو مایوس ہو رہا۔ اب جو یہاں لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے ہیں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل انھوں نے مجھکو بلا بھیجا۔ بہت سی عنایت زبانی اور فرمایا کہ لاٹ صاحب والی میں دربار نہ کریں گے، میرٹ ہوتے ہوئے اور میرٹ میں اول اضلاع کے علاقہ داروں اور مالگزاروں کا دربار کرتے ہوئے انبالے جائیں گے۔ دلی کے لوگوں کا دربار وہاں ہو گا۔ تم بھی انبالے جاؤ۔ شریک دربار ہو کر خلعت معمولی لے آؤ۔ بھائی، کیا کہوں کہ کیا میرے دل پر گزری! گویا مردہ جی اٹھا! مگر ساتھ اس مسرت کے یہ بھی سنا گزرا کہ سامان سفر انبالہ و مصارف بے انتہا کہاں سے لاؤں اور طرفہ یہ کہ نذر معمولی میری قصیدہ ہے۔ ادھر قصیدہ کی فکر، ادھر مصرف روپیہ کی تدبیر۔ حواس ٹھکانے نہیں شعر کام دل دماغ کا ہے، وہ روپیہ کی فکر میں پریشان۔ میرا خدا یہ مشکل بھی آسان کرے گا۔ لیکن ابتو میں نہ دن کو چین ہے، نہ رات کو نیند ہے۔ یہ کئی سطریں تھیں، اور ایسی ہی کئی سطریں جناب نواب صاحب

لکھ کر بھیجدی ہیں۔ جیتا رہا تو انبالے سے آکر خط لکھوں گا" (اردو دی: ۱۱۱)۔
اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے محولۂ بالا "سطریں" چار مارچ کو یا اس سے ایک دن قبل نواب صاحب کی خدمت میں ارسال کی تھیں۔ سو اتفاق سے ان سطور والا عریضہ مثل میں موجود نہیں۔ البتہ نواب صاحب کا جواب شامل ہے۔ القاب و آداب کے بعد ارشاد فرمایا ہے: "... مشفقا! ہنڈوی سلغ دو صد روپیہ برای مصارف تشریف فرمائی سامی برای ملازمت جناب مستطاب معظم الیہم معطوف رقیمۂ اولواد ہذا مرسل خدمت شریف است"۔ یہ فرمان ۱۱ مارچ سنہ ۶۳ء کو تحریر کیا گیا تھا۔ میرزا صاحب کے عریضے میں اسی کا حوالہ ہے۔ اصل عریضے کے جواب میں نواب فردوس مکاں نے ۱۹ مارچ کو تحریر فرمایا: "... چوں خط نواب صاحب کمشنر بہادر سے عدم حصول رخصت ملازمت جناب مستطاب معلی القاب نواب گورنر جنرل بہادر دام اقبالہم کا بمقام انبالے مستنبط ہے، اسواسطے قبل از جانا آپ کا انبالے کو بلا استجازت ضرور نہیں معلوم ہوتا۔ آئندہ جو رای زریں آپ کی اس خصوص میں مقتضی ہو۔ اور خط مسطور بجنسہ واپس بھیجا جاتا ہے..."۔

(۲) قصیدۂ مذکور کے لیے مثنوی ابر گہربار (ص ۳۵، اکمل المطابع، دہلی، سنہ ۱۲۸۰ھ) ملاحظہ ہو۔

۲۶

(۱) صاحب سکرٹر بہادر کے محولۂ بالا خط کی نقل حسب ذیل ہے:

نقل خط جناب صاحب سکرٹر بہادر

سرنامہ

در شہر دہلی

خانصاحب بیار مہربان دوستان، مرزا اسد اللہ خان سلمہ اللہ تعالی

خط بر کاغذ خاص

خانصاحب بیار مہربان دوستان سلامت

قصیدۂ با آب و تاب در مدحت بندگان نواب مستطاب معلی القاب دلسای دگورنر جنرل بہادر، دام اقبالہ وصول گردیدہ، بر رخ ارادت مہربان آبی، و بر جبین عقیدت ایشان تابی افزود، واز گزارش گوہرہای بحر فکر کیتا سخنور معنی پرور کہ گنج بر گنج نہادہ بود، از نظر قبولی بندگان نواب صاحب ممدوح گزشتہ، طرب پیرای خاطر ہمایون ایشان گشت۔ زیادہ چہ نگاشتہ آید۔ دستخط انگریزی مرقوم ۴ جولائی سنہ ۱۸۶۳ء۔

یہاں یہ امر قابل اظہار ہے کہ میرزا صاحب کے اس روحانی سرور کے حصول میں اُن کے ایک جسمانی عارضے نے خلل اندازی کی۔ ۲۷ مارچ سنہ ۱۸۶۳ء کو میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں: "رجب کے مہینے میں بیدمے ہاتھ پر ایک پھنسی ہوئی، پھنسی پھوڑا ہو گئی، پھوڑا پھوٹ کر زخم بنا، زخم بگڑ کر غار ہو گیا۔ اب بقدر یک کف دست وہ گوشت مردار ہو گیا۔ انبالے نجانے کی بھی یہی وجہ ہوئی (اردو دی: ۱۵۲) بعد ازاں ۳ مئی کو شیو نرائن کو لکھا ہے: "... اس پھوڑے کا برا ہوا انبالے نجا سکا، (ایضاً: ۲۸۴) قصہ کوتاہ ایک غیر مورخہ خط میں اطلاع دی ہے: "بوصاحب! ہم نے نفقۂ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے انبالے کا جانا موقوف کیا، اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت اور دقت پر موقوف رکھا۔ بارے جو بات پر ایک زخم، زخم کیا ایک غار ہو گیا ہے۔ دیکھیے انجام کار کیا ہوتا ہے"۔ (ایضاً: ۳۶۰۔ لاہور ایڈیشن ۱۹۷۸ء)

(۲) آموں کی بیتگیاں ۲۹ جون سنہ ۱۸۶۳ء کو یہاں سے روانہ کی گئی تھیں۔

۲۷

(۱) حسین علی خاں کے لیے دیباچہ بحث "خاندان سبھی" ملاحظہ ہو۔

۲۸

(۱) نواب فردوس مکاں اس سال عارضۂ سرطان میں مبتلا ہو کر مسلسل ۶ ماہ تک علیل رہے۔ میرزا صاحب سے اُن کے تعلقات شاگردانہ اور کریمانہ تھے۔ جب انھیں علالت کی اطلاع ملی، تو بہت متردد ہوئے اور بذریعۂ عریضۂ ہذا حقیقت مرض سے آگاہ کرنے کی درخواست کی۔ مثل میں اس عریضے کا جواب موجود نہیں ہے۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً شدت مرض کے سبب سے جواب میں تاخیر ہوئی، اور جب اس عرصے میں میرزا صاحب کا آئندہ خط بھی موصول ہو گیا، تو دونوں کے جواب میں مرض کی حقیقت سے انھیں اطلاع دی گئی۔

(۲) اس عریضے کے جواب میں ۱۹ نومبر کو نواب صاحب نے تحریر فرمایا "مشفقا! اب فضل الٰہی سے پھوڑا لاحقہ میں بہت تخفیف اور قریب الاندمال کلی ہے۔" عریضۂ ۲۵ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرمان میرزا صاحب کو ۲۶ نومبر کو موصول ہوا۔

۲۹

(۱) اشعار مذکور کے متعلق عریضے کے لفافے پر نوٹ ہے: "حسب الحکم تاریخ نزد مولوی امیر احمد صاحب فرستادہ شد۔ یکم دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء"۔ امیر مینائی مرحوم نے انتخاب یادگار (ص ۲۵۰) میں، قطعۂ تاریخ غسل صحت کے نام سے یہ ۶ شعر درج کیے ہیں:

دانم، شنیدۂ کہ در اقصای مغربست — سرچشمۂ کہ خضر سند از دے بقا نزیر
جوئی پدیدہ اند دسدان کردہ اند آب — حمام ہا بحوض ازان فرخ آب طہیر
ہنگام شب کہ زیر زمین باشد آفتاب — از تاب مہر گرم شد آن آب ناگزیر
حمام حوض بنگر و گلی جامش آسمان — و آن را سفید کردہ فروغ سہ منیر
آمد برای غسل بہ گرمابہ اندرون — مانند معنی کہ بند روی در ضمیر
اینک (فراغ) و (اختر نیک) در خجستہ رونما — پیداست زین سہ لفظ سہ تاریخ دلپذیر

"سبد بخیر" (ص ۶۵، طبع دہلی ۱۹۰۲ء) میں اس قطعے کے ۱۰ شعر درج ہیں۔ خط میں ذکر کی ہوئی تعداد کے پیش نظر یا تو یہ کہا جائیگا کہ میرزا صاحب نے ان میں سے سات شعر چن کر نواب فردوس مکاں کو بھیجے تھے اور یا یہ کہ خط میں صرف بیان واقعہ کے طور پر میرزا صاحب نے لکھا تھا کہ رات، شعر کہنے کے بعد میں سویا۔ ورنہ بھیجے پورے ۱۰ شعر ہی تھے، رات کے لکھے ہوئے اور ۲۹ صبح اُٹھ کر کہے ہوئے۔ نواب صاحب نے اس قطعے کی تعریف میں سب ذیل گرامی نامہ ۲۴ شعبان ۱۲۸۱ھ (۲۵ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء) کو تحریر فرمایا: "ہماری صحت کی تہنیت میں قطعہ مبارک باد کا جو آپ نے بھیجا ہے، وہ پہنچا اور اس کے آنے سے سرور صحت دوبالا ہو گیا۔ ایسی نظم، ایسی تاریخیں دوسرے سے کب ہو سکتی ہیں حقا! کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بے مثل اور عدیم النظیر پیدا کیا ہے۔ جس کمال کو دیکھیے اوس میں آپ کی ذات فرد کامل ہے۔ فی الحقیقت ہم نے اس مرض میں بڑی تکلیف اُٹھائی، بہت ایذا پائی۔ اللہ نے بڑا فضل فرمایا۔ دوستوں کی دعا کو قبول کیا۔ شفا حاصل ہو گئی ہے۔ اندک زخم اندمال ہونے کو باقی ہے۔ غالب ہے کہ دس بارہ دن میں مرہم لگانا موقوف ہو جائے۔ آپ کا ہدیۂ مرسلہ اکثر نقل محفل رہتا ہے جو سنتا ہے، جو دیکھتا ہے، دادِ تحسین دیتا ہے۔ سچ ہے، ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ ہزاروں

برس فلک چرخ لگاتا ہے، تب کہیں ایک شخص اس کمال کا پیدا ہوتا ہے۔ الہم بصحت و عافیت طول عمر عطا کرے، اور تادیر گاہ اہل جہاں آپ کی ذات سے مستفید ہوا کریں۔ باقی خیریت"

۳۳

(۱) قطعۂ تاریخ غسل عربیہ (۳۹) کے حاشیے میں درج کیا جا چکا ہے۔ قصیدۂ تہنیت جو منشی سیل چند کے نام کے خط مورخہ ۱۹ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء کے مطابق ۹، شعبان سنہ ۱۲۸۱ھ (۸ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء) اور ۲۵ رجب (۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء) کے درمیان لکھا گیا تھا، مثنل میں شامل نہیں ہے۔ لیکن اردو دیوان غالب مع شرح نظامی (مطبوعۂ نظامی پریس بدایوں، سنہ ۱۹۲۲ء) کے صفحات ۲۴۴-۲۴۷ پر ایک قصیدہ پایا جاتا ہے، جو نواب سعیدالدین احمد خاں طالب مرحوم، جاگیردار ریاست لوہارو، سے رسالۂ کمال دہلی کو حاصل ہوا تھا، اور اس کی اشاعت جنوری سنہ ۱۹۱۰ء سے مولانا نظامی نے نقل کیا ہے۔ مولانا کے خیال میں یہ قصیدہ نواب خلد آشیاں کے غسل صحت کی تہنیت میں لکھا گیا تھا۔ میرے نزدیک یہ میرزا غالب کا محولۂ بالا قصیدہ ہے، اس لیے کہ اس میں جشن کے موقع پر عید، نوروز، اور ہولی کا جمع ہونا تحریر کیا گیا ہے، اور امیر مینائی کے قطعۂ تاریخ (انتخاب یادگار: ۵۰، و مرآۃ الغیب: ۳۴۰، مطبع نولکشور، کانپور سنہ ۱۹۰۴ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ تیوہاروں کا یہ اجتماع نواب فردوس مکاں کے غسل صحت کے وقت ہوا تھا۔ ان کے قطعہ کا آخری مصرع ہے: "مہنا عید کا نوروز کا دن روز صحت ہے"

میرزا صاحب کا قصیدہ حسب ذیل ہے:

مرحبا! سالِ فرخی آئین — عیدِ شوال و ماہِ فروردیں
شب و روز، افتتاحِ لیل و نہار — مہ و سال، اشرفِ شہور و سنیں
گرچہ ہے بعد عید کے نوروز — لیک بیں از سہ ہفتہ بعد نہیں
سو اس اکیس دن میں ہولی کی — جابجا مجلسیں ہوئیں رنگیں
شہر میں کو بکو عبیر و گلال — باغ میں سو بسو گل و نسریں
شہر گویا نمونۂ گلزار — باغ گویا نگار خانۂ چیں
تین تیوہار، اور ایسے خوب — جمع ہرگز ہوئے نہوں گے کہیں
پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں — منعقد محفلِ نشاط قریں
محفلِ غسلِ صحتِ نواب — رونق افزائے مسندِ تمکیں
نرنگہ میں، امیرِ سناہ نشان — رزنگہ میں، حریفِ شیر کمیں
پیشگاہِ حضور، شوکت و جاہ — خیر خواہِ جناب، دولت دیں
جن کی منہ کا سا سماں گوشہ — جن کی خاتم کا آفتاب نگیں
جن کی دیوار قصر کے نیچے — آسماں ہے گدائی سایہ نشیں
دہر میں اس طرح کی بزمِ سرور — نہ ہوئی ہو کبھی بروی زمیں
انجمیں چرخ، گوہر آگیں فرش — نور مے، ماہ ساغرِ سیمیں
راجہ اندر کا جو اکھاڑا ہے — ہے وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں
وہ نظر گاہِ اہلِ وہم و خیال — یہ ضیا بخشِ چشمِ اہلِ یقیں
واں کہاں یہ عطا و بذل و کرم — کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں
یاں زمیں پر نظر جہانتک جائے — زلہ آسا، بچھے ہیں دُر ثمیں

نغمۂ سطربانِ زہرہ نوا — جلوۂ لولیانِ ماہ جبین
اوس اکھاڑے میں جو کہ ہے مظلوں — یاں وہ دیکھا بہ چشمِ صورت بیں
سرورِ صفر ہوا جو سوار — بہ کمالِ تجمل و تزئیں
سب نے جانا کہ ہے پری توسن — اور بالِ پری ہے دامنِ زیں
نقشِ سُمِ سمند سے یک سر — بنگیا دشت دامنِ گل چیں
فوج کی گردِ راہ مشک فشاں — رہ رووں کے مشام عطر آگیں
بس کہ بخشی ہے فوج کو عزت — فوج کا ہر پیادہ ہے فرزیں
موکبِ خاص یوں زمیں پر تھا — جیں طرح ہے سپہر پر پروین
چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام — ران پر داغ تازہ دیکھے وہیں
اور داغ آپ کی غلامی کا — خاص بہرام کا ہے زیبِ سریر
بندہ پرور! تنا طرازی سے — مدعا عرضِ فنِ شعر نہیں
آپ کی مدح اور میرا منھ — گو کہوں بھی تو آئے کس کو یقیں
اور پھر اب کہ ضعفِ پیری سے — ہوگیا ہوں نزار و زار و حزیں
پیری و بیتی، خدا کی پناہ! — دستِ خالی و خاطرِ غمگیں
صرف اظہار ہے ارادت کا — ہے قلم کی جو سجدہ ریز جبیں
مدح گستر نہیں، دعا گو ہے — غالبِ عاجز نیاز آگیں
ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں — تم رہو زندہ جاوداں، آمیں!

دیوان غالب اردو کے طاہر ایڈیشن میں بھی یہ قصیدہ شائع ہو چکا ہے۔

(۲) اس نثر کی رسید میں ۵ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۱ھ (۳ اپریل سنہ ۱۸۶۵ء) کو نواب صاحب نے تحریر فرمایا:
"نثر نثرِ دنبالہ آپ کی آئی۔ جشنِ صحت کی مسرت بڑھائی۔ زبانِ خامہ کو مجالِ مدحت نہیں۔ خامۂ زبان کو یارائی مدحت نہیں۔ سچ یہ ہے کہ آپ کی ذات ہر کمال میں فرد کامل ہے۔ ہر فقرے میں قوت سحر بیانی حاصل ہے۔ انصاف کی تو یہ بات ہے، کہ یہ تحریر نہیں کرامات ہے۔ اس جشن میں اگرچہ بظاہر آپ شریک نہیں ہوئے، مگر میرے نزدیک شریک غالب رہے۔ اللہ تعالیٰ صحت اور قوت عطا فرمائے۔ شتاقوں کو لطف مجالست ہاتھ آئے۔ دست دعا بلند ہے۔ تو بدصحت کی طبیعت آرزومند ہے۔ حال اپنا اکثر لکھتے رہیے۔ زیادہ شوق ہے" میرزا صاحب کے خط کے لفافے پر امیر مینائی نے لکھا ہے: "بندہ نواز، منشی سیلچند صاحب، حسب الامر سرکار مسودۂ جواب خط مرزا نوشہ صاحب نوستہ بخدمت میفرستم۔ حسبِ ضابطہ ارسال باید فرمود۔ امیر فقیر" اخبار الصنادید (۲، ۱۲۳) سے معلوم ہوتا ہے کہ حسب تجویز صاحبزادہ سید کاظم علی خاں بہادر، عرف چھوٹے صاحب، باغ بنظیر میں یہ جشن منایا گیا تھا۔

۳۶۵

(۱) ۲۴ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۱ ہجری (۲۱ اپریل سنہ ۱۸۶۵ م) کو جمعے کے دن نصف النہار کے وقت نواب فردوس مکاں نے انتقال کیا۔ یہ تعبر حسب اتفاق دلی پہنچی، تو میرزا صاحب نے نواب خلد آشیاں کے نام ۲۰ اپریل کو ایک عریضہ لکھا۔ اصل تحریر مثل میں موجود نہیں۔ نقشہ کے نام کے مکتوب سے، جو ۱۴ مئی سنہ ۱۸۶۵ء کو

لکھا گیا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ وہ عریضہ تعزیت وفات اور تہنیت جلوس پر مشتمل تھا۔ فرماتے ہیں: "رامپور سے اپریل کے مہینے کا روپیہ، اور تعزیت و تہنیت کے خط کا جواب آگیا۔ آئندہ جو خدا چاہے" (اردو دی: ۳۵۹ لاہور ایڈیشن، سنہ ۱۹۶۰ء) نواب خلد آشیاں نے یکم مئی کو اس عریضے کے جواب میں تحریر فرمایا: "..... صحیفۂ شریفۂ مورخۂ ۲ ماہ گذشتہ اسمیٔ مخلص وصول الطاف آگین ہا فیما مطلع گردید۔ مشفقا! آنچہ شما ہر آن کرمفرما از عہد نواب صاحب وقبلہ فرہ دس مکاں مقرر است، انشاء اللہ تعالیٰ بدستور جاری ماندہ، حسب ضابطہ بسامی خدمت رسیدہ خواہد ماند۔" اس کے بعد سرکار نے ۱۰ اپریل کی تنخواہ کی ہنڈوی کا ذکر کیا ہے۔ میرزا صاحب کا عریضہ اسی فرمان کی رسید ہے۔

(۲) یہ رباعی حیدا ورق پر لکھ کر میرزا صاحب نے مکتوب ۵۰ کے ساتھ منسلک کردی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال ۹ مئی کو بقرعید ہوئی تھی۔

(۳) قصیدۂ تہنیت شمل میں تو نہیں پایا جاتا، مگر عود ہندی (ص ۱۷۱) اور سبد چین (ص ۱۳) میں شائع ہو چکا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

تجلی کہ زموسی ربود ہوش بطور — بشکل کلب علی خاں دگر نمود ظہور
نجست سرور سلطان شکوہ را نازم — کہ رشک برکلشن دارد اثیر فغفور
ہوای لطف دہی، از جان خور برد سوزش — نگاہ قہر دہی، از ہوی مہ ربابد نور
دم نگارش وصعف کلام خیز نیش — چو نیل مور، و دود برورق حرف سطور
قضای رزم نگیش، شاہراہ قہر و غضب — قباط بزمگہش، کارگاہ سور و سرور
بخوان شرع مبین، ہمنوا و قبلی — بہ بزم عشق مہین، ہم پیالہ منصور
زدودی رابطۂ حسن و ماہتاب جمال — بحسب ضابطۂ جاہ، آفتاب ظہور
بحکم مرتبہ، او حاکم و فلک محکوم — زراہ قاعدہ، شرع آمرست داد مامور
چو آب سیل روانی کہ ایستد بمغاک — بود ہمیشہ بہ فنجان دمی شراب طہور
زہی! وزیر دغی! شہریار دانا دل — توئی و گنج بہ حسن خرد ترا دستور
بنای منظر جاہ ترا، زحل معمار — ثوابت کرہ چرخ ہشتمین مزدور
تفاخر تو ارسطو بدرگاہ شعرا — تناگر تو سکندر بہ بارجای جلال
بہای بزم نشاط تو شیخ چون ریزند — بہ یک گاد بکار آورند دنی کافور
زضعف تمیت خلق تو، عنبر سارا — بجای موم برآید زخانہ زنبور
بدین خرام و بدین قامت و بدین رخسار — زبہر خانہ آئی اگر لبوی قبور
جہان جانی وجان جہان، عجب نبود — کہ از درود تو ہر مردہ رقصد اندر گور
بہ پیشگاہ تو، زانو ہمی زند انصاف — کہ ای برہم وکرم در جہانیان مشہور
در انتظام کشی شیوۂ کرم نگزار — برآر کام دل بدسگال از ساطور
توئی بعقل فزایندۂ عروج علوم — توئی بعلم کشایندۂ عقود صدور
مریز خامۂ من بین کہ میرباید دل — چنانکہ از لب داؤد استماع زبور
سواد صفحۂ من بین و تابش معنی — عیان چو شمع فروزندہ در شب دیجور
امیر زندہ دل، آن والی ولایت نظم — بہ گنج خانۂ گنجہ، نظامیش گنجور
فروسیہ مہرد طلوع مہ دو ہفتہ بود — رسیدن تو بدین اوج لعبد آن مغفور

چو او بتیر زمین رفت آن ولایت رفت — تو باش والیٔ روی زمین قرون و دهور
بہ انجمن نرسیدم ز ناتوانائی، — ولی بعرض ثنا داد دعا یکم معذور
بخاکِ پای تو اگر دستگاہ داشتمی — نبودمی بغم دوری و تو صبور
من آن کسم کہ از افراطِ ورزشِ اخلاص — بغیبت است مرا دعویٔ دوام حضور
توئی رحیم دل و من سقیم، دوری بہ — میاد! رنجہ شوی از نظارۂ رنجور
کفی بدست تہی تر ز کاسۂ ولاک — ولی بسینہ لبی تنگ تر ز دیدۂ مور
کسی ز ما و کرم از شما، بلا تشبیہ — زکردگار بود رحمت و ز بندہ قصور
نظر بخستگی و پیری و تہیدستی — قبول کردنِ تسلیم من خوش است زدور
شعارِ غالبِ آزادہ جز دعا نبود — کہ یاد سی دعاگوی در دعا منکور
بہ دہر تا بود آئین کہ در نوا آرند — ربابِ و بربط و قانون و نی بمجلسِ سور
بہ بزمِ عیش تو ناہید باد زمزمہ سنج! — نسیم عطر فروش اندہ نسیم طرۂ حور!
محب ز لطفِ تو بالندہ، چون نوا از ساز! — عدو ز بیم تو نالندہ، چون خر طنبور!

میں نے اس قصیدے کا مقابلہ ایک خطی ورق سے بھی کیا، جو حکیم راسپوری مرحوم کے پاس تھا۔ اُن کا خیال تو یہ تھا کہ یہ وہی پرچہ کا غذ ہے جس کو خود غالب نے میر عوض علی خوشنویس کو بھیجا تھا، تاکہ سرکار میں پیش کرنے کے لیے اس کی خوشخط نقل کر دیں۔ لیکن اس کا خط میرزا صاحب کا نہیں ہے۔ اس بنا پر میں یہ گمان کرتا ہوں کہ کسی نے رامپور بھیجی ہوئی اصل سے نقل کیا ہے چونکہ اس قسم کے نوادرات حکیم مرحوم کو امیر مینائی کے یہاں سے دستیاب ہوئے تھے، کیا عجب ہے کہ یہ نقل بھی اُنھیں کے لیے تیار کی گئی ہو۔ اس میں جزئی اختلاف بھی پایا جاتا ہے، مثلاً مصرع "امیر زندہ دل آن والیٔ ولایت نظم" کو "ناظم نظم و نظم" کے ساتھ لکھا ہے۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ قصیدۂ مذکور میرزا صاحب ہی کے سبیضہ کی نقل ہے، ورنہ دوسرا شخص شعر میں اتنا تغیر کبھی نہ کرتا۔

نواب خلد آشیاں نے ۱۲ محرم الحرام سنہ ۱۲۸۲ ہجری (۱۱ جون سنہ ۱۸۶۵ ع) کو اس قصیدے کے متعلق تحریر فرمایا: "..... و قطعۂ سامی صحیفۂ لطف آگین، اول مع قصیدۂ تہنیت مشتمل راقم بریاست مورد ثنا، ملک رامپور، و ثانی مع سلام من تصانیف جناب مغفرت مآب نواب صاحب و قبلہ فردوس مکان در اسعد ازمنہ یاسمین ریز دامن وصول فرحت شمول گشتہ حمد ذا قصیدہ کہ لآلی مدحت مضامین رجمہ و معانی دل نشستہ اش را بر شتۂ ترقیم کشیدن آب در بابکیل بودن است، و خامۂ از توصیف فصاحت و بلاغت آن بحیطۂ تحریر در آمدن تواب و سیارہ را بہ پیچ انگشت خمردن در بخولانہ بانی نواب مرزا مخدوم سامی یا بن طرف مصدوع گشتہ، موجب کمال مسرت است، چرا کہ راقم نیز متمنی ملاقات شریف است۔ او تعالیٰ شب جدائی فراق را بتر و دی ہر چہ تمامتر بایام وصال مبدل گرداند۔"

یہ خط میرزا صاحب کو ۱۷ جون کو موصول ہوا۔ ۱۸ جون کو اُنھوں نے اس کا جواب تحریر کیا جو نمبر (۴۹) پر درج ہے۔

(۴) نسخے پر ۱۷ مئی سنہ ۱۸۶۵ درج ہے اور اُس کی پشت پر لکھا ہے "خط در رسید قصیدہ و سلام مرسلہ نوشتہ شود۔ المرقوم ۵ محرم سنہ ۱۲۸۲ ھ مطابق ۳۱ مئی سنہ ۱۸۶۵ ع"

(۲) میرزا صاحب نے نواب خلد آشیاں کے جود و کرم کے اس واقعے کا ذکر متعدد خطوں میں کیا ہے۔ حکیم غلام نجف خاں کو

لکھتے ہیں: "..... نواب صاحب حال بمقتضائے 'الولد سر لابیہ' حسن اخلاق میں نواب فردوس آرامگاہ کے برابر بلکہ بعض شیوۂ درویش میں اُن سے بہتر ہیں۔ بجو مسند نشینی کے غلہ کا محصول یک قلم معاف کیا، علی بخش خاں خانساماں کو ۳۰ ہزار روپیہ بابت مطالبۂ سرکاری بخش دیا...." (اردو دی: ۴۵۲) نقد کے نام کے خط میں قدرے تفصیل کی ہے۔ فرماتے ہیں: "..... نواب صاحب از روی صورت روح مجسم اور باعتبار اخلاق آیت رحمت ہیں۔ خزانۂ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفتر ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے اوس کے بٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپیہ سال غلہ کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہل کار پر ساڑھے ہزار کا محاسبہ معاف کیا اور میں ہزار روپیہ نقد دیا۔ منشی نولکشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی۔ خلاصہ عرضی کا سن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ بتقریب شادی صبیہ تجویز ہو رہا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں کھلی" (ایضاً: ۲۹۸)۔ تخریب قمار خانہ اور بخشش محصول غلہ کا ذکر اخبار الصنادید (۱۷۹/۲) میں بھی کیا گیا ہے۔

(۶) یہ رسید عریضۂ سابق کے ہمراہ بھیجی گئی تھی، اس لیے لفافہ کی عبارت دونوں سے متعلق شمار کی جائے۔

۳۸

(۱) محولۂ بالا فرمان کا اقتباس عریضۂ (۴۶) کے حاشیے میں دیا جا چکا ہے۔

(۲) یہ قصیدہ عریضۂ (۴۶) کے حاشیے میں درج ہو چکا ہے۔

(۳) کلیات فارسی کے رامپوری نسخے میں اس کا اندراج نہیں ہے، حالانکہ جوابی فرمان مورخہ ۱۱ جولائی میں سرکار نے اس کا وعدہ فرمایا تھا۔

(۴) سفر کی تفصیل کے لیے دیباچہ ملاحظہ ہو۔ یہاں اسقدر لکھ دینا کافی ہوگا۔ کہ میرزا صاحب ۷ اکتوبر سنہ ۱۸۶۵ء کو دلی سے عازم رامپور ہوئے، اور ۴ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء کو واپس دلی پہنچے (اردو دی: ۲۴۳)

(۵) نواب امین الدولہ وزیر الملک محمد علی خاں بہادر صولت جنگ ریاست ٹونک کے نواب تھے۔ جنوری سنہ ۱۸۶۵ء میں گدی پر بیٹھے، ۳۱ دسمبر سنہ ۱۸۶۷ء میں لاوا میں ٹھاکروں کا قتل عام کرانے کے الزام میں حکومت ہند نے انھیں معزول کر دیا۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں ریاست پولیٹکل ڈپارٹمنٹ کے زیر انتظام آ گئی اور حافظ ابراہیم علی خاں بہادر نواب بنا دیے گئے۔ نواب امین الدولہ بنارس چلے گئے، اور ۲۸ سال تک مقیم رہنے کے بعد ۱۶ صفر سنہ ۱۳۱۳ھ (۲۹ اگست سنہ ۱۸۹۵ء) کو بنارس میں انتقال کیا (آثار ماولہ: ۲۳۹/۲ ۲۴۰)

(۶) احمد شاہ درانی ضلع ہرات کا باشندہ اور سدوزئی نامی قبیلہ کا ایک فرد تھا۔ ابھی یہ بچہ ہی تھا کہ نادر شاہ اس کو ایران پکڑ لے گیا، اور اپنی خدمت گزار برداری پر مقرر کیا۔ اس نے رفتہ رفتہ فوج کے بڑے عہدے تک ترقی کر لی، ۱۲ مئی سنہ ۱۷۴۷ء کو نادر شاہ کی وفات پر بغاوت کر دی، اور تھوڑے عرصے میں، افغانستان، سندھ اور لاہور کا بادشاہ بن بیٹھا۔ اس نے ہندوستان پر متعدد حملے کیے ہیں، لیکن اس کی شاندار ترین جنگ سنہ ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کے عظیم الشان لشکر سے واقع ہوئی، جس میں یہ کامیاب ہوا، اور بعد فتح شاہ عالم کو تخت و تاج ہندوستان کرا افغانستان چلا گیا۔ احمد شاہ نے ۲۶ سال حکومت کر کے سنہ ۱۱۸۶ھ (سنہ ۱۷۷۲ء) میں ۵۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔

(۷) احمد شاہ کے عطا کردہ خطابات کے سلسلے میں اخبار الصنادید (۱/ ۶۶۷) ملاحظہ ہو۔

(۸) میرزا صاحب کے اس خیر خواہانہ عریضے کے جواب میں نواب صاحب نے تحریر فرمایا: "..... استصواب الفاظ خطاب دستور این ریاست نبودہ است، وحسب قدیمہ وسلام مذکور در دیوانہا مندرج

کنانیدہ خواہد شد..... ۲ صفر سنہ ۱۲۸۲ ہجری مطابق ۱۵ جولائی سنہ ۱۸۶۵ء"۔
میرزا صاحب نے اس کے جواب میں حسب ذیل قطعہ لکھ کر ارسال کیا تھا جو مہر نیم روز (ص ۴۸) میں شائع ہو چکا ہے۔

ہزار و دو صد و ہشتاد و دو شمار کنید — بحسب ضابطہ، از ہجرتِ رسول اللہ
چہار شنبۂ آخر بود زماہِ صفر — کہ می دہد آورم این قطعہ را بنظم پگاہ
سفیدۂ سحری کاغذ است و من راقم — سواد صفحہ نمط، روی بدسگال سیاہ
ہی نویسم و وقتِ نوشتنم باشد — دلی ز بیم لبالب، چو لب ز عذرِ گناہ
خدا کند کہ مشرف شود چو این قرطاس — بہ پیش مسندِ عالی، ز بندۂ درگاہ
امیر کلب علی خان بہادر، از رہ لطف — لبوئی غالبِ خونین جگر کنند نگاہ
کہ این فلک زدہ گر عرض کرد تسلی — ز بیم بندہ نہ اخلاص بود و در ناگاہ
خلافِ طبعِ مبارک فتادہ آن تقریر — لبی خطا رود از بندگان دولت خواہ
تو پادشاہ، و شہنشاہ تا جدارِ فرنگ — خطاب می طلبد بادشہ ز شاہنشاہ
چو رای من نپذیری، ز جرمِ من بگزیر — بحقِ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ"

ص ۴۰

(۱) اس عریضے کے جواب میں نواب خلد آشیاں نے ۲۲ ربیع الاول سنہ ۱۲۸۲ھ (۱۶ اگست سنہ ۱۸۶۵ء) کو تحریر فرمایا: "... صحیفۂ لطف آگین بخلاصۂ کمی و بیشی باران رحمت، و دران نوادر داستان درک خیریت مزاج راقم مع قطعۂ دعائیہ غازہ آرای چہرۂ وصول فتح طراز گردیدہ بما فیہا مطلع خود۔ و ترسیل قطعۂ مذکور از مزید الطاف فرمائیہا متصور شد۔ مشفقا! سابق ازین فی الحقیقۃ طبیعت راقم بعارضۂ انحپر چیزی کسلمند شدہ بود، لیکن حالا بعنایت الٰہی مزاج مخلص خوش و خورم است۔ ہنڈوی مبلغ دو صد روپیہ برای آن مشفق، کہ بتقریب صحت از عارضۂ لاحقہ بدیگر صاحبان متحقین نیز ازین سرکار عنایت شدہ بود، معطوف رتبۂ الوداد بذا بطریق عنایات سمت تبلیغ یافتہ..." میرزا صاحب کا یہ قطعۂ دعائیہ "غالبنامہ" کے دوسرے ایڈیشن میں محمد اکرام صاحب نے چھاپ دیا ہے۔

ص ۴۱

(۱) اس سے "نسخۂ غالب" مراد ہے۔ میرزا صاحب نے "برہان قاطع" کے بعض اغلاط پر ایک رسالہ مسمی بہ "قاطع برہان" ۱۸۵۹ء میں تصنیف کیا تھا، جو نواب فردوس مکاں کی امداد سے طبع ہو کر شائع بھی ہو گیا تھا۔ اس میں میرزا صاحب نے رد و قدح کا جو ڈھنگ اختیار کیا تھا، وہ غیر عالمانہ، بلکہ کہیں کہیں کسی قدر سوقیانہ ہو گیا تھا۔ کچھ تو ہندوستانی تقلید کے دلدادہ ہیں، اور کچھ اس کا انداز تحریر دل آزار تھا، کتاب کے شائع ہوتے ہی مخالفت کا ایک طوفان برپا ہو گیا۔ برہان کے حامیوں نے اس کی تردید میں متعدد کتابیں لکھیں۔ ان میں سے ایک کا نام "ساطع برہان" تھا۔ اس کے مصنف کے متعلق مرزا صاحب سیاح کو لکھتے ہیں: "وہ جو ایک اور کتاب کا تم نے ذکر لکھا ہے، وہ ایک لڑکے پڑھانے والے ملای مکتب دار کا خبط ہے... رحیم بیگ اس کا نام، میرٹھ کا رہنے والا، کئی برس سے اندھا ہو گیا ہے باوجود نابینائی کے احمق بھی ہے" (اردو ی: ۲۷ و ۲۱) شاکر کو لکھا ہے: "رحیم بیگ نامی میرٹھ کا رہنے والا ہے۔ دس برس سے اندھا ہو گیا ہے، کتاب پڑھا نہیں سکتا، سن لیتا ہے۔ عبارت لکھ نہیں سکتا لکھوا دیتا ہے۔ بلکہ اس کے ہموطن اتنا کہتے ہیں کہ وہ قوت علمی بھی نہیں رکھتا۔ اوروں سے مدد لیتا ہے

اہلِ دہلی کہتے ہیں کہ مولوی امام بخش صہبائی سے اودس کو تلمذ نہیں ہے۔ اپنا اعتبار بڑھانے کو اپنے کو اودن کا شاگرد بتاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ واہی! اودس ہیچ پوچ پر جس کو صہبائی کا تلمذ موجب عزت و وقار ہو۔" (عود: ۱۶۱): اس کتاب کے جواب میں مرزا صاحب نے "نامۂ غالب" لکھا، اور اُس کو ۱۳ اگست سنہ ۱۸۶۵ء سے قبل طبع کرا کے نواب خلد آشیاں کی خدمت میں بطریق ارمغان پیش کیا۔ یہ رسالہ عود ہندی (ص ۱۴۱–۱۵۵) میں بھی چھپ چکا ہے۔ لیکن کتابخانے میں اس مطبوعہ نسخے کی کوئی جلد موجود نہیں ہے۔

(۲) شاہ عباس ثانی، صفوی خاندان کا آٹھواں بادشاہ تھا۔ اس نے سنہ ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) سے سنہ ۱۰۷۷ھ (۱۶۶۶ء) تک ایران پر حکومت کی۔ لیکن میرزا صاحب کا یہ بیان کہ اس بادشاہ کے عہد میں ایرانیوں نے داستان امیر حمزہ بنائی درست نہیں معلوم ہوتا۔ اکبر اعظم اس سے بہت پہلے ہندوستان میں اس کو لکھوا اور مصور کرا چکا تھا۔ چنانچہ اُس نسخے کے اجزا یورپ میں آج تک محفوظ ہیں۔

ص ۴۲

(۱) اس قصیدے کے چند اشعار تذکرۂ انتخاب یادگار میں بذیل ذکر غالب اور پورا قصیدہ سبد چین (ص ۱۸) میں شائع ہو چکا ہے۔

ص ۴۵

(۲) حکیم مہر علی خاں کے متعلق صرف اس قدر پتا چلتا ہے کہ یہ دہلی کے مشہور طبیب تھے۔ ان کے بیٹے کا ذکر کسی تذکرے میں بذیل شعرا دیکھا تھا، اور اُس وقت اُس سے یہ اندازہ کیا تھا کہ مہر علی خاں آخر ۱۲ویں صدی کے اہلِ علم میں تھے۔

ص ۴۶

(۲) اس عریضے کے جواب میں ۹ ربیع الثانی سنہ ۸۲ھ (۲۹ اگست سنہ ۱۸۶۵ء) کو نواب خلد آشیاں نے تحریر فرمایا: "سہ قطعۂ مقاومتہ لطف آگین، اول بیع قصیدۂ نادرہ کہ مضامین عالیش ملو ہزاران دلد غرر معانی بود، و ثانی مشعر رسید ہنڈوی مبلغ دو صد روپیہ، و ثالث محتوی بر نسخہ ہای معجون و غیرہ براہ محبت معنوی متوارثیاسمین ریز گردیدہ و صول نشاط شمول گشتہ۔۔۔۔ حالا مزاج لقم بوجوہ خوش و خرم است۔"

ص ۴۷

(۱) سکندر زمانی بیگم، نواب خلد آشیاں کی اہلیہ کی وفات پر یہ خط اور قطعۂ تاریخ لکھا گیا ہے۔ ان بیگم کے والد صاحبزادہ سید امداد اللہ خاں ولد صاحبزادہ سید کفایت اللہ خاں و لد نواب نصر اللہ خاں بہادر، اور والدہ آفتاب بیگم بنت صاحبزادہ سید کریم اللہ خاں خلف نواب سید فیض اللہ خاں بہادر تھیں۔ سنہ ۱۲۶۲ ہجری میں ان کے ساتھ نواب خلد آشیاں کی شادی ہوئی۔ نواب سید مشتاق علی خاں بہادر عرش آشیاں، انھیں کے بطن سے تھے۔ (انتخاب یادگار: ۲۲۵، و اخبار الصنادید: ۲، ۲۳۰)۔

(۲) یہ قطعۂ تاریخ دوسرے ورق پر لکھ کر اس عریضے کے ساتھ ملفوف کیا گیا تھا۔ اب سبد چین میں بھی چھپ چکا ہے۔

ص ۴۸

(۱) یہ عریضہ میرزا صاحب نے رامپور سے لکھا ہے۔ اس زمانے میں نواب خلد آشیاں دورے پر تشریف لے گئے تھے۔ میرزا صاحب رضواں کو لکھتے ہیں: "آج شنبہ ۴ نومبر کی ہے۔ پرسوں نواب صاحب دورہ کو گئے ہیں فرما گئے ہیں کہ دو ہفتہ میں آؤں گا۔ اگر چار روز یہاں رہیں گے۔ پھر نمائشگاہ بریلی کی سیر کو جائیں گے" (اردوی: ۳۲۰)۔ حکیم غلام نجف خاں کے نام کے مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ نومبر کی صبح تک

واپس تشریف نہیں لائے تھے۔ فرماتے ہیں: "نواب صاحب دورے سے یا آج شام کو یا کل آجائیں گے جشن جمخانہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں" (ایضاً: ۲۳۱)۔

مولانا حالی مرحوم نے یادگار غالب (ص ۴۲، نامی پریس) میں لکھا ہے: "چند روز بعد نواب کلب علی خاں مرحوم کا نواب لفٹنٹ گورنر سے ملنے کو بریلی جانا ہوا۔ ان کی روانگی کے وقت مرزا بھی موجود تھے۔ چلتے وقت نواب صاحب نے معمولی طور پر مرزا صاحب سے کہا "خدا کے سپرد"۔ مرزا نے کہا "حضرت خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے۔ آپ پھر اسے مجھ کو خدا کے سپرد کرتے ہیں"۔ صاحب اخبار الصنادید (۲، ۱۳۷) نے بھی اس لطیفے کو نقل کیا ہے۔ نواب خلد آشیاں نے ۱۰ نومبر کو اس کا جواب دیا تھا۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے دو عریضے خیریت مزاج معلوم کرنے کے لیے لکھے۔ آخری عریضے کے جواب میں سرکار نے تحریر فرمایا کہ "عنقریب التفاق راجعہ برا سوری شود"۔

(۲) صاحبزادہ ممتاز علی خاں بہادر کے متعلق صاحب انتخاب یادگار (ص ۲۹۰) لکھتے ہیں: "میر" صاحبزادہ محمد ممتاز علی خاں ولد صاحبزادہ محمد اعجاز علی خاں ولد صاحبزادہ نیاز علی خاں ولد صاحبزادہ حسن علی خاں ولد جناب مستطاب نواب محمد فیض اللہ خاں صاحب بہادر عرش منزل طاب ثراہم۔ شائقیں پریس کا سن ہے۔ میر احمد علی رسا کے شاگرد ہیں۔ یہ صاحبزادے نہایت اہلیت شعار ہیں، خوش خلق و خوش اطوار ہیں۔ یہ اون کا کلام ہے:

شوق ہر چند یہ کہتا تھا کہ بوسے لیجے پر ترا نقش قدم مجھ سے مٹایا نہ گیا"

صاحبزادہ صاحب کو نواب سعید الدین احمد خاں فارونقی کی صاحبزادی منسوب تھیں۔ اس تقریب سے مراد آباد میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، اور وہیں انتقال کیا۔

(۳) نواب سعید الدین احمد خاں، نواب محمد الدین احمد خاں کے بیٹے اور نواب مجید الدین احمد خاں عرف نواب مجو خاں مراد آبادی کے چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے آباء و اجداد میں سے ایک بزرگ قاضی عصمت اللہ فاروقی تھے۔ یہ نواب عصمت اللہ خاں بہادر کے لقب سے مفتخر اور عہد عالمگیری میں مختلف صوبوں کے گورنر رہ چکے تھے۔ خود نواب مجو خاں بھی بہت بڑی جاگیر کے وارث تھے۔ غدر سنہ ۵۷ء میں بجرم بغاوت انھیں پھانسی دیدی گئی، اور اُس وقت سے اس خاندان پر زوال آگیا۔ مراد آباد میں اس خاندان کے اخلاف اب بھی موجود ہیں۔ نواب سعید الدین احمد خاں کی ایک تصنیف "نسب نامہ رئیل" کتاب خانۂ ریاست میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ بڑے اہتمام سے لکھا گیا ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ خود مصنف نے تیار کرایا ہوگا۔ دیباچے میں مصنف نے اپنے خاندان کی ابتدائی تاریخ اور بعد ازاں سنہ ۵۷ء میں اُس کی بربادی پر ایک مختصر نوٹ لکھا ہے۔ نواب سعید الدین احمد خاں نے ۲۱ ربیع الاول سنہ ۱۲۷۳ھ (۲۷ نومبر سنہ ۱۸۵۶ء) اور ۶ جمادی الاولی سنہ مذکورہ (۱۳ فروری سنہ مذکور) کے درمیان انتقال کیا۔

(۴) محمد حسن خاں صاحب صدر الصدور مراد آباد کے متعلق اُن کے صاحبزادہ مولوی محمد نجم الحسن خاں کے مکتوب مورخہ ۲۶ اپریل سنہ ۱۸۷۸ء سے معلوم ہوتا ہے کہ صدر الصدور بانس بریلی کے باشندے تھے، اور تاریخ تحریر مکتوب ہذا سے ۵ سال قبل (تقریباً سنہ ۱۸۷۳ء میں) انتقال کر گئے تھے۔ ان کے برادر خورد مولوی حامد حسن خاں صاحب بھی صدر الصدور رہ چکے ہیں۔ یہ فروری سنہ ۱۸۷۸ء میں فوت ہوئے۔

(۵) نواب مصطفےٰ خاں بہادر فرزند عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں بہادر، جہانگیر آباد کے جاگیردار اور بڑے صاحب علم و خوش گفتار شاعر تھے۔ اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے تھے (اردوی: ۱۰۱) ابتداءً حکیم مومن خاں سے مشورۂ سخن رہا۔ ان کے انتقال کے بعد میرزا صاحب سے اصلاح لینے لگے تھے

انھوں نے اردو شعرا کا ایک قابل اعتنا تذکرہ "گلشن بیخار" فارسی زبان میں تصنیف کر کے خود شائع کیا تھا۔ آشوب غدر میں شیفتہ بھی مشتبہ قرار دیے گئے تھے، لیکن آخر کار بری ہو گئے۔ میرزا صاحب سے ان کے بہت مخلصانہ روابط تھے۔ جب میرزا صاحب قمار بازی کے الزام میں قید کیے گئے، تو انھوں نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔ "حبیہ" میں میرزا صاحب نے اس خلوص کا اس طرح اعتراف کیا ہے:

خود چرا خون خورم از غم او کہ بہ غمخواری من — رحمت حق بہ لباس بشیر آمد، گوئی
خواجۂ ہست درین شہر کہ از پرسش وی — پایۂ خویشتنم در نظر آمد، گوئی
مصطفیٰ خاں کہ درین واقعہ غمخوار منست — گر نمیرم، چہ غم از مرگ؟ عزادار منست

شیفتہ نے ۶۳ سال کی عمر پا کر سنہ ۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں وفات پائی۔

(۶) میرزا صاحب کو یہ مصیبت رامپور سے واپسی کے وقت برداشت کرنا پڑی تھی۔ دیباچے میں اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

صفحہ ۴۹

(۱) میرزا صاحب نے یہ قطعہ سفر کلکتہ کے سلسلے میں لکھا تھا۔ رای چھج مل کھتری کو سفر مذکور کے واقعات پر مشتمل ایک خط لکھا ہے، جو پنج آہنگ (ص ۱۰۰) میں درج ہے۔ اس خط میں یہ قطعہ موجود ہے، لیکن وہاں بجای "غلبۂ غم" (سطوت غم) اور بجای مصرع ثالث (گویند زندہ تا: بنارس رسیدہ است) تحریر ہے۔

(۲) لفافے پر ۱۰ جنوری سنہ ۱۸۶۶ تحریر ہے۔

(۳) نواب خلد آشیاں کو میرزا صاحب کے مصائب سفر کی روداد نواب مصطفیٰ خاں بہادر کی زبانی معلوم ہوئی، تو انھوں نے مراد آباد سے پتے پر میرزا صاحب کو تحریر فرمایا: "نواب صاحب، مشفق مہربان، کرمفرمای مخلصان سلمہ اللہ تعالیٰ بعد اشتیاق مواصلت موفور السرت کہ ممتاد التحریر ہے، منشو و ضمیر مودت خمیر کے ہونے پائی نواب محمد مصطفیٰ خاں بہادر کے دریافت ہوا کہ مراد آباد میں کچھ طبیعت آپ کی علیل ہو گئی ہے۔ باستماع اس امر کے باعث کمال تردد کا ہوا۔ اس واسطے حوالۂ خامۂ محبت نگار کئے ہوتا ہے کہ حال خیریت مآل سے مطلع کیجیے۔ اور اگر ہنوز طبیعت مائل باعتدال نہو، اور آپ کا ارادہ قیام مراد آباد کا تادیر ستی طبیعت ہو، تو آپ رامپور میں تشریف لائیے۔ یہاں معالجہ بخوبی عمل میں آئے گا۔ فقط۔ زیادہ جمعیت اور نشاط ہو۔ المرقوم، شعبان سنہ ۱۲۸۲ھ مطابق ۵ جنوری سنہ ۱۸۶۶ء محمد کلب علی خاں"۔

ذیل میں اصل فرمان موجود اور اس کے لفافے پر تحریر ہے کہ "خط ہذا ہرکارۂ بندہ از مراد آباد بجہت تشریف فرما شدن مرزا نوشہ صاحب بہ دہلی وا پس آورد۔ مرقوم ۲۱۔ شعبان سنہ ۱۲۸۲ھ"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کو فرمان موصول نہوا۔ مگر اس عرصے میں اُن کا عریضہ (۶۰) رامپور پہنچ گیا، اس کے جواب میں سرکار نے ۱۵ جنوری کو تحریر فرمایا: "چونکہ وقت اطلاع انحراف طبیعت آپ کے مرکز اعتدال سے بمقام مراد آباد، قبیۂ الوداد اس مضمون سے کہ اگر ارادہ قیام مراد آباد کا واسطے معالجہ کے ہو، تو رامپور کو معاودت کیجیے۔ یہاں معالجہ بخوبی عمل میں آئے گا، ہمدست ہرکارہ کے بھیجا گیا تھا۔ لیکن آپ وہاں سے روانا دہلی کے ہو گئے تھے۔ ہرکارہ خط والیس لایا۔ اوس روز سے کمال انتظار وصول مفاد منای خیریت کا تھا۔ الحمد للہ کہ وصول نیئۂ لطف آگیں باعث اطمینان ہوا"۔ میرزا صاحب کا عریضہ (۶۱) اسی فرمان کا جواب ہے۔

صفحہ ۵۰

(۱) غلام نوخیز سے حسین علی خاں مراد ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے ۲۱ جنوری کے عریضے کے

بعد کوئی اور خط بھی لکھا تھا، جس میں حسین علی خاں کی تنخواہ کی استدعا کی گئی تھی۔ بمثل میں یہ خط اور اس کا جوابی زمان دونوں موجود نہیں ہیں، اس لیے سوال و جواب کی نوعیت کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال موجودہ مراسلت میں یہ پہلا عریضہ ہے، جس میں حسین علی خاں کی تنخواہ اور اپنی صحت کی حالت کا ذکر کیا ہے۔

صـ۵۱

(۱) میرزا صاحب نے ۱۲ مئی سنہ ۶۶ء کو ذکا کے نام ایک خط میں اس سے ملتے جلتے الفاظ میں اپنی حالت بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں: "میں آگے ناتوان تھا، اب نیمجان ہوں۔ آگے بھرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رامپور کے سفر کا رہ گیا اور وہ بھی رعشہ و ضعف بصر۔ جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں، حرف سوجھنے سے رہ گئے۔" (اردوی: ۳۸)

(۲) یہ غزل کلیات نظم فارسی کی طباعت کے بعد لکھی گئی تھی، اس لیے "سبد چین" میں شائع ہوئی ہے۔

صـ۵۲

(۱) یہ غزل عریضے کے دوسرے ورق کی پشت پر تحریر ہے۔

(۲) اس عریضے کے لفافے پر ۱۵ مئی سنہ ۱۸۶۶ تحریر ہے۔ غالباً یہ دوسرے دن پوسٹ کیا گیا تھا۔

صـ۵۳

(۱) یہ غزل عریضے کے دوسرے ورق کی پشت پر تحریر ہے۔ اس کے جواب میں ۲۳ جون سنہ ۱۸۶۶ء مطابق ۹ صفر سنہ ۱۲۸۳ھ کو سرکار خلد آشیاں نے تحریر فرمایا: "سفارشنامہ عدیم المعاودہ مع غزل من تصانیف آپ کے وصول شادمانی کا لایا۔۔۔ سبحان اللہ مضمون اور طرز ہر ایک شعر غزل مذکور کا نیا اور عدیم المثال ہے۔"

صـ۵۵

(۱) منشی سیلچند کے لیے اُن کے نام کے خطوط سے قبل کا نوٹ ملاحظہ ہو۔

صـ۵۶

(۱) نواب خلد آشیاں نے ۱۲ ربیع الثانی سنہ ۸۳ھ (۲۵ اگست سنہ ۶۶ء) کو جواباً تحریر فرمایا: "اس صورت میں رسید غیر ضروری ہے۔ اور حسب الالتماس بھیجے جانے ہنڈوی مشاہرہ آپ کے اس طور پر کہ تاریخ پہلی یا دوسری تک آپ کے پاس پہنچ جایا کرے، حکم بنام اہالی سررشتہ کے صادر ہو گیا ہے۔"

صـ۵۷

(۱) بدرالدین محمد چاچی، چاچ (تاشقند) کے رہنے والے تھے۔ سلطان محمد بن تغلق (سنہ ۷۲۵ تا ۷۵۲ھ) کے عہد میں ہندوستان آئے، اور اُس کی مدح سرائی میں اپنی عمر کا بڑا حصہ گزارا۔ سلطان محمد بڑا علم دوست بادشاہ تھا۔ اُس نے ان کی کافی قدر و منزلت کی، اور "فخر الزمان" خطاب دیا۔ بدر نے سنہ ۷۵۴ھ (۱۳۵۳ء) میں انتقال کیا۔ ان کے قصائد شہرت عام کے مالک ہیں اور برسوں درسیات فارسی میں شامل رہے ہیں لیکن تلمیحات و کنایات کی افراط کے سبب سے ان میں رغبت کم ہے۔

(۲) میرزا طاہر وحید بن میرزا حسین خاں قزوینی مشہور شاعر اور نثار ہے۔ یہ قزوین میں پیدا ہوا۔ سنہ ۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) میں شاہ عباس صفوی نے اپنا مجلس نویس مقرر کیا۔ سنہ ۱۱۰۱ھ (۱۶۸۹ء) میں وزیر بنایا گیا، اور ۱۸ سال تک اسی عہدے پر رہا۔ یہ فن انشاء میں خاص طرز کا مالک ہے۔ لیکن اشعار کی شہرت صرف عہدۂ وزارت کی بدولت ہوئی۔ طاہر کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے۔ بعض سنہ ۱۱۰۵ھ اور بعض سنہ ۱۱۰۸ھ لکھتے ہیں۔ ریو نے لکھا ہے کہ تقریباً سنہ ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) میں انتقال کیا۔

(۳) میرزا جلالای طباطبائی اصفہان میں پیدا ہوا۔ سنہ ۱۰۴۴ھ (۱۶۳۴ء) میں ہندوستان آیا، اور شاہ

جہاں کے دربار کا مورخ مقرر ہوا۔ ابھی ۵ سال کی تاریخ لکھنے پایا تھا کہ حساد نے سازش کی اور کام بیچ میں رہ گیا۔ یہ بھی انشا میں ایک خاص طرز کا مالک ہے۔ میرزا صاحب نے سہواً "طبائی" لکھا ہے۔

(۴) اعجاز خسروی، امیر خسرو دہلوی، متوفی سنہ ۷۲۵ھ (۱۳۲۵ء) کی تصنیف ہے۔ یہ نثر مرصع کی ممتاز کتابوں میں شمار ہوتی ہے، اور نولکشور پریس، لکھنؤ میں طبع ہو چکی ہے۔

(۵) اکبر شاہ، شاہ عالم بادشاہ دہلی کے بیٹے اور دہلی کے آخری بادشاہ ظفر کے باپ تھے۔ ۳۰ اپریل سنہ ۱۷۶۰ء (۷ رمضان سنہ ۱۱۷۳ھ) کو پیدا ہوئے، اور ۱۹ نومبر سنہ ۱۸۰۶ء (۷ رمضان سنہ ۱۲۲۱ھ) کو ۴۸ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھے۔ انھوں نے ۳۱ سال سلطنت کی اور ۲۸ ستمبر سنہ ۱۸۳۷ء (۲۸ جمادی الآخرہ سنہ ۱۲۵۳ھ) کو جمعے کے دن فوت ہوئے۔ اکبر شاہ اپنے والد کی طرح شاعر بھی تھے۔ اور ان کے تخلص "آفتاب" کی مناسبت سے "شعاع" تخلص کرتے تھے۔ شاہ عالم آفتاب کا مجموعۂ کلام فارسی و اردو و ہندی موسوم بہ نادرات شاہی، کتابخانۂ رامپور کی طرف سے طبع ہو رہا ہے۔

(۶) میرزا صاحب کا یہ عریضہ نواب خلد آشیاں کے فرمان مورخہ ۱۵ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۳ھ (۲۷ اگست سنہ ۱۸۶۶ء) کا جواب ہے۔ القاب و آداب کے بعد نواب صاحب نے تحریر فرمایا ہے: "..... دین و ایمان تقریظ شرح قصائد بدیہ چاچی از نوک قلم جلوہ خیز گردید۔ اولاً بر دیباچۂ صور عبدالرحمٰن وجیہ و باقی بر طرز جلالای طبا طبائی نگاشتہ ام۔ چون زیور اصلاح در گنج خانۂ عالی طبیعت آن استاد زمان مخزونست، تعیین نظر آن بخش باطل را مرسل ساختہ مرقوم کرد آنچہ فطرت کمالت سرشارش پسندد، خامۂ اعجاز نگارش بر پرچۂ ثانیہ علاوہ ازین مجموعۂ پریشانی بہ تلافیش تکلیف تحریر عنقریب باسرع ازمنہ وبیدہ سفیدان این دیار را از سرۂ جواہر آگین جواب با صواب مسرور و شادمان سازند!" شرح قصائد بدر چاچی، جس کا فرمان میں ذکر ہے، مولوی محمد عثمان خاں بہادر مدار المہام کی تصنیف ہے۔ خان موصوف نواب خلد آشیاں کی خدمت میں عہد ولیعہدی سے آمد و رفت رکھتے تھے۔ زبان فارسی اور حساب وغیرہ سے بخوبی واقف اور قدرے عربی آشنا تھے۔ جب نواب صاحب تخت نشین ہوئے، ان کا تقرب اور رسوخ یہاں تک بڑھا کہ ریاست کے مدار المہام بنا دیے گئے۔ مزاج میں قدرے درشتی اور تیزی تھی، اس وجہ سے ۱۱ ربیع الاول سنہ ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) کو نادر شاہ خاں نامی ایک پٹھان کے ہاتھ سے چاقو کا زخم کھا کر ۱۲ ماہ مذکور کو انتقال کر گئے (اخبار الصنادید: ۲، ۱۵۲، ۱۵۶)۔

(۷) اس نثر سے مذکورۂ بالا تقریظ شرح قصائد بدر چاچی مراد ہے۔ مثنل میں یہ نثر موجود نہیں ہے اس لیے میرزا صاحب کے مواقع اصلاح معلوم نہیں ہو سکے۔

(۸) نواب صاحب نے ۱۳ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۳ھ (۲۵ اگست سنہ ۱۸۶۶ء) کے فرمان میں، جس کا کچھ حصہ ۱۳ اگست کے حواشی میں نقل کیا جا چکا ہے، میرزا صاحب کو تحریر فرمایا تھا: "... مطلب دیگر، جو کہ راقم کو ترتیب بیاض اشعار منتخبۂ اساتذۂ پارسی و اردو کی منظور ہے، اسواسطے حوالۂ خامۂ عنبر نگار کے ہوتا ہے کہ آپ انتخاب دیوان فارسی و اردو اپنے کا ذریعہ انتخاب کلام ضیاء الدین خان صاحب لطف کریں۔ تا شامل انتخاب کے، جو اس سرکار میں عمل میں آیا ہے، ہو جائے۔" میرزا صاحب نے حسب الحکم اردو دیوان کا انتخاب ۱۸ ستمبر کو اور فارسی کلیات کا انتخاب ۲۴ ستمبر کو ارسال کیا۔ یہ دونوں انتخابات جو حسب تصریح فرمان مورخہ ۱۹ جمادی الاولیٰ سنہ ۱۲۸۳ھ، (۳۰ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء) اس تاریخ سے قبل موصول ہو چکے تھے، کتب خانۂ سرکاری میں محفوظ تھے، حال ہی میں ضروری حواشی و مقدمات کے ساتھ انتخاب غالب کے نام سے ان کو یکجا شائع کر دیا گیا ہے۔

ص۵۸

(۱) نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر، نواب احمد بخش خاں والی فیروزپور جھرکہ و جاگیردار لوہارو کے خلف اصغر تھے۔ ان کی بھاوج بہن غالب سے منسوب تھیں۔ اس نسبتی رشتے کے علاوہ اہم رابطہ یہ تھا کہ نواب صاحب فن شعر میں غالب کے شاگرد تھے۔ یہ فارسی میں نیر اور اردو میں رخشاں تخلص کرتے تھے (اردو دی: ۱۰۰) انکی سلامتی ذوق و حسن طبیعت کے میرزا صاحب بھی معترف تھے، اور انھیں اپنا نمونہ کہتے تھے۔ کلیات فارسی میں ان کی مدح میں ایک قصیدہ ہے۔ اس میں میرزا صاحب فرماتے ہیں:

بلکہ شیوۂ شاگردِ من بمن مانماست صنم بصورت خود می تراشد آذر من
اگرچہ اوست ارسطوی دمن فلاطونم بود بپایہ ارسطوی من سکندر من

ضیاء الدین خاں کے پاس کتابوں کا بڑا نایاب ذخیرہ تھا۔ الیٹ صاحب نے تاریخ ہند کی ترتیب میں اس سے استفادہ کیا ہے۔ اس کتب خانے کے متعلق مرزا صاحب لکھتے ہیں: "میرا ایک نسبتی بھائی ہے نواب ضیاء الدین خاں، سلمہ اللہ تعالیٰ۔ وہ میری نظم و نثر کو فراہم کرتا رہتا تھا۔ چنانچہ مجموعہ نثر میں، اور کلیات نظم فارسی اور کلیات نظم اردو سب نسخے اوس کے کتب خانہ میں تھے۔ وہ کتابخانہ کہ، ڈیڑھ کروڑ عون کرتا ہوں، ۲۰ ہزار روپیہ کی مالیت کا ہوگا۔ لٹ گیا۔ ایک ورق نہیں رہا، (عود: ۲۹)۔ نواب ضیاء الدین خاں بہادر نے سنہ ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۳ء) میں وفات پائی۔ مجروح نے مصرع "اب نہ باقی رہی وہ رونق شہر دہلی" سے ہجری سال نکالا ہے (تاریخ لطیف: ۱۴۱)۔

ص۵۹

(۱) یہ عریضہ نواب صاحب کی اس تحریر کا جواب تھا: "... نامۂ محبت آئین مع تقریظ بدیہ چاچی و مقیاس اصلاح آگین سرمہ کش چشم و صول گشتہ روشنی بخش عیون دیدہ سفیدان انتظار گردید۔ چنانچہ نظیر ہمالفاظ کہ شاید عجالتاً باسعان نظر ملاحظہ نکردہ مرسل داشتہ ام۔ چشم کہ اگر اقوال این ہمہ اساتذہ قابل اعتبار باشد فیہا، والا بعد مشاہدہ از چگونگی آن مطلع سازند۔ المرقوم ۲ جمادی الاولی سنہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۳ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ء۔

آشیان چیدن: عرفی میگوید:

آشیان زغن و زاغ نچیدم تیر سر سر قدم ساختہ بر خار مغیلان رفتم

عذرا، زن دوشیزہ، و عذاری بفتح العین و کسر ہا و ذال روات جمع لاز منتہی الارب۔

از: "فرہنگ جہانگیری" ارژنگ، چار معنی دارد، اول بمعنی ارتنگ است کہ مرقوم شد، دوم نام مصوری بود مانند مانی مذکور، سوم نام دیوی، چہارم نام پہلوانی از توران۔ ارژنگ نگار نامۂ مانی نقاش، و نگاہ ارتنگ بہ مانی اطلاق کنند۔" آغاز دیباچہ: "کہ کاخ دماغ صدر نشینان محفل سخندانی را بہ نقوش خیالات رنگارنگ رشک ارژنگ مانی ساخت" پس مانی ارژنگ بمعنی مانی نگار خانہ بودہ است۔ و در کلام اہل ولایت نیز بملاحظہ رسیدہ۔"

(۲) کتاب خانے کے پرانے کاغذات میں ایک ورق دستیاب ہوا ہے جس میں نیر کے فارسی اردو اشعار درج ہیں۔ یہ خط کے باریک نیلگوں کاغذ پر لکھے ہوئے ہیں۔ اس سے میرا خیال ہے کہ یہ انھیں اوراق کا پس ماندہ ورق ہے۔ ان اشعار کے علاوہ نیر کا ایک فارسی قصیدہ بھی کتابخانے میں محفوظ ہے۔ یہ لارڈ بن کی تعریف میں لکھا گیا ہے اور نیر کے بہترین کلام میں شمار کیے جانے کے لائق ہے۔ مناسبت مقام کے لحاظ سے اشعار مذکورہ کے بعد اس کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

وہ شعر حسب ذیل ہیں

جناب نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر نیر رخشاں

پیشِ درِ میکدہ سر بخمیدن دہیم — نشۂ اقبال را اوج رسیدن دہیم
ریزشِ خون از دو چشم ژرف تنک مائیت — یا ہمہ تن خون شویم، داد چکیدن دہیم
ناوکِ خون خوارہ اش پر نکشیم از جگر — بلکہ لبِ زخم را ذوقِ تپیدن دہیم
ہست ز ذوقِ نیش پاس نزاکت فزون — ورنہ خنجر جہان تن بتپیدن دہیم
حیف! کہ از جامہ جسم تن بزبونی دہد — سینۂ خود را چو جیب عرض دریدن دہیم
گو، بسر ما بیارہ فتنہ ز ہر روزنش — تا بفلک نالہ را سر بکشیدن دہیم
از نمکِ نطق ماست ہر بن مو ذوق یاب — لامسہ را از فسونِ حس چشیدن دہیم
جشنِ از طرفِ خویش بہرہ نخواہد ربود — روحِ قدس را بدل راہ نچیدن دہیم
دعدہ بغداست گر مرحلۂ جیش نیست — شوقِ سبکتاز را گامِ دویدن دہیم
زامتعۂ رنگ رنگ جنس دلِ سادہ را — از پئے نقشِ وفا داغ گزیدن دہیم
گو ز سرِ خونچکان پئے بسرِ رہ برند — زینتِ فتراک را سر بریدن دہیم
پوششِ جسم ہری چادرِ انگبین است — بر نمطِ عنکبوت، تار تنیدن دہیم
سینہ کہ از داغِ عشق لاحِ انا المشرقی ست — از اثرِ چاکِ جیب خور بدمیدن دہیم
ہر نفس آید بگوش بانگِ درای رحیل — ناقۂ خود را چرا حکم چریدن دہیم
سالِ نشید غزل "دادۂ پیغمبری" است — بیان را چو فرس لطف تنیدن دہیم

فی النعت

خارِ رہش چشم را رخصتِ چیدن دہیم — در دلِ رضوان، ز رشک مغز خلیدن دہیم
لب بتکلم کشاد، نغمہ ز انفاس زاد — دل بتپیدن نہیم، جان بتپیدن دہیم
بر سرِ عرشِ برین طرف کلہ بشکنیم — بر قدمبوسِ شاہ، سر بخمیدن دہیم
بندۂ آن خواجہ ایم، کز پئے جنسِ بہشت — معصیتِ خویش را برگِ خریدن دہیم
روحِ وفا فی فداک! در تنِ تو دل را خوراک — در تنِ زار از غنمت جان ببیدن دہیم
شامگہی گر بچشم کحلِ "رآنی" کشیم — صبح "ایرنی" گوئی را نیروی دیدن دہیم
بوکہ بہ نیتر خورد بادِ خوشِ روضہ را — سوی چمن زارِ ہند موجِ وزیدن دہیم

ایضاً

بوالہوس اور بھی مرنے کی کریں گے خواہش — شمع دکھل قبر پہ رخشاں کی زلایا کیجے

ایضاً

خاک کا پتلا ملائک کا بحق مسجود ہے — سجدۂ حق میں بشر کا جبہہ خاک آلود ہے
واں پہنچنا کیا ہو مشکل، آتے ہوں جرعے سے سل — جادۂ دشتِ عدم اپنا قدم فرسود ہے
یہ سرِ نخوت کہیں اب تو جھکے بہر خدا — مورچہ یا سبزۂ خط پشتِ نمرود ہے
زلفِ مشکیں کی سیاہی بیکسی ہے آنکھ میں — رشتۂ نارِ نگاہِ دیدۂ مشک اندود ہے
یہ حصارِ آبگینہ شبنۂ ساعت کی شکل — گاہ زیر و گہ زبر پر باد و خاک آسود ہے
دل و قوۂ آبلہ سے پینے میں کیوں کر سمائے — دل کے پرخوں ہونے سے ضبطِ محل افزود ہے

نغمۂ خوش آہنیں دل کو بھی کر دیتا ہے موم — لحنِ داؤدی میں اعجازِ کفِ داؤد ہے
آفتابِ حشر سے دل سوختہ کو کیا ہراس! — دودِ آہِ دل سے سر پر سایۂ ممدود ہے
دلفزا لطفِ سخن، جانکاہ غمزے کی نگاہ — نقدِ جانِ دونوں عالم رہنِ یک سودا ہے
سنگ اسود پر لگے ہے، آہنی بت کی ہے ساخت — مومنِ وکافر کی یغمائے دلستاں، مسجود ہے
نفیِ نفی اثبات کہلاتی ہے، رخشاں اس لیے — ہم نہیں کہتے کہ یہ کون و مکاں نابود ہے

ایضاً

مے کے گرنے کا ہے خیال ہمیں — ساقیا، لیجیو سنبھال ہمیں
کل نہ آئے جو اپنے وعدہ پر — گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں
تیرے غمزے نے ایک دم میں کیا — مردۂ صد ہزار سال ہمیں
نقص سے رنج کچھ نہیں، رخشاں — حق نے بخشا ہے یہ کمال ہمیں

ایضاً

شاید بہار آئی کہ جوشِ جنونِ حیوں — پھر کر رہا ہے جامۂ دستار تار تار
سر پیٹنے، سینہ کوٹنے کا افسوس ہیں مٹے؟ — عاشق کو ہاتھ چاہئیں ناچار چار چار
رخشاں پہ غصے، قیس کے ملنے سے کیوں ہوئے؟ — ملتے ہی ہیں ہم، بعدِ عیار، یار یار

ایضاً

چاکِ یکسر مرا گریباں ہے — دل کا معصر مرا گریباں ہے
لاغری میں بریدہ ناخن سے — منحنر تر مرا گریباں ہے
رات سینے سے سینہ کس کا ملا! — کہ معطر مرا گریباں ہے
چاک کرتا جگر کا سکھلایا — میرا رہبر مرا گریباں ہے
سر آوارگانِ وحشت پر — سایہ گستر مرا گریباں ہے
پھر بہار آئی، اب جنوں کا ہاتھ — اور، نیتر، مرا گریباں ہے

ایضاً

کیا پہنچے تو، فرشتے کا جس جا گزر نہ ہو؟ — بیت الصنم ہے، شیخ، خدا کا یہ گھر نہ ہو
رخشاں، جو آتے آتے ابھی رُک گئے ہیں اشک — آنکھوں میں آگیا کوئی لختِ جگر نہ ہو

ہو

سحر کہ بادِ سحر دمید جانِ درتن — نبوِ صبح، نمودم دو دیدگان روشن
چہ صبح! صبحِ دل افروزِ روزگارِ بہار — چہ باد! بادِ روان بخشِ نوبہارِ چمن
سحر کشیدہ برخ غازہ از نمودِ شفق — صبا دمیدہ بتن روح از نسیمِ سمن
فروغِ صبح بدیدہ کشیدہ سرمۂ نور — کہ خواندہ گشت خطِ سرنوشتہا بلطف
نسیمِ باغ بجنبی گشادہ طبلۂ عطر — کہ تودہ تودہ سمن ریختہ است گل بن من
زمانِ زمزمۂ نسائیم بیانِ باغِ ارم — جہان زجوشِ شمائیم لبانِ دشتِ ختن
بوزنہ، بقعۂ دہلی، خلدِ عدن سواد — کہ گشتہ ذرۂ خاکش ہم ارزِ دُرِّ عدن
چہ دہلی! آن کہ زفرطِ شگفتگی زمین — زدہ زخندۂ گل قہقہہ بردی چمن
چہ دہلی! آنکہ بہ وقت بودہ دارالملک — زروزگارِ مغل تازمانِ جرجو دھن[1]

[1] راجا جیپال دان یا جیپان۔

چه دہلی؟ آنکہ بود پای تخت ہندستان — چنانکہ مملکت انگلنڈ را لندن
چه دہلی؟ آنکہ ز معمورئ مدارس بود — علوم مشرقی جملہ قسم را معدن
چه دہلی؟ آنکہ ز آموزش صناعت بود — مدار جملہ ہنرہا و مرکز ہر فن
ز نقش فتنہ رایان، دم جبین سائی — ستارہ زار شدی صحن موقع درشن[1]
ز بوسہ لب یان خوردہ مہ رایان — شدی بسنگ درش سجدہ عقیق یمن
پیاس حق بکردگر یافتہ ہمان عظمت — ز خیر مقدم گیہاں خدیو لارڈ رپن
بدان مثابہ کہ روز جلوس قیصرخان[2] — شدہ مزین و بازیب بلدۂ پیشن[3]
بدان نمونہ کہ برلن[4] شدہ است آئین بند — دم ورود مظفر شہنشہ جرمن
بگونہ گونہ نمایش گرفتہ آرایش — چہ بارہ و در شہر و چہ کوچہ و برزن
خلائق از پئے دیدن شکوہ استقبال — یافت خیزد وان سوی ریل استیشن
چو موج باد، ہمہ سیر، چہ خاص و چہ عام! — چو سیل آب ہمہ قطرہ زن چہ مردہ چہ زن
بقطع راہ یکی بر دگر تقدم جوی — شمردہ خار و خس راہ اطلس و اطکن
بماندہ ہم بسر خلق، تا بیانجملہ — در انددحام گر انداختہ کسی سوزن
بود ز فرط خوشی یا کہ از کشاکش خلق — کہ پارہ پارہ بر اندام گشتہ پیراہن
چو روز عید کسان از سر آمد و رفت — بیکدگر شدہ گرم معانقہ ہمہ تن
مصافحہ شدہ یکدست بیو از احباب — ز بیکہ بودہ بتعیین شہر دستک زن
غریو بشکک اتواپ مژدہ بخش قدوم — فگندہ غلغلہ در گنبد سپہر کہن
پیادگان و سواران ستادہ ہر دو طرف — ہمہ نہنگ شکار و ہمہ پلنگ اوژن
گروہ ساز نوازان بیکطرف زدہ صف — طبب نی و دہل و کمنچہ جلاجل و ارغن
بدور دادیہ دوران ہمہ اکابر شہر — فراہم آمدہ ز انسان کہ گرد مہ خرمن
معززان یورپ جمع با اہالی ہند — چنانکہ سبزہ و گل پرورند یک گلشن
ز سر گرفتہ کلہ انگلش سران زالیسر — نہادہ دست بسر ہندی افسران زامین
نمودہ پشت خم و سر فرود پئے تسلیم — کہ پابوسی و سرپانئی است انسان را
گزیدہ شیوۂ دیرین ادای تہنیت است — بوالیان ممالک ز اہل ملک و وطن
ولی بخاطر راقم لطیفہ گزرد — امید آنکہ فیوض کنند اہل فطن
کہ دلیسای عدالت گرای ملک آرای — خود از زبان در افشان بلہجۂ امین
بشہریان بدہد مژدۂ مبارکباد — ز عہد دولت خود عہد نشر عدل و امن
نوید راحت و آسودگی و آزادی — امید دفع بلاہای قحط و ریخ و محن
عنایکانا[5] و قسیکہ در میان سفر — بیار سال از امروز دور تا صدون[6]
ہم از تبدل آب و ہوای ملک و فصول — ہم از مشقت راہ دراز بیرون
رسیدہ بود بہم ریخ صعب و ضعف قوی — بدان شریف عناصر بدان لطیف بدن

(۱) گلرخ ہندیت یعنی بارہ دار - لیکن مستعمل فارسی زبانان مرغ سرای طوک ہندست - (۲) شہزادۂ ویلز خان -
(۳) پای تخت چین (۴) پای تخت پروس - (۵) چیرز ویہ انگریزی لفظ ہے اور اس کے معنی نایاں ہیں عرشی
(۶) در ترکی دہ ہزار سال را گویند -

عموم مردم هند، و خصوص دهلویان — خندند مضطرب و مبتلای درد و حزن
دراز ساخته دست دعا بدرگه حق — برای صحت فرمانده زمین و زمن
دعای صبحگهی و نیاز نیم شبی — هزار شکر که پذیرفت ایزد ذوالمنن
بزود تر قسم عافیت بردن آمد — هم از خصوص علالت هم از عمای محن
نگاه بان تو چشمان روشنان سپهر — که هست بر قدرت از نقش چشم شان روشن
بیادگار قدوم مسرت آثارت — ز شهر گشته فراموش شیوه شیون
بروزگار درود نجستگی یارت — بدشت لاف همائی زده است بوم و زغن
ز سر گرفته کله مهر دره پی تعظیم — اگر گزشته برایوان تو ز سپر امن
سزد ز شهپر کردبیان پرکلدت — که گشته طرف کلاهت بچرخ سایه فگن
ز اختلاف ملاحت، امور سهل محال — ز اتفاق رضایت، محال ها ایون
گو رنمی بتوانند تو بدان که فروغ — بود ز شمع لگن را نه شمع را ز لگن
توان شمرد نظیرت چگونه آغسطس؟ — که فتح یافته بریک ضعیفه قبطی زن؟
توان نوشت عدالت چگونه اسکندر؟ — که فوج خود نتوانست برد تا بچمن
ز اتحاد تو، یکدل همه پرستند دهر — ز اعتقاد تو، خوشنود کینهلک ردمن
از آنکه ملت پیشینه مسیحی را — مصدقی بخلوص یقین و خوبی ظن
فزون تری ز دوگر صیوه حکم دیان — پرهم و شفقت قلبی و مهر و خلق حسن
ز خلق دوستی و حق پرستی تو بدهر — نبوده هیچ کسی دشمنت جز اهرمن
بزیر حکم تو، از روی طول، صد کشور — زروه بابه بهم پیچ تا بقطع دجن
مطیع امر تو، از راه عرض یکعالم — ز کوهبابه بالا تا بحر الی بلاد دکن
اگر بعهد تو بودی، بیامدی قاصد — ز شرح دانش و داد تو خوش بیان ملتن
ز مدح خوانی، تو هومر آمدی ایکم — ز وصف گوئی تو ورجل آمدی الکن
مگر بگوشهٔ دامان تو رسد دستش — دراز دست ازان آفریده شد بهمن
مرا دازان وطن ترکی بود محاسبدا — سنین عمر تو هرگه کند شمار ازون
خوشا! میارکی، عهد معدلت مهدت — که اعتدال ربیعی است در دی و بهمن
بسیجی اسپ سواره گر اکتاب هوا — شود هوای بهاری بهیئت توسن
شکار شیرازان رود چید پسندیده — جناب ارل گری فوجوان شیرافگن
که بهفتر زوفان مشتغل شوند بدشت — مزارعان بزراعت ورودن و کشتن
ز فرط پیل کشی و پلنگ افگنیش — شد، از روانی خون، دشت رود خانه بن
توئی که بازسپردی امارت کابل — بعبدالرحمن خان آن جلاسنده زدلن
ز مرت قطعهٔ ملکی بدو بخشیدی — که وادی اسلحه و سیم و زر جبل مخزن
بدان قدر که هم از سیم می تواند ساخت — برای توپ گلوله گران تر از آهن

(۱) کلکتہ قدیما سمر (۲) عقیدۂ دیگر حاکمان انگلش (۳) عقیدۂ دلیرای (۴) دریای شرقی ہند در اقصای بنگالہ۔
(۵) مواضع سرحد بلوچستان و افغانستان (۶) جبال شمالی ہند (۷) ملٹن و ہومر و رجل ہر سہ شاعران نامی یورپ بودہ اند۔ (۸) دہ ہزار سال (۹) یک، عدد انگریزی (۱۰) نام یک دریای ایرلنڈ۔

بزور زر کہ بزودی بہان زبدوی — امیر فتح وظفر یافتہ است بر دشمن
ولی باین ہمہ بذل توجہ و الطاف — اعانت و مدد و بخشش و عطا و منن
امید خیر سگالی ازو نباید داشت — وفا گجاست بزر بندہ مرد عہد شکن[1]
شعار او دست رضا جوئی دو دہما یہ — زدن دو جنگ بئی اخذ زر بدو دامن
و میکہ گشت معین بیک انگلش افسر — بئی سفیری آن ملک دیو دد مسکن
بغور بندہ زنا راستی این تدبیر — نمودہ عرض برادر نرمیل انجسترن[2]
کہ آبیاری فرمان روائیش بنجاب — بود شگفتہ و شاداب تر ز صد گلشن
بلی وظیفہ دیرینہ خیر خواہانست — مخصوص مدح طرازان سالخوردہ چمن
ادا نمودن اندر زر در مطاوی مدح — نگار کردن مطلب بفن شعر و سخن
درین چگامہ کہ بالجملہ تہنیت نامہ است — در آسمان شدہ پرنظم دی نثار پرن
یکی نگارش مدح است، بوکہ باد قبول — دگر گزارش رائی کہ بودہ مستحسن
بیان بندہ نہ فخریہ بلکہ شکریہ است — کہ از میامن این عہد و من این ماہن
نہادہ اند بطبعم نکبتی از ہر علم — سپردہ اند بدل حصۂ ز ہر یک فن
ز نظم و نثر و ز جغرافیہ ہم از تاریخ — ز حکمت عملی و ز انتظام مدن
کلام پارسی پر سی خیال آمیز — کہ فاش شد ز من این تازہ طرز نو فاخر[3]
ز بندہ تیر رخشان گشد قبول این نذر — کہ بر تراست ز سلک گہر بار زدشن
دم دعاست کہ ہم پرد عا سخن سنجان — گرفتہ اند مبارک بفال ختم سخن
مدام تا نشود آورده ذکر رت بیدم[4] — مدام تا کہ شود پردہ نام گل بہ دمن[5]
ہمیشہ تا کہ ملاحق بود بدجلہ فرات — ہمیشہ تا کہ معانق بود بگنگ جمن
بہم حمار کویس خوش زیاد مارگنس[6] — چہ در حمالک ہندو چہ در دیار رین[7]
بغرقِ ہر دو گرانمایہ دو سہ دیگرارل[8] — تقدس سہ آخانیم[9] باد سایہ فگن!

صفحہ ۶۰۰

(۱) میرزا صاحب کے ۱۹ ستمبر کے عریضے کے جواب میں نواب خلد آشیاں نے جو فرمان لکھا تھا اُس کا اہم فقرہ میرزا صاحب نے نقل کیا ہے۔ نواب صاحب فرماتے ہیں: "..... فیان خامہ کہ در تحریر معانی شعر عرفی و ہم تحقیق لفظ ارتنگ و ارژنگ گوہر بار گردیدہ بر خاطر اخلاص فروش ہر آئینہ مخفی و محجب مباد کہ اکثر مالک رقابان علم لغت ارتنگ و ارژنگ را بمعنی واحد پنداشتہ اند۔ دعامۂ مفسران کلام شیرازی مثار آشیان چیدن زاغ و زغن آخیان بستن نگاشتہ۔ چنانچہ نظیر ہر یکے ملفوف عنبرین نامۂ ہذاست بطالعہ خواہد رسید۔ معہذا اگر طبع آن استاد زمان بہ ترقیم الفاظ بالائی اکتفا نفرمودی واشتہ، ہمچنان حوالۂ قلم نمایند کہ مبحوث عنہ را از تقریظ اصلاح شدہ چون نفسانیت خود محو سازم، زیرا کہ مرا ازان شفیع واسطۂ تلمذ بودہ است۔ نہ از عرفی و دیگران ما نظیر یکہ بہ نظرم گذشتہ است، صرف برای اطلاع بہ نفیسۂ ہذا مندرج گردیدہ المرقوم ۲۱ جمادی

(۱) نواب لفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب (۲) یعنی طرز و روش لغت آفرینی۔ (۳) رت سین و پدماوت راجہ رانی و جیسوڈ (۴) راجہ رانی او جین (۵) بیگم مارگویس، چنانچہ پرنس و دچس بیگمان پرنس و دچس۔ (۶) وطن دیسرای۔ (۷) یعنی ارل گرے مذکور ترزدکان دیلرے۔ (۸) جمع اقنوم (اصول سہ گانۂ تثلیثیان کہ مراد از اب و ابن و روح است

الاول سنہ ۱۲۸۳ھ مطابق ۲ اگست سنہ ۱۸۶۶ء۔

صـ ۶۱

(۱) ملا عبدالصمد کی شاگردی کے متعلق اردوی معلی اور قاطع برہان میں میرزا صاحب نے تصریح کی ہے۔ لیکن اس کا سبب سے پہلی بار اظہار قاطع برہان کی وساطت سے ہوا ہے۔ اس سے قبل کبھی میرزا صاحب نے عبدالصمد کا ذکر نہیں کیا بلکہ ہمیشہ یہ ظاہر کرتے رہے کہ فارسی دانی کا ملکہ قدرت کی طرف سے انھیں ودیعت ہوا ہے مکتے کے سفر میں جو ادبی جھگڑا مکتے والوں سے پیش آیا تھا، اس میں بھی میرزا صاحب نے عبدالصمد کے اقوال کو اور اس کی تعلیم کو ثبوت میں پیش نہیں کیا۔ حالانکہ وہ موقع عبدالصمد کی شاگردی کے ذکر کے لیے زیادہ مناسب تھا۔ اسی وجہ سے مجھے اس میں شک ہے کہ عبدالصمد کوئی زمعلم پارس اکبرآباد آیا اور میرزا صاحب اس کے شاگرد ہوئے اور دو برس میں انھیں فارسی گنا کر چلا گیا۔ بلکہ واقعہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مخالفوں کو خوش کرنے کے لیے میرزا صاحب نے یہ نام دل سے گھڑ لیا تھا۔ جب کہ خواجہ حالی مرحوم نے خود میرزا صاحب ہی کی زبانی یادگار غالب (ص ۱۴) میں اس کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ قاطع برہان کی تالیف کے وقت تک اکبرآباد کی سکونت چھوڑے کافی عرصہ گزر گیا تھا، اس لیے میرزا صاحب نے اس زمانے میں عبدالصمد کے ذکر کو چھیڑا، ورنہ اس سے پہلے اکبرآباد میں ایسے لوگ بقید حیات ہوئے جو اس کی تغلیط کر سکتے تھے، اور میرزا صاحب کے مخالف اُن کی سند پر کافی لے دے کر سکتے تھے۔ اس قیاس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ ایسے فاضل شخص کا ذکر معاصرین میں سے کسی نے نہیں کیا ہو کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ جس کی عربیت اور فارسیت کی تعریف میں میرزا صاحب رطب اللسان ہیں، وہ دو برس اکبرآباد میں اور خدا جانے اور کتنے برس ہندوستان میں رہتا ہے مگر کہیں سکا پتا نہیں چلتا اور میرزا صاحب بھی اس کا ذکر کرتے ہیں، تو سالہا سال گزر جانے کے بعد۔

بہرحال اس موضوع پر ایک مستقل مضمون میں بحث کا ارادہ ہے۔ وباللہ التوفیق۔

(۲) خان انجو کا نام جمال الدین حسین بن شاہ حسن انجو شیرازی اور لقب عضد الدولہ ہے۔ ان کے آباواجداد فارس کے شہر ہ آفاق شہر شیراز کے باشندے تھے۔ یہ وہیں پیدا ہوئے۔ بعد ازاں تلاش روزگار ہندوستان آئے، اور بقول محمد حارثی بدخشی، سنہ ۱۰۳۵ ہجری (۱۶۲۶ء) میں آگرہ میں انتقال کیا۔ فرہنگ جہانگیری ہندوستان کے مغل بادشاہ نورالدین جہانگیر بن جلال الدین اکبر کے نام معنون ہے۔

(۳) شیخ رشید کا نام عبدالرشید الحسنی ہے۔ ان کے آباواجداد مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے۔ یہ خود شہر ٹھٹھہ میں پیدا ہوئے۔ منتخب اللغات اور فرہنگ رشیدی ان کی مصنفہ ہیں۔ خزانۂ عامرہ (ص ۴۲، نولکشور پریس) میں ان کا سال وفات ۱۰۷۷ ہجری (۱۶۶۶ء) لکھا ہے۔

(۴) لالہ بندرابن خلص خان آرزو، متوفی سنہ ۱۱۶۹ ہجری (۱۷۵۵ء)، کے شاگرد اور اردو، فارسی کے شاعر تھے۔ رباعی کے علاوہ ایک کتاب جواہر الحرونسا بھی ان کی تصنیف ہے۔ ان کا سال وفات کسی تذکرے سے معلوم نہیں ہو سکا۔

(۵) سیالکوٹی مل وارستہ تخلص، مصطلحات شعرا کے مصنف ہیں۔ یہ میر محمد علی رائج سیالکوٹی متوفی سنہ ۱۱۴۹ھ (۱۷۳۶ء) کے شاگرد تھے۔ اور سنہ ۱۱۸۰ھ (۱۷۶۶ء) میں فوت ہوئے ہیں۔ مصطلحات شعرا کو عام طور پر سنہ ۱۱۸۰ھ کی تصنیف بتایا جاتا ہے۔ لیکن در اصل اس کا تاریخی نام "مصطلحات شعرا" ہے، جس سے سنہ ۱۱۴۹ھ برآمد ہوتے ہیں اہل ادب میں مصطلحات الشعرا مشہور ہو جانے کے باعث (ال) کے ۳۰ عدد زیادہ جوڑ لیے جاتے ہیں۔

(۸) اصل خط میں سہواً ۱۷ تاریخ درج ہوگئی ہے، صحیح سات ہے، اس لیے کہ اولاً تو خود میرزا صاحب ہی نے اس خط کے لفافے پر ۸ اکتوبر تاریخ لکھی ہے، جس کے یہ معنے ہیں کہ تاریخ کتابت کے دوسرے دن یہ خط پوسٹ کیا گیا تھا؛ ثانیاً نواب خلد آشیاں نے اس خط کا جواب، جو آگے آرہا ہے، تیرہ اکتوبر کو دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس خط کا جواب تیرہ کو لکھا جائے، وہ خود سترہ کا مکتوب نہیں ہو سکتا۔ میرزا صاحب کے عریضے کے بعض کنایات سے ناخوش ہو کر نواب صاحب نے جواباً تحریر فرمایا: "... مکتوب حیرت اسلوب مشعر اختراع سنی غلط نسبت ہندی نژادان پیشین و دیگر اعتراضہا، و این کہ راقم را طریقۂ بحث یاد نیست، موصول مطالعہ گشتہ باعث استعجاب عظیم گردید۔ از آنجا کہ تا حال ورای تحقیق و تنقیح امور علیہ، کہ معاذ اللہ: از مناظرہ: مناقشہ بحشم حق بین بیا بعید می نماید، امری دیگر بظہور نیامدہ و آنچہ حالی خاطرم بود بی ریب و ریح حوالۂ قلم و قائق سنج گردید لیکن می نازم بر ذہن موشگاف آن فرید زمان کہ توشۂ ام را بر بحث و اجتہا د محمول نمودہ۔ امثال این کنایات ہای نوا مثل نسبت استادی بجانب راقم و لفظ بحث، کہ ہر دو خلاف واقع و موہون ریخ و عناست، نگاشتند۔ پس اگر آن مشفق را بہتر ین منظور باشد، اشارتی سازند کہ وا سطۂ ترسیل رسائل از فیما بین برداشتہ شود۔ ورنہ میان خامہ ہا بمیر خارج المہمات تکلیف ندادہ باشند، کہ نتیجہ اش سوائے صداع الراس امرے بخیال نمی رسد۔ و راقم پایۂ اعتبار محققان، کہ صاحب تصانیف مقبولۂ انام بودہ اند از خود زیادہ دانستہ بحوالۂ کلام شان پرداختہ۔ اگر آن سمیم جادیدہ آنہا قابل قبول نبود، بایستی کہ ہم بر آن نمط تحریر میساختند۔ مصلحت اینقدر را طناب سخن از فہم ہیچ مدنی بیرون۔ زیادہ ازین نوشتن حکمت بلقمان آموختن است۔ المرقوم ۳ جمادی الثانی سنہ ۱۲۸۳ ہجری مطابق ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء" چونکہ نواب صاحب کے اس فرمان سے اظہار ناخوشی و ناراضگی ہوتا تھا، میرزا صاحب نے فوراً معذرت نامۂ مورخہ ۱۷ اکتوبر لکھ کر طلب عفو کیا۔ نواب صاحب نے معذرت قبول کرتے ہوئے تحریر فرمایا: "شفقتا! سابق ازین بملاحظۂ مضمون مقارضۂ سابقہ لمری کہ متحمل نشدہ بود بے شائبۂ انکاف حوالۂ خامہ گردید۔ حالا کہ آن مہربان بتادیب پرداختند از آن فرخ شکر کہ وقت گردید خلوص لطف مظہر مغفرون جبلت باشد۔ المرقوم ۱۱ جمادی الثانیہ سنہ ۱۲۸۳ ہجری مطابق ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۸۶۶ء۔ اسکے بعد نواب صاحب نے پھر کوئی نئی اصلاح کیلئے نہیں بھیجی جسکے یہ معنی ہیں کہ آپ کی طبیعت کا تکدر بکلیۃً دور نہیں ہوا۔

(۱) صاحبزادہ سید مہدی علی خاں بہادر، نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے پوتے، صاحبزادہ سید حفیظ اللہ خاں بہادر کے بیٹے، اور نواب خلد آشیاں کے چچا تھے۔ شعر و سخن کا شوق تھا اور تخلیص تخلص کرتے تھے۔ ابتدا میں نواب فردوس مکاں سے تلمذ تھا۔ آخر میں سر احمد علی رسا کے شاگرد ہوئے۔ ۴۷ برس کی عمر پائی۔ ثانیاً یکم ماہ رمضان سنہ ۱۲۷۹ ہجری (۲۴ فروری سنہ ۱۸۶۳ء) کو رحلت فرمائی۔ (انتخاب یادگار: ۳۸۴، و تاریخ لطیف: ۲۲۹)۔

(۲) نواب خلد آشیاں بہادر کے اس سفر کے متعلق صاحب اخبار الصنادید (ج ۲، ۱۴۰) نے لکھا ہے کہ: "مسٹر جان انگلس صاحب کمشنر و ایجنٹ ریاست نے نواب سید کلب علی خاں سے ہو تہاری و بلند اقبالی کے آثار دیکھ کر بہت جلد آنریبل ایڈمنڈ ڈرنمنڈ صاحب لفٹنٹ گورنر صوبجات متحدہ کے حضور میں رپورٹ کی، اور انھوں نے لارڈ لارنس صاحب گورنر جنرل کی خدمت میں نواب سید کلب علی خاں کی لیاقت خداداد کی اطلاع کی۔ گورنر جنرل نے باظہار مسرت مثل نواب سید یوسف علی خاں کے نواب سید کلب علی خاں کو بھی لیجسلیٹو کونسل میں ممبر تجویز کیا۔ نواب صاحب نے ہنگام استمزاج باوجود ناچاقی طبیعت و ضعف اقتضائی عزم ممبری قبول کی۔ ۲۰ شعبان سنہ ۱۲۸۳ ہجری (۲۸ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ء) کو رامپور سے علیگڑھ تک گاڑی کی ڈاک میں اور علیگڑھ سے کلکتے تک تخمیناً پانسو ہرکاروں کے ساتھ ریل کے ذریعے سے گئے۔ اثنائے راہ میں کانپور، الہ آباد، اور بنارس وغیرہ ہر مقام پر حکام نے استقبال کیا اور سلامی سر ہوئی۔ مہاراجہ البیسری پرشاد نرائن سنگھ صاحب جی، سی، ایس، آئی والی کاشی تو بیس نے بنارس میں منتظر استماع قدیمی دھوم سے دعوت کی۔

کلکتے میں گورنر جنرل کی طرف سے پُرزور مرغوب استقبال ہوا۔ سلامی سر ہوئی۔ آب و ہوائے کلکتہ نے ان کے مزاج سے بھی مخالفت کی، اور طبیعت جادۂ اعتدال سے منحرف رہی۔ پھر بھی کونسل میں کئی اجلاس کیے۔ جب ناسازی زیادہ بڑھی تو حسب اصرار گورنر جنرل ڈاکٹر بیلی سے علاج شروع ہوا۔ ڈاکٹر کی رائے ہوئی کہ آب و ہوا یہاں کی ان کے مخالف ہے، بلکہ قیام کلکتے سے امراض شدید لاحق ہونے کا اندیشہ ہے، مگر نواب صاحب نے اسے قبول نہ کیا۔ جب گورنر جنرل کو اس کا علم آیا، تو بمقتضائے محبت خاص بکمال اصرار واپس کیا۔ ۲۴ رمضان سنہ ۱۲۸۳ھ (۳۱ جنوری سنہ ۱۸۶۷ء) کو کلکتے سے رامپور واپس ہوئے۔

میرزا صاحب کے عریضۂ (۸۱) کے لفافے سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب محلۂ کھنجوپورہ کے مکان نمبر ۱۰ میں قیام فرما ہوئے تھے۔ مرزا صاحب کا قطعۂ تاریخ بحسب الحکم حضور اخبار دبدبۂ سکندری میں طبع ہوا اور ۲ نومبر کو اسکی اطلاع ان الفاظ میں میرزا صاحب کو دی گئی: "تاریخ مذکورہ کہ بطرز نوہ حدیم المثال است اخبار دبدبۂ سکندری را بتوسیع گرو شد"

(۳) خط میں کتاب کا نام اور تاریخ درج نہیں تھی۔ میں نے قوسین میں اضافہ کی تاریخ اضافہ کردی ہے۔

ص ۶۴

(۳) میرزا صاحب نے اس جلد اور آئندہ جلے کے درمیان، تقطے دیے ہیں۔

اس عریضے کے جواب میں ۲۲ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ء کو نواب خلد آشیاں نے تحریر فرمایا: "... چون راقم متقرب روانۂ کلکتہ می شود۔ چنانچہ بڑی انتظام گاڑی یہاں ریل رفعت و عوالی مرتبت محمد اصغر علی خاں رسالدار را روانۂ آنجا نمودہ شد، و ہنوز تاریخ رسیدن بمقام اسٹیشن ریل دہلی مقرر نگشتہ؛ لہذا حوالۂ خامۂ سودت نگار می شود، کہ حال تقرر تاریخ رسیدن آنجا از خان معزی الیہ دریافت نمودہ شود۔"

(۴) سر ڈانئل سکلوڈ صاحب مراد ہیں، یہ لفٹننٹ جنرل ڈنکن سکلوڈ کے یہاں فورٹ ولیم، کلکتہ، میں ۶ جون سنہ ۱۸۱۰ء کو پیدا ہوئے۔ ولایت جاکر تعلیم پائی۔ سنہ ۱۸۲۸ء میں ہندوستان واپس ہوئے، اور صوبۂ بنگال میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۳۱ء سے ۱۸۴۹ء تک اضلاع ساگر و نربدا، اور بنارس میں رہے۔ ۱۸۵۴ء میں پنجاب کے جوڈیشل کمشنر ہوئے۔ قدر سنہ ۵۷ء میں لاہور میں تھے۔ ۱۸۶۵ء سے ۱۸۷۰ء تک پنجاب کے لفٹننٹ گورنر رہے، اور ۲۸ نومبر سنہ ۷۲ء ۱۸ کو لندن کی زمین دوز ریل کے ایک حادثے سے انتقال کر گئے۔ یہ شرقی علوم و فنون کے بڑے حامی تھے، اور چاہتے تھے کہ دیسی زبانوں میں مغربی علوم کی تعلیم دیجائے۔ پنجاب یونیورسٹی انھیں نے قائم کی تھی۔

ص ۶۶

(۱) لارڈ لارنس مراد ہیں۔ جو ۱۲ جنوری سنہ ۱۸۶۴ء سے ۱۲ جنوری سنہ ۱۸۶۹ء تک ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل رہے تھے۔

(۲) اس سلسلے میں نواب خلد آشیاں نے ۲۱ جنوری سنہ ۱۸۶۷ء کو تحریر فرمایا: "مشفقا! بعنایت ایزدی مخلص بخیریت تمام بتاریخ ۶ جنوری سنہ حال فائز مقام کلکتہ گردید۔ و ملاقات جناب مستطاب معلی القاب نواب گورنر جنرل بہادر دام شوکتہم و دیگر صاحبان عالی شان و نیز اجلاس کونسل مبعثان شایستہ و طرز بایستہ بپایۂ حصول رسید۔"

(۳) دونوں لڑکوں سے باقر علی خاں اور حسین علی خاں مراد ہیں۔ دیباچے میں ان کا حال تفصیل سے لکھدیا گیا ہے۔

(۴) نواب خلد آشیاں نے ۲۷ رمضان ۱۲۸۳ھ (۳ فروری ۱۸۶۷ء) کو لکھا تھا: "بتاریخ سی و یکم ماہ جنوری سنہ حال راقم بعنایت الٰہی مع الخیر بعد شمول چند اجلاس کونسل از مقام کلکتہ داخل رامپور گردید۔"

تعجب ہے کہ یہ فرمان میرزا صاحب کو ۱۴ فروری تک موصول نہیں ہوا۔

صـ۶۷

(۱) لفافہ پر ۱۵ فروری درج ہے۔ غالباً دوسرے دن پوسٹ کیا گیا تھا۔

صـ۶۹

(۱) لفافہ کی پشت پر تحریر ہے: "پنج نوده شد۔ قطعۂ نوشتہ نزد معتمم اخبار برای طبع ... فرستاده شود: ... مطابق ۱۰ اپریل سنہ ۱۸۶۷ء"

(۲) انتخاب یادگار (ص ۹۰) اور اخبار الصنادید (ج ۲، ص ۱۳۹) سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب خلد آشیاں نے سنہ ۱۲۸۲ ہجری (سنہ ۱۸۶۵ء) میں باغ بنظیر کی نمایش کا آغاز کیا۔ موخر الذکر لکھتے ہیں: "۱۲۸۲ھ مطابق سنہ ۱۸۶۵ء سے باغ بنظیر میں ایک میلہ جاری کیا۔ آٹھ روز بڑی رونق سے یہ میلہ رہتا تھا مال بکثرت آتا تھا۔ باغ میں بہت سی دوکانیں ہوتی تھیں اور وہ ہیکمنڈ کے اکثر معزز رؤسا اس میلے میں شریک ہوا کرتے تھے۔ نواب صاحب خود بھی آٹھ روز برابر وہیں مقیم رہتے، اور اکثر اوقات سوداگروں پر تشریف لیجا کر اسباب خریدتے۔ قسم قسم کے جلسے، طرح طرح کے تماشے ہوا کرتے تھے۔ بائیس میلے نواب صاحب نے کیے۔ تیئیسواں میلہ قریب تھا کہ رحلت کی۔

سبد چین (ص ۵۱) میں اس قطعے کے ۶ شعر درج ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے صاف کرتے وقت صرف تین بیت ہی ارسال کرنے کے قابل شمار کیے۔ پورا قطعہ یہ ہے:

نمایشگہی در فروغ شان خویش — برآراست نواب عالی جناب
بشب زہرہ در قندیل سقف — بود چینکارش بہ روز آفتاب
ز غالب چو پرسیده شد سال آن — چنین گفت آن رند خانه خراب
از ان رو که در بزم عیش و نشاط — ز بخشش جهانی شود کامیاب
چو بینی طرب را نهایت نماند — بود سال آن "بخشش بے حساب"
خدایا! پسندد خداوندگار — که از طبع غالب رود پیچ و تاب

صـ۷۰

(۱) خط میں تاریخ درج نہیں تھی میں نے لفافہ سے یہ تاریخ اضافہ کر دی ہے۔

(۳) صاحبزادہ محمد حسن خاں بہادر، نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے پوتے اور نواب خلد آشیاں کی صاحبزادی حیات النساء بیگم ملقب بہ عالیہ سلطان بیگم کے شوہر تھے۔ (اخبار الصنادید: ۲، ۲۳۰) انھوں نے عین نوجوانی میں انتقال کیا۔ نواب خلد آشیاں کے لیے یہ واقعہ بہت روح فرسا تھا۔ اس لیے میرزا صاحب نے اس قدر پر اثر تعزیت نامہ ارسال کیا۔

صـ۷۱

(۱) علی بخش خاں خانساماں کے سلسلے میں پچیسویں خط کا حاشیہ ملاحظہ ہو۔

صـ۷۲

(۱) صاحب عالم میرزا رحیم الدین بہادر حیا ابن مرزا کریم الدین رسا دلی کے شاہزادے اور شاہ نصیر کے شاگرد تھے۔ سنہ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوئے۔ رجب سنہ ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۵ء) میں نواب فردوس مکاں کی طلب پر رامپور تشریف لائے، اور یہیں سنہ ۱۳۰۴ھ میں نواب خلد آشیاں کی وفات کے آٹھ دن بعد ۹۴ سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ انھیں سفر و شطرنج کا بہت شوق تھا۔ ارمغان معنی (صفحہ ۸۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے

حیا کے دیوان کا دیباچہ بھی لکھا تھا گلستان سخن (۲۰۷) اور خمخانہ (۲/ ۵۱۰) میں ان کا حال تفصیل سے درج ہے۔

(۲) ان صاحبزادی کا نام اور ان کے والد کا نام اگلے خط میں خود میرزا صاحب نے لکھ دیا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ نواب احمد بخش خاں کے بھائی کا نام نبی بخش خاں تھا، اور یہ کہ ان صاحبزادی کے نانا حزیں اخترونی اور نانی ایک مسلمان بی بی مبارک بیگم نامی تھیں۔ مبارک بیگم نے بازار سرکی والان (قاضی حوض، دہلی) میں ایک سنگ سرخ کی مسجد بھی بنائی تھی۔ جو سنہ ۱۲۳۸ھ (۱۸۲۲ء) میں بن کر تیار ہوئی اور آج تک "لال مسجد" کے نام سے مشہور رہے۔ (ذکر غالب: ۴۰، بحوالہ واقعات دارالحکومت دہلی ۲: ۳۲۹)

ص ۷۳

(۱) اس عریضے کے لفافہ پر سہواً ۲۹ اگست درج ہو گیا ہے جبکہ ڈاک خانہ کی مہر میں بھی ۱۹ ہی درج ہے۔ نواب خلد آشیاں نے ۲۶ ربیع الثانی سنہ ۱۲۸۴ھ (۲۸ اگست سنہ ۱۸۶۷ء) کو جواباً تحریر فرمایا: "..... چونکہ مفادہ بہجت طراز سے منشای خاص آپ کا بخوبی منکشف نہوا، اسواسطے حوالہ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے، کہ آپ خلاصۂ مکنون خاطر محبت مظاہر سے مطلع کیجے، کہ بمقتضائے انضباط و روابط موالفت قدیمہ جو بات کہ ممکن ہوگی، وہ ظہور میں آئیگی۔ خاطر جمع رکھیے۔

(۲) ذکر غالب (ص ۴۳) میں ان کا نام خورشید بیگم لکھا ہے۔ اگر یہ اطلاع درست ہے، تو غالباً خورشید بیگم عرف ہوگا

(۳) اس عریضے کے جواب میں نواب خلد آشیاں نے تحریر فرمایا: "..... چونکہ آن مشفق مقداد مصارف شادی مجوزۂ خود تحریر نمودہ اند، لہذا حوالۂ خامۂ محبت نگار میشود، کہ اول از تعداد مصارف شادی مطلع فرمایند کہ بعد دریافت آن درین خصوص تجویز مناسب بعمل خواہد آمد۔ چرا کہ بمقتضای موالفت و اتحاد قدیمہ راقم را خوشنودیٔ آن مہربان در امور مناسبہ مدنظر است..... المرقوم ۱۸ جمادی الاولی سنہ ۱۲۸۴ ہجری مطابق ۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۷ء"

ص ۷۴

(۱) سلطان سنجر بن ملک شاہ سلجوقی سنہ ۵۱۱ھ (۱۱۱۷ء) میں بادشاہ ہوا، یہ بڑا اولوالعزم اور صاحب جود و کرم بادشاہ تھا۔ اگرچہ آخری معرکوں میں ناکام رہا، لیکن اس کی ابتدائی حکومت فتوحات کی وسعت کی وجہ دولت تاریخ کا روشن باب ہے۔ با علم و ہنر اور شعر و سخن کا بھی بڑا قدر دان اور مربی تھا۔ رشید و طواط۔ اور انوری وغیرہ اس کے دربار کی شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ اس نے کاشانۂ انوری کو اپنی قدوم میمنت لزوم سے دو بار شرف بخشا۔ آخر میں ترکمانوں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا تھا۔ وہاں سے بدقت آزاد ہوا تو ۱۱ ربیع الثانی سنہ ۵۵۲ھ (۱۱۵۷ء) کو دست قضا نے پکڑ لیا۔

(۲) شاہجہاں ہندوستان کے مغل سلاطین کا پانچواں حکمران تھا۔ ۲۹ ربیع الاول سنہ ۱۰۰۲ھ (۱۵۹۳ء) میں لاہور میں پیدا ہوا۔ ۲۵ سال کی عمر میں سنہ ۱۰۳۷ھ (۱۶۲۷ء) میں اپنے والد جہانگیر کے انتقال کے بعد مسند حکومت پر قدم رکھا، اور سنہ ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) میں اپنے لڑکے عالمگیر اورنگ زیب کے حق میں تاج و تخت ہند سے دست بردار ہو کر آگرے کے قلعہ میں جا بیٹھا۔ وہیں اسی کی آبادی ہوئی ہے۔ یہ بڑا سخی داتا اور شہرۂ آفاق قدردان علم و ہنر بادشاہ گزرا ہے۔ دلی کی مسجد جامع اور لال قلعہ، اور آگرے کے عدیم النظیر روضۂ تاج محل کا بانی ہے۔ اس کی قدردانی اور قدر افزائی کا یہ عالم تھا کہ قدسی کو ایک قصیدے کے صلے میں روپیوں سے تلوا دیا۔ کلیم ہمدانی نے تخت طاؤس پر جلوس کی مبارکباد میں قصیدہ پیش کیا، تو اُسے بھی روپیوں سے تلوا دیا۔ یہ حسن اتفاق تھا کہ دونوں ساڑھے پانچ ہزار روپیوں سے بھر نکلے۔ قدسی کو دو بار خلعت اور دو ہزار روپے عطا ہوئے۔ کلیم کو جشن وزن شمسی کی تقریب میں ۱۰ ہزار روپے کا صلہ عطا کیا۔ بعض شاعروں کے منہ ہیرے اور موتیوں سے بھر دیے

اس نے آگرے میں سنہ ۱۰۷۶ھ (۱۶۶۵ء) میں وفات پائی اور تاج محل میں اپنی بیوی کے برابر مدفون ہوا۔

(۴) اس عریضے کی تاریخوں میں میرزا صاحب سے سہو ہوا ہے۔ دراصل انھیں سنہ ۱۲۸۴ھ اور ۱۸۶۷ء لکھنا چاہیے تھا۔ اسی طرح انگریزی مہینے کا نام بھی بھول گئے ہیں۔ البتہ لفافے کی تاریخ میں ۱۰ دسمبر انگریزی لکھا ہے۔ (۲۳ نمبر سنہ ۱۸۶۷ء)۔ لفافے کی پشت پر میر منشی صاحب کا نوٹ ہے "پیش نمودہ شد۔ ہنوز حکم تحریر جواب صادر نشد۔ ۲۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۸ء"۔

صـ۷۵

(۱) اس عریضے کے جواب میں لکھا گیا تھا: "مشفقا! فی الحقیقت مزاج راقم از مرکز اعتدال منحرف شدہ بود و حالا ہم طبیعت خوب صاف نیست و تجویز استعمال مسہلات و پرہیز ۲۹ اکتوبر سنہ ۱۸۶۷ء"...

(۲) طبع اول کے وقت یہ قطعہ مثل میں موجود نہیں تھا۔ لفافے کی پشت پر میر منشی صاحب کا نوٹ تھا: "پیش نمودہ شد۔ حضور پر نور بعد ملاحظہ قصیدہ حوالۂ منشی امیر احمد صاحب فرمودند۔ ۹ نومبر سنہ ۱۸۶۷ء" مگر چونکہ طباعت سے پہلے، کلیم رامپوری مرحوم سے میرزا صاحب کا کلی اصل قطعہ تحریر کر آخر میں شامل کر دیا گیا تھا۔ اب اُسے اپنی جگہ پر درج کیا جاتا ہے۔ نواب صاحب نے ۱۰ نومبر سنہ مذکور کو قطعے کی رسید میں تحریر فرمایا: "... مفاد مضامین المعاودہ مع یک قطعہ بمضامین نو و طرز نادر رنگ افروز چہرۂ وصول گردید۔ واز ملاحظہ مضامین نوش انشراح دل بحصول انجامید"۔

صـ۷۷

(۱) لفافے پر تحریر ہے، "پیش نمودہ شد۔ حکمی صادر نگردید۔ ۲۰ نومبر سنہ ۱۸۶۷ء"

(۲) اس مثل میں محمد حسن خاں مالک اخبار دبدبۂ سکندری کی رسید خامل ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار اخبار کی قیمت کے میرزا صاحب کی اکتوبر کی تنخواہ میں سے مجرا کر کے انھیں دیے گئے تھے۔

صـ۷۸

(۱) سرکار کا یہ زبانی ارشاد غالباً کسی درباری کے توسط سے میرزا صاحب تک پہنچا تھا۔ تاہم کسی فرمان میں اس کا ذکر نہیں ہے۔

(۲) اس عریضے کے لفافے پر میرزا صاحب نے یکشنبہ دوم رمضان و ۲۹ دسمبر لکھا ہے۔ نواب خلد آشیاں نے جواباً ۱۰ رمضان سنہ ۱۲۸۴ھ (۶ جنوری سنہ ۱۸۶۸ء) کو جو فرمان تحریر فرمایا ہے، اُس میں میرزا صاحب کے اصل مدعا کا کوئی تذکرہ نہیں۔

صـ۷۹

(۱) اس قطعے کے ساتھ مثل میں کوئی عریضہ منسلک نہیں ہے، غالباً یہ بلا عریضہ ارسال ہوا تھا۔ لفافے پر انگریزی تاریخ ۲۴ جنوری سنہ ۱۸۶۸ء تحریر ہے۔ اس قطعے کی رسید میں نواب خلد آشیاں نے ۱۰ شوال سنہ ۱۲۸۴ھ (۵ فروری سنہ ۱۸۶۸ء) کو تحریر فرمایا: "قطعۂ مبارکباد عید الفطر بطرز دلفروز مضامین شرف افزا موصول گشتہ سازِ برگ فرحت و انبساط افزود"۔

صـ۸۰

(۱) عریضے کے لفافے پر دوشنبہ نہم مارچ سنہ ۱۸۶۸ تاریخ درج ہے۔

(۲) عریضے میں کاتب کا نام اور تاریخ کتابت دونوں درج نہیں۔ لفافے پر میرزا صاحب نے ۱۱ اپریل سنہ ۱۸۶۸ء تحریر کیا ہے، جو درست نہیں ہے اولاً اس لیے کہ ڈاک خانے کی انگریزی مہر میں ۱۱ مئی درج ہے، ثانیاً اس لیے کہ اس عریضے میں تنخواہ اپریل کی اطلاع دی ہے، اور یہ مسلم ہے کہ اپریل کی تنخواہ اپریل میں

نہیں ملتی، مئی میں ملتی ہے۔ اس لیے اس کی ۱۱ مئی سنہ ۶۸ء کا ہونا چاہیے۔

(۴) میرزا صاحب نے سہواً سنہ ۱۸۶۷ء لکھ دیا ہے، صحیح تاریخ ۲۷ مئی سنہ ۱۸۶۸ء ہے؛ اس لیے کہ اولاً تو جون سنہ ۶۸ء کے نوشتہ عریضے میں اس کی رسید طلب کی ہے، اور اُس میں اس خط کو "سابق کا عریضہ" لکھا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں عریضوں کے درمیان کسی تیسرے عریضے کا فصل نہیں تھا، ثانیاً اسی عریضے کے لفافے کی پشت پر میر منشی صاحب کا حسب ذیل نوٹ ہے: "تصویر بعد ملاحظہ سپرد سید مجاور علی صاحب شد ۲ جون سنہ ۱۸۶۸ء"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ واقعہ سنہ ۶۸ء کا ہے۔ اگر سنہ ۶۷ء کا ہوتا تو اسی سال میرزا صاحب تقاضائے رسید کرتے، اور اُسی وقت سرکار یہ تصویر ملاحظہ فرما کر سید مجاور علی صاحب کو دیتے۔

ص ۸۱

(۱) نواب صاحب نے جوابی فرمان مورخہ ۷ جولائی سنہ ۶۸ء میں تحریر فرمایا ہے: "شبیہ آن مشفق وصول شادمانی آورد۔ از فرط محبتہا متصور نشد"۔ اس تصویر کے علاوہ میرزا صاحب نے جہاں جہاں اپنی تصویریں بھیجی تھیں، اُن کے لیے اردوئے معلی (ص ۲۰، ۲۳، ۳۴، ۱۲۶، ۲۳۷، ۲۴۷) ملاحظہ ہو۔

(۲) اس عریضے میں صرف (طالب غالب) میرزا صاحب کے قلم کا لکھا ہوا ہے نیز کاتب نے بجائے دلجمعی کے دلجمی لکھا ہے۔ اس پر غالباً میرزا صاحب کی نظر نہیں پڑی۔

(۳) مظفر حسین خاں بہادر، ابن حکیم الدولہ حکیم علی حسین خاں بہادر لکھنوی نواب خلد آشیاں کے مصاحب تھے۔ ان کے والد مسیح الدولہ شاہ اودھ کے طبیب خاص تھے۔ سلطنت اودھ کی بساط اُلٹ جانے کے بعد یہ خاندان بھی ترک وطن پر مجبور ہوا۔ رامپور میں اس زمانے میں صاحبان علم و ہنر کا ملجا و ماوی تھا۔ مظفر حسین خاں اور ان کے بھائی احسان حسین خاں نے بھی سنہ ۱۸۶۷ء میں اُس دربار کا قصد کیا۔ نواب خلد آشیاں نے ان دونوں کی کماحقہ قدر و منزلت کی۔ مسیح الدولہ صاحب علم اور ایک نہایت عمدہ ذخیرہ مخطوطات و مطبوعات کے مالک تھے، جو ان کے انتقال کے بعد ان کے دونوں بیٹوں کو وراثت میں ملا۔ نواب صدر یار جنگ بہادر کی ایک تحریر سے معلوم ہوا کہ مولانا شبلی نے یہ کتاب خانہ دیکھا تھا اور وہ اس کی جامعیت اور ندرت کے بہت معترف تھے۔ مظفر حسین خاں سے نواب صاحب نے اس ذخیرہ کا ایک معقول حصہ خرید کر سرکاری خزانۂ کتب میں شامل فرمایا تھا۔ ان کتابوں پر مظفر حسین خاں کے دستخط ثبت ہیں، اور متعدد نسخوں پر جابجا حواشی بھی پائے جاتے ہیں، خود ان کے اپنے مصنفہ متعدد رسالے بھی کتب خانے میں موجود ہیں۔ یہ عربی زبان میں فلسفہ و حکمت پر لکھے گئے ہیں میرزا صاحب سے ان کے روابط تھے۔ جب یہ رامپور آئے، تو میرزا صاحب نے منشی سلیچہ سے ان کی درباری قدر و منزلت کے متعلق استفسار کیا تھا۔

احسان حسین خاں نے ۵ رجب سنہ ۱۲۷۹ھ (۱۸۶۳ء) کو کربلائے معلی میں انتقال کیا (کلیات میرزا ص ۵۷۶) اور مظفر حسین خاں سنہ ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں فوت ہوئے۔ (ایضاً: ۵۷۶)

ص ۸۳

(۱) لفافے کی پشت پر لکھا ہے: "پیش نمودہ شد، ہنوز حکمی صادر نگردید ۲۳ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ء"۔

ص ۸۴

(۱) اس عریضے کے لفافہ پر ۱۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ درج ہے، حالانکہ ڈاک خانے کی مہر کے اندر بھی ۱۷ تاریخ ہی مندرج ہے۔ اس سے یقین ہوتا ہے کہ سہواً لفافے پر ۱۵ دسمبر لکھا گیا ہے۔ لفافہ کی پشت پر نوٹ ہے: "پیش نمودہ حکم صادر نشد۔ ۲۰ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ء"۔

(۲) اصل میں ۵۸ء لکھا ہے۔ اور لفافہ پر دہم جنوری سنہ ۱۸۶۹ء تحریر ہے۔ یہ میرزا صاحب کی آخری

تحریر ہے۔ حسین علی خاں کے مراسلے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضوری کی تنخواہ ۱۵ فروری کو میرزا صاحب کے انتقال سے ایک گھنٹہ قبل پہنچی تھی؛ اس لیے اس کی رسید اپنے قلم سے نہ لکھ سکے۔ سوئم کے روز حسین علی خاں نے سرکار کو میرزا صاحب کے انتقال کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا: "بتاریخ ۱۵ فروری سنہ حال، مطابق ۱۲ ذیقعدہ روز دوشنبہ، وقت ظہر، جناب دادا جان صاحب قبلہ نواب اسد اللہ خاں غالب عرف میرزا نوشہ صاحب اس جہان فانی سے رحلت کی۔ فدوی کچھ عرض نہیں کر سکتا کہ کس قدر رنج والم اس سانحۂ جانگزا و جگر خراش سے لاحق ہوا ہے۔ اور نیز جناب دادی صاحبہ معظمہ کا حال اس رنج سے عالم بیکسی میں ایسا ہو گیا ہے کہ گزارش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ حضور کا نوازشنامہ مع ہنڈوی یک صد روپیہ بابت تنخواہ جنوری سنہ ۶۹ء مگہ ۱۵ فروری کو ایک گھنٹہ پہلے انتقال دادا جان صاحب سے شرف صدور لایا تھا۔ رسید ہنڈوی اسطے اطلاع حضور کے عرض کی گئی۔"

فروری کے چودہ دن کی تنخواہ کی رسید مہری حسین علی خاں ۱۱ مئی سنہ ۶۹ کو نامہ بر دہ نے دہلی سے ڈاک میں روانہ کی تھی۔ یہ بھی حسین علی خاں کے خطوط کے فائل میں منسلک ہے۔ مگر ان کے مکتوب بنام سیلیجز سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۶ ماہ مذکور تک تنخواہ کی ہنڈوی انھیں نہیں ملی تھی۔ ۲۱ صفر سنہ ۱۲۸۶ھ کے ایک خط سے پتا چلتا ہے کہ اس تاریخ سے قبل رقم یہاں سے بھیجی گئی تھی۔ یہ تاریخ ۲ جون سنہ ۱۸۶۹ء کے مطابق ہے۔ حسین علی خاں نے اپنے ۱۲ جون کے مراسلے میں اس کے وصول پانے کا ذکر کیا ہے۔

ص ۸۷

(۱) خط کے لفافے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب نے ۲۴ تاریخ کو اسے لکھ لیا تھا، اور یہ ارادہ تھا کہ ۲۵ کو پوسٹ کرائیں گے، اس لیے ۲۵ مارچ تاریخ لکھدی تھی۔ لیکن بعد ازاں از راہ عجلت ۲۴ ہی کو ڈاک میں ڈلوا دیا۔ اصل عبارت یہ ہے: "در شہر رامپور موصول و بدست نواب صاحب مشفق و مکرم منظر لطف و کرم نواب زین العابدین خانصاحب عرف کلن میاں سلمہ اللہ تعالیٰ مقبول باد۔ از غالب بیرنگ۔ مرسلہ ۲۵ مارچ ۱۸۵۸۔ ضروری۔ جواب طلب و شتاب طلب ۱۲ چون عجلت در ارسال مکتوب می بالیست، بہم روز چہار شنبہ آخر روز ۲۴ مارچ نوشتہ شد۔"

(۲) یہ خط میرزا صاحب نے زین العابدین خاں کے اصل خط کے حاشیے پر نقل کر کے منشی سیلیجز صاحب کو بھیجا تھا۔ زین العابدین خاں کے خط کی عبارت یہ ہے: "نواب صاحب مشفق مہربان، کرمفرمای دوستان، مجموعۂ خوبیہای بیکران، سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد سلام مسنون، و اشتیاق ملاقات مباہجت مشحون، یہ چند حرف ریزے بھیجکر تکلیف دیتا ہوں کہ نگاہ گوہر بیخ سے ملاحظہ کر کے اغلاط محاورات و تراکیب، و سستی بندش، و تعقیدات صوری و معنوی، و تنافر الفاظ، و ابتذال مضامین، جس جگہ واقع ہو مطلع فرمایئے تا امر مستفسر صابق میں صدور مہربانی نامہ نامی نے خلجان رفع کیا۔ جواب اس کا بھی اگر جلد عنایت ہو، بعید ارتباط دیرینہ سے نہ ہوگا۔ زیادہ شوق دلیں۔ فقط۔ نگاشتہ دہم ماہ مارچ سنہ ۱۸۶۵ء) مقام جیپور۔"

ص ۸۸

(۱) یہ خط دیوان جیتاب کے ورق ۴۸ الف کے حاشیے پر میرزا صاحب نے لکھا ہے۔ اس کے آخر میں تاریخ نہیں ہے۔ لیکن دوسرے خط کی تاریخ سے یقین ہوتا ہے کہ نومبر سنہ ۱۸۶۶ء سے قبل کا مکتوب ہے۔

ص ۹۵

(۱) یہ خط دیوان کے آخری سادہ صفحے پر میرزا صاحب نے لکھا ہے۔

ص ۱۰۹

(۱) یہ خط نواب فردوس مکاں کے غسل صحت کی تاریخ کے متعلق لکھا گیا تھا۔

(۲) منشی صاحب نے میرزا غالب کے مکتوب مورخہ ۲۵ دسمبر سنہ ۶۴ء کے جواب میں، جو خط تحریر کیا تھا، اس میں ذکر ماہ جشن کے بعد درخواست کی تھی کہ "ایک مادہ تاریخ کا فدوی نے نکالا ہے۔ سو عرض کرتا ہوں امیدوار ہوں، کہ اس کے دو شعر موزوں فرما کر عنایت نامہ سوسہ فدوی کے میں عنایت فرمایئے:۔

"کانکہ سرا عدا عرق کرد ز اے منشی بیندگان عالی کا آج غسل صحت ہو"

اس شعر کا مصرع ثانی مادۂ تاریخ ہے۔ چونکہ اس کے اعداد ۱۸۶۶ ہوتے ہیں، اس لیے ایک عدد کا تحزجہ کیا گیا ہے۔ فقرہ (کانکہ سرا عدا) بتاتا ہے، کہ اگر سرا عدا یعنی حرف الف کے عدد کو، جو ایک ہے، مادۂ تاریخ میں سے کم کر دیا جائے، تو اعداد مطلوبہ ۱۸۶۵ حاصل ہو جائیں گے۔ چونکہ یہ قاعدۂ تاریخ گوئی کے عین مطابق ہے، اس لیے تعجب ہے، کہ میرزا صاحب نے اس پر کیوں اعتراض کیا۔

(۳) قصیدۂ تہنیت عربیہ نمبر ۴۴ کے حاشیے میں درج ہے۔

(۴) شاہ کبیر الدین صاحب کا پتا نہیں چل سکا۔

(۱) زین العابدین خاں کا خط میرزا صاحب کے مکتوب (۱۲۰) کے حاشیے میں نقل ہو چکا ہے۔

(۲) عربیہ نمبر ۴۲ مراد ہے۔

(۳) یہ عربیہ کلیات نثر فارسی میں شامل نہیں۔ اغلب یہ ہے، کہ یہاں سے نقل بدد انا نہیں کی گئی۔

(۴) اس کے آخر میں میرزا صاحب نے اپنا نام اور تاریخ کتابت کچھ نہیں لکھا ہے پشت ورق پر کسی اہلکار دارالانشا نے یہ عبارت لکھی ہے: "قصیدہ ہای ثنا گستران مرسلہ مرزا نوشہ صاحب ۲۹ رجب سنہ ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۹ دسمبر سنہ ۱۸۶۵ء" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دسمبر سنہ ۱۸۶۶ء کی ۱۵ یا ۱۶ کو میرزا صاحب نے یہ خط لکھا ہوگا۔ میرزا صاحب کے خط کا لفافہ موجود نہیں ہے ورنہ تاریخ کا واقعی علم مکمل تھا۔

صفیر بلگرامی میر سید احمد تخلص کے بیٹے ہیں۔ اپنے نانا کے گھر پیدا ہوئے پندرہ برس کی عمر سے شعر گوئی کا شوق تھا۔ لکھنؤ جا کر امان علی سحر کے شاگرد ہوئے۔ بعد ازاں مرزا دبیر کے ساتھ پٹنے گئے، اور مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی کی مشق کی۔ فارسی میں غالب سے تلمذ تھا۔ ۱۳۰۷ھ (۱۸۸۹ء) میں انتقال کیا (خزانۂ عامرہ: ۳۳۹/۵، تاریخ لطیف: ۱۴۳) اس قصیدے کے ہر شعر کا پہلا حرف لیکر ملایا جائے، تو غلام آفریاں کا نام بنتا ہے۔ اسی کا نام صنعت توشیح ہے قصیدہ بصنعت توشیح در مدح نواب مستطاب معلی القاب جناب نواب کلب علی خاں بہادر دام اقبالہٗ دانی رامپور

نوید ساقیٔ رنداں کہ ہے طرب کا طلوع — گذر ٹھہا نے شیشۂ صہبا بلا دے جام سرد
وہ اُٹھا ابر وہ بادل چلے برسنے کو — وہ بیٹھا خاتمۂ رنج و الم بفضل غفور
اوڑھی نقاہتِ نرگس بڑھی وجاہتِ گل — کھلی صباحتِ نسریں کھبی ملاحتِ سوسن
بہار جشن ہی پھولوں کے یہ رنگ ہے آج — ہزار عیش میں ہے وصل گل ہے کل کل دوسرا
مرا بھی خانۂ دل نقشہائے رنگیں سے — کیا ہے صنعتِ معمار طبع نے معمور
سبب نہ پوچھ کہ دل کیوں ہو خانۂ طرب — جہت نہ ڈھونڈھ کہ کیونکر جہت ہیں پر نور
بجے ہو آج مبارک یہ دور دور شراب — بجے ہو آج سزاوار عیش کا مذکور
طرب طرب نہ کہے کھلکے کس لیے نغمہ — کہ آج مسند دولت ہے نور سے معمور
امارت سنج ہو ناز اں کہ زیب مسند ہیں — جناب کلب علی خاں غیور این غیور
بنا یاد در فلک نے زمیں کو رشک ارم — کہ رام پور ہوا ہے تمام دار سرور

(۱) سور بمعنی رنگ سرخ ۱۲ خیاف (۲) گل گل بمعنی کاوکاو ۱۲ برہان

میں اس خوشی میں پڑھوں ایک مطلع رنگیں — کہ جس کے لکھنے کو آئے بیاضِ دیدۂ حور

مطلع

عنایت اُس کی نہ چاہے اگر نظامِ امور — تو میلِ (۱) دیدۂ سلطاں ہو خانۂ دستور (۲)

لیاقتِ ازلی سے ہے سلطنت عالم — ق — جلالتِ ابدی سے ہیں منتشر جمہور

یہ اس لیے ہے کہ ایذا نہ دے کسی کو کوئی — وہ اس لیے ہے کہ ہے ظلم ان کی حد سے دور

اسیرِ دامِ خطِ دست میں ہے دزدِ حنا — جو چور شمع کا گلگیر نے کیا محصور

لوائے عدل ہوا سایہ افگنِ سرِ خلق — ہما کے سایہ کے خواہاں نہیں ہیں اب جمہور

قلوبِ خلق ہیں یوں اوس کے حکم سے معمور — کہ جیسے روح کو ہو انتعاشِ طلعتِ حور

اس انتظام کو دیکھو یہ عدل ہے نایاب — زمیں پر ایک جگہ ہے مقامِ سایہ و نور

بری ہیں درد و غم و رنج سے بتمام قلوب — ہوئے ہیں فرطِ بشاشت سے دل سراسر سرور

جمال و حلم سے امید ہیں غنی و فقیر — جلال و رعب سے دہشت میں قیصر و فغفور

نہیب عدل اگر روکے قلمِ حادثہ کو — بری ہو نامِ یتیمی سے گوہرِ منشور

اشارہ ہو جو ذرا عدل و قہرِ اقدس کا — کلف ہو ماہ سے زائل تو آفتاب سے نور

بلندِ عدل کا پایہ ہوا یہ اون کے سبب — ق — کہ اب ہے فکرتِ کیواں پہنچنے سے معذور

ثباتِ اون کی کرے آسکے ہاں اگر کیواں — یقین اتنا تو ہے بعد انقضائے دہور

وہ پہنچے زینۂ اول پہ عدل کے لیکن — جو اور قصد پہ ہو گام سنج، کیا مقدور

اڈھائے چوب ادب سر پہ اسکے شعبۂ رعب — بٹھائے مہر جلالت کے سایہ میں اوسے حور

برایت اس کو برایا کی دسبدم ملحوظ — رعایت اوسکو رعایا کی رات دن منظور

کسی کا رنگ بگاڑے نہ کوئی باہر دخل — نہ لے سیاہیٔ فلفل سفیدیٔ کافور

لبِ شکایت و فریاد کیوں نہ بند رہیں — مقامِ امن میں ہیں رات دن و خواب و طیور

بندھے ہیں ایک ہی رسی میں ظلم و فتنہ و شر — کہ روزِ شحنۂ انصاف اس پہ ہے مامور

علوِ جاہ و مراتب میں گرد ہے دارا — تو شان و جلالت میں ہیچ ہے فغفور

لکھوں وہ مطلعِ رنگیں میں اب سراپا میں — کہ آب آب سراپا ہو جس سے ابرِ دے حور

مطلع

بہ خالِ درخ ہے کہ ہے اتصالِ ظلمتِ نور — کہ جس طرح ہے بہم ربطِ فلفل و کافور

خدا نے حسن دیا حسن پر ریاست دی — وہ آفتاب کا جلوہ یہ ماہتاب کا نور

اسی طرح کا ہے بلبل ترے گلوں میں رنگ — یونہی ہے سرو میں قمری جمالِ قد کا ظہور

نمودِ خط نے کیا حسنِ خط کو روز افزوں — جہاں میں دیکھی سواد و بیاضِ دیدۂ حور

صباحتِ رخ و کیفیتِ ملاحتِ خال — بہم ہوئیں تو بڑھا ذوقِ دیدۂ جمہور

الف ہے بینیٔ روشن مگر امارت کا — یہی الف سرِ اقبال کا ہے تاجِ سرور

حسینِ رشکِ قمر نوجواں جواں دولت — شجاع بازوئے دوراں بلند قدر و رسور

یہا ئی آبِ گہر آب و تابِ دنداں نے — صدف کا گھر ہوا تاراجِ سیلِ تلزمِ تور

بھلا ہو لعل کہاں لب کے رنگ پر سرسبز — تری نظر کا ہے اے جوہری صریحِ قصور

(۱) میل کشیدن بسوی کسے کردن = برہان (۲) بقیہ در زیر ۱۲

ہوا ہے مطلعِ تازہ کا پھر مجھے سودا — مخاطب اون سے ہوں باطن میں ظاہر اون ہو

مطلع

اگر حضور کو ہو پرورش ذرا منظور — دُرِ یتیم کو ہر گز نہ کوئی دیکھے عور
دکھائیں پائے طلب سے جگا کے روزِ نشاط — اگرچہ طالعِ خفتہ ہو خواب سے مخمور
رہے خیالِ کرم میں حضور کے جو کوئی — تو اوس کے مطلبِ خاطر کا غیب سے ہو ظہور
دیا ہے آپ کو حق نے وہ دل کہ صورتِ ابر — قریب اوس سے ہے سیراب فیضیاب ہر دور
اگرچہ دور رہوں میں آستانِ دولت سے — مگر حضور کے الطاف کا اگر ہو صدور
مجھے ہو دور قریب اور قریب عزت ہو — رہوں ہمیشہ میں انعام و لطف سے مشکور
اگرچہ مجھکو ہے مشکل یہ منزلت پانی — کہ مدح خواں ہوں زمانہ میں آپ کا مشہور
قلم کو میرے نہیں آج تک یہ راہ ملی — سخن ہے میرے نہیں پایا مدح کا دستور (۱)
بندھے ہیں لب مرے گویا ہے مہرِ خاموشی — ہزار گنج سخن اور طبعِ سنج مری (۲)
اشارہ چاہتی ہے طبعِ مدح سنج مری — کہ تا بحشر ہو جس کا جہان میں مذکور
لکھوں وہ مدح کہ جو یادگارِ عالم ہو — پڑھوں قصیدہ وہ جس سے حضور ہوں مسرور
ہوا ہے کیا تجھے کلکِ صفیرِ مدح سرا — نہیں ہے مدح سراؤں کا یہ کہیں دستور (۳)
وہ آفتاب ہے تو ذرہ کیا ہے مدح تری — ہزار تجھ سے ہیں مدحت سرا قریبِ حضور
اگر کرم ہو انہیں کا تو ہاں کہوں میں بھی — کہ تجھکو بخت پر اپنے ہے کبر و ناز ضرور
ہے اب دعا کا عمل ہے اوٹھا دے دستِ دعا — کہ طبع ہوتی ہے آمین کہنے پر مامور
یہ آفتاب ہے جب تک فلک پہ جلوہ فروز — یہ ماہتاب ہے جب تک زمیں پہ قاسمِ نور
رہے حضور سے اقبال کو ترقی روز — بڑھے حضور کی عمر اور جاہ و سرور و سرور
الٰہی میری دعا یہ قبول کر لینا — بحق احمد و آلِ رسولِ پاک و طہور (۴)
مری ہو مدح پسندِ طبیعتِ عالی — لکھوں انہیں کی ثنا میں جواب لکھوں میں ملور
پڑھوں مدام قصاید لکھوں دوام ثنا — یہیں سے مدح سرا ہوں باہتزاز و سرور
وہ شہر شہر میں مشہور ہوں مرے ممدوح — میں شہر شہر میں مداح اون کا ہوں مشہور
رہیں وہ مسندِ دولت پہ جلوہ گر دائم — ہوں میں مدح سرائی پہ رات دن مامور

خواجہ عالی مرحوم خواجہ ایزد بخش کے بیٹے اور بانی پت کے رہنے والے تھے۔ سنہ ۱۸۳۲ء کے قریب پیدا ہوئے۔ عربی و فارسی کی تحصیل کے ساتھ شعر و سخن کا بھی مشغل جاری رکھا۔ میرزا غالب کے قابل فخر شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ یادگارِ غالب، حیاتِ جاوید، مسدسِ حالی وغیرہ ان کی تصنیفات ہیں۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں انتقال کیا۔ یہ قصیدہ اُن کے کلیات میں موجود نہیں ہے۔ میرزا صاحب نے انہیں پانی پت کا سہو لکھ دیا ہے۔

حاشیہ بوسانِ بساطِ فیضِ مناط، حضرت نواب کیوان جناب، جہاں مطاع، جہانیان مآب، دام اقبالہٗ

بموقعِ عرض میرزا شاگرد

بعد گذارشِ مراتبِ عجز و انکسار و تقدیمِ آدابِ تحیت و ثنا معروض چند خامۂ از آہنگ بر می گشت ہر چند سامعہ خراش است اما شنیدنی دارد۔ دوش در عالمِ سرخوشی خیال بتی چند تازی زبان و مدح بندگانِ حضور ترتیب میداد۔ ناگاہ دلِ سودا زدہ بمنازعت برخاست و گفت "چیست کہ از چار سو ردی در ہم کنید و مسند نازِ برآستانہ فرود کوبید؟ مگر با ملازمانِ درگاہ سابقہ معرفتی داشتہ باشی؟" گفتم "در میانہ ثناء و گدا معرفت چگونہ؟ قاند مخلصید؟" گفت

(۱) یعنی اجازت ہے (۲) خزانہ دار ہے (۳) یعنی قاعدہ و طریقہ (۴) یعنی پاک و خیاف

"پس حلقہ کوبی، دیر و دولت بچہ نسبت راست آید؟" نشنیدہ کہ گفتہ اند ؎ دیر میرد و زیر دسلطان را، بی وسیلت گرد پیرامن" ؎ گفتم "آنجا کہ کرم عمیم است بیگانہ حکم آشنا دارد" گفت "دارم کہ چون از سند آمدائی بندگان حضور قصیدۂ متضمن مدح حضرت فردوس مکان بوسائط بعضے از اعیان حسن پور گذارش کردہ و دار آنجا نوید قبولی ہم تو نرسیدہ" تا بصلہ و انعام چہ رسد۔ اکنون بکدام توقع ایہم شاہ ماں بودہ؟" گفتم "نصرت یار اگر آگاہ نہ از دخول عرب ؎ کم نرک الاول للآخر" گفت "نہ ترا فضلے مشہور نہ ذکرے سائر۔ سخن چونکہ تمامی یابد التفات چہ آرزو؟" گفتم "در مذہب من حرام است ستائش کسی کہ از شہرت متکلم سخن کلام و ارسد و از سخن مثال پی برد" گفت "آخر غرض این مدیحہ سرائی چہ خواہی؟" گفتم "خواہم پنج خواہم" گفت "از طلب مجہول مطلق چہ خیزد؟" گفتم "کار یار و شغل غمیری است کہ گفتہ و ناگفتہ بپذیرش یکی است" گفت "نعم، اما از اظہار مدعا چہ حاصل نماید؟" گفتم "سائل را زیان دارد" گفت "چگونہ؟" گفتم "ہمت ممدوح بلند ترازان است کہ آرزوی سائل بدان تواند رسید" گفت "اگر ہمین است، بچہ نوع از یارمت موزع بسکدش خواہی شد؟" گفتم "ہمت این دو مرجع ؎ شکر بجا آرد کہ مہمان تو بہ دنیای خود بخواہد خواہان تو" گفت "چور فارسی و اردو ہم قدرت نظم و نثر باندازۂ بالبست و اشتہ" ترا چہ افتاد کہ صعب را بر ذول اختیار نمودی، و خود را گداش دو دیگران را گداش بر کاوش افزودی؟" گفتم "ملاحظۂ فضل و شرف ذات ممدوح نگاشت کہ مکارم اخلاقش فرہ بہ اشرف لغات و افضل السنہ معمور کردہ خود فضل عربی بر سائر السنہ چنانکہ دانی محتاج بیان نیست۔ القصہ چون سخن بدینجا کشید دل را بہ گفتگو باقی نماند۔ گفت "ایہہ کہ گفتی عین صواب است۔ اما اگر دعا باندازۂ ہمت ممدوح خواہند چہ جواب خواہی داد؟" گفتم "یک بیت خود ازین عمدہ بروں آیم ؎ بقدر شوق نتوان دعا کرد۔ الٰہی ہر چہ طبعش خواہد آن باد!"

مرثیہ و ماگو، صفر الدین الطاف حسین مفہم دہلی متصل حوض قاضی

مکان حکیم احسن اللہ خان

فَازَ الزَّمَانُ بِمَالِهٖ ۔۔۔ مِنْ جَزْلِهٖ وَزِبَالِهٖ
سَاغَ التَّفَاخُرُ بِالْعُلٰی ۔۔۔ لِشَرِيْفِهٖ وَرَذَالِهٖ
لَزِمَ التَّعَفُّفُ قَانِعًا ۔۔۔ مَنْ كَانَ مِنْ سُؤَالِهٖ
نَالَ ابْنُ يُوْسُفَ نَوْلَهٗ ۔۔۔ بِالْخَلْقِ دُوْنَ سُؤَالِهٖ
مِطْوَاعُ شَرْعِ الْمُصْطَفٰی ۔۔۔ بَحْرًا مِهٖ وَجِلَالِهٖ
لَا مَيْلَ فِيْ اَحْكَامِهٖ ۔۔۔ لَا مَيْنَ فِيْ اَقْوَالِهٖ
لَا حَجْرَ فِيْ اِنْفَاقِهٖ ۔۔۔ لَا حَصْرَ فِيْ اَمْوَالِهٖ
اَلْحُسْنُ مِنْ اَخْلَاقِهٖ ۔۔۔ وَالْخَيْرُ مِنْ اَفْعَالِهٖ
اَلْفَقْرُ تَحْتَ لِوَائِهٖ ۔۔۔ وَالنَّصْرُ حِلْفُ قِتَالِهٖ
اَلْحَقُّ اِسْمُ قَضَائِهٖ ۔۔۔ وَالصِّدْقُ عَيْنُ مَقَالِهٖ
اِنْ شِئْتَ تَعْرِفُ مَا التُّقٰی ۔۔۔ فَانْظُرْ اِلٰی اَعْمَالِهٖ
اِنْ رُمْتَ تَدْرِیْ مَا النُّهٰی ۔۔۔ فَارْقُبْ مَجَارِیْ حَالِهٖ
يَكْرِی الْمُنٰی مُتَبَايِعًا ۔۔۔ بِعَطَائِهٖ وَسِجَالِهٖ
يَرْقَی الْعُلٰی مُتَنَاهِيًا ۔۔۔ فِیْ فَضْلِهٖ وَكَمَالِهٖ
يُغْنِی الْوَرٰی وَيُمِيْنُهٗ ۔۔۔ بِجَمَالِهٖ وَجَلَالِهٖ
يُرْوِی الْغَلِيْلَ بِلَفْظَةٍ ۔۔۔ يَغْمُرُ الرَّوٰی فِیْ قَالِهٖ
يَشْفِی الْعَلِيْلَ بِلَحْظَةٍ ۔۔۔ طُوْبٰی لِصَبٍّ قَالِهٖ

بِالْحَدْسِ فَاقَ اُولِی النُّهٰی فَامْتَازَ عَنْ اَمْثَالِهٖ
مَا مِنْ مُحَالٍ مُّمْکِنٌ اِلَّا عَلٰی اَسْتَدْلَالِهٖ
لَا کُلُّ قَصْدٍ وَاقِعًا اِلَّا الَّذِیْ فِیْ بَالِهٖ
یَغْزُوْ وَنَصْرُهٗ رَبَّنَا بِیَمِیْنِهٖ وَشِمَالِهٖ
یُفْنِی الْعِدَاۃَ کَاَنَّهٗ لَا عَوْذَ مِنْ مِّرْسَالِهٖ
وَکَاَنَّمَا اَجْنَبَ الرَّدٰی مَنْ رَّامَ مِنْ اِرْعَالِهٖ
کَمْ طَلْعَةٍ نَجْلُوْ الْاَسٰی مِنْهَا بِرَغْمِ جَمَالِهٖ
کَمْ لَهْجَةٍ تَشْفِی الْجَوٰی مِنْهَا هَدِیْرُ مَقَالِهٖ
اِذْمَا یُبَارِزُ لِلْوَغٰی فَالنَّصْرُ مِنْ عُمَّالِهٖ
وَمَتٰی یُفِیْضُ عَلَی الْوَرٰی فَاللّٰهُ بَاقِیْ مَالِهٖ
کَمْ سَائِلٍ یَسْطُوْ بِهٖ ثِقَةً بِحُسْنِ فَعَالِهٖ
لَوْلَا الظُّنُوْنُ مَعَ الْحِجٰی لَابَیْتَ کَوْنَ مِثَالِهٖ
لَزِمَ الْعَنَاءُ حَسُوْدَهٗ لَا مَرْحَبًا بِعُضَالِهٖ
مَنْ لَّا اَرَادَ بَقَائَهٗ فَقَدْ جَدَّ فِیْ اِبْطَالِهٖ
یَا مَنْ کَفٰی اَهْلَ الْمُنٰی مُتَصَافِعًا فِیْ مَالِهٖ
قَدْ دَهْتَنِیْ فَاقَةٌ رِفْقًا بِحَالِ الدَّالِهٖ
لَا زِلْتَ مَجْدُوْمَ الْوَرٰی بِمُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ

فصیح الدین رنج، قوم کے بنی اسرائیل اور میرٹھ کے باشندے تھے۔ میرزا صاحب سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کے بارے میں ایک مختصر سا نوٹ مخزنہ جاوید (ج ۳ ص ۵۰۶) میں ملتا ہے، جس کے بعد ایک شعر بھی نمونۃً درج کیا گیا ہے۔

قصیدہ در تہنیت جشن سکندر حشمت و اراستگی فیض رسان فیاض زمان حاتم دوران نواب کلب علیخان بہادر دام اقبالہ

آج کل چلتی ہے عالم میں خوشی کی وہ ہوا
آشیاں میں ناچتا ہے طائر قبلہ نما

دھوم ہے شادی کی اک خلق ہمہ کیا دکا
زیر گردوں جا بجا بالا سے گردوں جا بجا

ہے یہ جوبن ہے عروسانہ لباس سرخ سے
شور قلقل ہے لب مینا سے مے پر قہقہا

لو اڑی جاتی ہے ہنسی کے مارے بجلی چرخ پر
ہے طرب آہنگ کوس شادمانی رعد کا

ہے نکلتی چھیڑتے سے ناخن گلگیر کے
شمع کے رشتہ میں تار ساز مطرب کی صدا

پھولی پھرتی ہے شفق پہنے ہوئے رنگیں لباس
شادمانی سے جدا گردوں پھرے ہے ناچتا

دیکھیے جس کو وہ ہے مصروف بامان نشاط
فرش سبزہ باغ میں بچھوائے ہے بلوصبا

جام نرگس ہے کہیں رکھا ہوا گل کے حضور
دختر رز ہے لئے شیشہ سے انگور کا

سرو ہے مصروف سامان طرب باندھے کمر
عطر داں کھولے ہوئے بیٹھا کہیں ہے موتیا

شانۂ مرجان سے سلجھاتی ہے سنبل اپنے بال
یاسمن نے بھی طلا ہے اپنے منہ پر غالیا

ابر چھایا مور بولا مور کا سن کر خروش
نشۂ مے میں ہے نخل بید مجنوں جھومنا

بھر سنے پچکاریاں کہیں فوارہ چھڑکے ہے گلاب
محفل گل میں کہیں پنکھا ہلاتی ہے ہوا

نغمہ بر لب بلبل داؤد الحاں ہے کہیں
ہے کسی تختہ میں طاؤس نگاریں ناچتا

مژدہ اے نواب عالیجاہ تیری بزم میں
آج ہے ہر بلبلِ تصویر بھی نغمہ سرا

باغ کو دی ہے خبر جا کر چمن تیرے جشن کی
نے ہے انعامِ زرِ گل ڈھیریوں باد صبا

دیکھ کر جلوہ تری بزمِ طرب کی رات کو
خندہ زن ہیں بزمِ گردوں پر ثریا و سہا

آج وہ دن ہے کہ گردوں کشتیِ مہتاب میں
گوہرِ انجم کو بھر بھر کر کرے تجھ پر فدا

آئے زہرہ تیری محفل میں دفِ مہ کو لیے
گائے اک پٹھ کھڑے ہو کر بیارکبا دکا

کیوں نہ ہو خورشید کا جمگھٹ چہارم پر دماغ
آفتاب ہر سحر لے مفت دُھلاتا ہے ترا

غیرِ ممکن تیری خواہش سے ہو ممکن بالیقیں
سنگ موتی دے بجھے اور سیب لعلِ بے بہا

دین کو اللہ اکبر کیا دیا تو نے رواج!
ٹھکے ہے ناقوس سے اللہ اکبر کی صدا

نافِ محبوباں کو بھی کافر نہیں لکھتا کوئی
کفر یہاں تک رعب دینداری نے تیرے کھٹ لیا

مہ جبینوں کو عرق تیری جبیں کا عطر ہے
سرمۂ چشمِ اولی الابصار تیرا خاکِ پا

میر فرشِ فرشِ رنگیں آفتاب و ماہتاب
چرخ رنگیں فرشِ رنگیں ہے ترے دربار کا

عدل گستر تو یہاں تک ہے کہ تیرے دور میں
غیرِ ممکن ہے کہ پانی آگ کو دیوے بجھا

خوف سے تیرے غضب کے یہاں تلک ہے تنظیم
گھاس کے تنکے کو بھی آتش نہیں سکتی جلا

گر یہی ہے عدل فرمائی تو تیرے دور میں
دانہ کو بے جرم چیے گی نہ ہرگز آسیا

یہاں تلک آرام تیرے نظم سے ہر اک کو ہے
پاؤں پھیلائے ہوئے فتنہ بھی سوتا ہے پڑا

کیا بیاں کیجے تری دریا دلی بحرِ کرم
موتیوں سے دامنِ اسیدِ دریا بھر دیا

خستگانِ غم کو ہے تیری نگہ حرزِ اماں
دل شکستوں کو تراوشِ کرم ہے موم سا

سلطنت سے بھی ہے افزوں درد کی درماں تری
سایۂ دامن ہے تیرا سایۂ بالِ ہما

ہے خوشی ذرہ سے تا خورشید تیرے جشن کی
ہے نشاط اندوز عالم میں ہر اک چھوٹا بڑا

جاہ و منصب عمر و دولت روز افزوں ہو نصیب
جشن جمشیدی سے ہر دن جشن ہو تیرا سوا

تجھ سے گر چاہوں نہ داد شعر تو اے قدرداں
قدرداں تیرے سوا اب کون باقی رہ گیا

رنج کے ہاتھوں ہے دل کا رنج کے یہ حال ہے
میں طرح ہو دانۂ انگور مرجھایا ہوا

جشنِ شاہانہ مبارک تجھ کو با اقبال و عمر
عمر بھی وہ ہو کہ جس کی کچھ نہ ہووے انتہا

مدح طراز عقیدت آگین خاک راہ آل محمد فصیح الدین بلخی اسرائیل تخلص بہ رنج متوطن میرٹھ

(۸) خط کے لفافے پر میر منفی صاحب کی حسب ذیل تحریر ہے: "یہ خط در جواب نوشتہ شدہ ۱۶ صفر سنہ ۱۲۸۴ ہجری مطابق ۲۰ جون سنہ ۱۸۶۷ء" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا صاحب کے خط کی پوری تاریخ ۱۱ جون سنہ ۱۸۶۷ء ہے یا لفافہ کا ضائع ہو جانا ضروری ہے کہ خط کنندہ الفاظ میرزا صاحب کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔

(۱۱۲)

(۳) اس خط کے لفافے پر ۱۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۸ تاریخ درج ہے۔

ص ۱۱۴

(۱) میرزا صاحب کا یہ خط مولوی عبدالحکیم خاں صاحب مدرس فارسی مدرسۂ عالیہ رامپور سے مطبع ۲۵ روپے میں

خرید لیا گیا تھا۔ خیال تھا کہ سنین فارسی کی کیفیت پر مشتمل دو ورقہ بھی موصوف الذکر نیرنگ کے پاس ہوگا، لیکن باوجود تلاش دستیاب نہ ہو سکا۔

ص ۱۱۶

(۲) مطبع حسنی مراد ہے۔ مولوی محمد حسن خاں صاحب نے سنہ ۱۸۵۶ء میں اسے جاری کیا تھا۔

(۳) دُرگجے سنگھ، بلرام پور کے زمیندار تھے۔ غدر کے پُر آشوب ایام میں انگریزوں کی خدمات جانبازی سے انجام دیں جن کے صلے میں نقسبی پور کا سارا پرگنہ، جو ضبطی میں آ چکا تھا، گورنمنٹ نے عطا کر دیا، اور ضلع بہرائچ میں بھی ایک بڑا علاقہ مرحمت کیا۔ اس کے علاوہ جملہ موروثی علاقے میں دس فی صد جمع سرکاری معاف اور مرفوع القلم کر دی گئی۔ دُرگجے سنگھ خود عدالتہائی دیوانی کی حاضری سے مستثنیٰ ہوئے، اور اُن کے پانبوہمراہی ایکٹ اسلحہ کے اثر سے بری قرار پائے۔ نیز اُنھیں مہاراجہ بہادر اور کے، سی، ایس، آئی کا خطاب بھی ملا، اور ۹ ضرب توپ کی سلامی کا اعزاز حاصل ہوا۔ کچھ عرصے کے لیے وائسرائے کی مجلس واضع قوانین کے رکن بھی رہے۔ ان کا نام چار دوسرے تعلقدارانِ اودھ کے ساتھ لارڈ کیننگ کے اعلان باعتراف خیر خواہی مذکور ہوا ہے۔

دُرگجے سنگھ کو شعر کہنے کا بھی شوق تھا۔ راجہ تخلص کرتے تھے۔ دیوان "مخزن فصاحت" کے نام سے ۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ء (۱۰ رمضان سنہ ۱۲۸۵ھ) کو بلرام پور کے مطبع جنگ بہادری میں چھپا۔ سید آقا حسن عرف میرن صاحب نامی تخلص سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ (صحیفۂ زریں: ۴، تحفۂ نواب محمد علی خاں والی ٹونک کے ص ۳۵ کا حاشیہ ۵ ملاحظہ ہو۔

(۷) خط کے آخر میں تاریخ نہیں تھی۔ میں نے لفافے کی تاریخ لکھدی ہے۔ لفافے کی پشت پر نوٹ ہے: "بوجب خط ہذا بعد استدراک از مرزا نوشہ صاحب مبلغ دو صد پنجاہ و سہ روپیہ ہشت آنہ بابت بقایا حساب اخبار محمد حسن خاں حوالہ لالہ ٹھنڈی رام محافظ دفتر نمودہ شد۔"

تم بالخیر۔ والحمد للہ اولاً و آخراً
